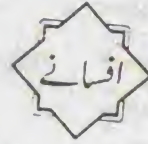


NOVEMBER 2011

عاشق
حنا

عید نمبر





- حمد
نعت
پیارے نبی کی پیاری باتیں سید اختر ناز 8
صدیق فتح پوری 7
ناصر کاظمی 7
بارش وار برس ڈھولا 89
رنگ عید ساعتوں کا ہمارے 210
زیت ہے موج صبا اسماء بدر 223



- ہم رات بہت روئے ابن انشاء 13
وہ ستارہ صبح امید کا فوزیہ غزل 24
تم آخری جزیرہ ہو ام مریم 186



- محبوبوں میں حساب کیسا؟ مدیحہ تبسم 106
خوشیاں اترتی آنگن میں شازیہ مصطفیٰ 128
راہِ اُلفت میں صبا جاوید 50
تیرے حصار میں رہوں ساجدہ تاج 154



- عاطف اسلم سے ملاقات عبداللہ 14



- حاصل مطالعہ
بیاض
رنگ حنا
میری ڈائری سے
حنا کی محفل
خبر نامہ
حنا کا دسترخوان
کس قیامت کے یہ نامے
فرزانہ سلیم 232
تسلیم طاہر 236
بلقیس بھٹی 240
صائمہ محمود 244
عین غین 248
عبداللہ 250
ثمینہ احتشام 252
فوزیہ شفیق 255



- نہ بھول سکیں گے ہم فوزیہ شفیق 17

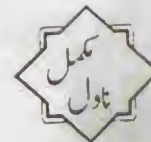
سردار طاہر محمود نے نواز پر ننگ پرپس سے چھوڑا دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، ماہنامہ حنا پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ چوک
اردو بازار لاہور، فون نمبر 37321690، 37310797-042-10 ای میل ایڈریس



- حمد نعت پیارے نبی کی پیاری باتیں سید اختر ناز 8
صدیق فتح پوری 7 بارش وار برس ڈھولا تحسین اختر 89
ناصر کاظمی 7 رنگ عید ساعتوں کا ہمارے 210
پیارے نبی کی پیاری باتیں سید اختر ناز 8 زیت ہے موج صبا اسماء بدر 223



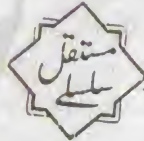
- ہم رات بہت روئے ابن انشاء 13
وہ ستارہ صبح امید کا فوزیہ غزل 24
تم آخری جزیرہ ہو ام مریم 186



- محببتوں میں حساب کیسا؟ مدیحہ تبسم 106
خوشیاں اتر کی آگن میں شازیہ مصطفیٰ 128
صبا جاوید 50
تیرے حصار میں رہوں ساجدہ تاج 154



عاطف اسلم سے ملاقات عبداللہ 14



- حاصل مطالعہ فرزانہ سلیم 232
بیاض تنیم طاہر 236
رنگ حنا بلقیس بھٹی 240
میری ڈائری سے صائمہ محمود 244
حنا کی محفل عین غین 248
خبر نامہ عبداللہ 250
حنا کا دسترخوان شمینہ احتشام 252
کس قیامت کے یہ نامے فوزیہ شفیق 255



نہ بھول سکیں گے ہم فوزیہ شفیق 17

سر دار طاہر محمود نے نواز پرینگ پرپس سے چھو کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرگرم روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پیہ، ماہنامہ حنا پبلی منزل محمد علی امین میڈسین مارکیٹ 207 سرگرم روڈ چوک
اردو بازار لاہور، فون نمبر 37321690, 37310797, 042-3731042 ای میل ایڈریس

کچھ عیدیں عیدیں

چین کرام! حنا کا نومبر 2011ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

جب یہ شمارہ آپ تک پہنچے گا عید الاضحیٰ کی آمد آمد ہوگی، دنیا میں جتنی بھی اقوام ہیں، ان کے اجتماعی تہوار ہوتے ہیں جنہیں اس قوم کے سب افراد مل جل کر مناتے ہیں، اسلام میں بھی مسلمانوں کے دو خاص تہوار عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں جنہیں تمام عالم اسلام میں ایک خاص جوش و جذبہ کے ساتھ منایا جاتا ہے، ان میں سے عید الاضحیٰ ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا درس دیتی ہے، یہ تہوار قربانی کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کی رضا کے لئے اپنے جوان بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی کمال اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے خود کو قربانی کے لئے پیش کر دیا تھا، اللہ تعالیٰ کو دونوں باپ بیٹے کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ رہتی دنیا تک آنے والی نسلوں کو اس قربانی کی یاد منانے کا حکم دیا، یہ قربانی ہمیں بتاتی ہے کہ اپنی ذات کو بھول کر خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا کیا عمل ہی بارگاہ الہی میں مقبول ٹھہرتا ہے اور ایثار و قربانی کا یہ جذبہ اگر انسان اپنی زندگی میں پیدا کر لے تو اس کی زندگی سنور جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو خلوص نیت کے ساتھ عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اظہار تشکر:- گذشتہ ماہ میری اہلیہ کی وفات پر ہمارے مصنفین اور قارئین نے جس طرح خطوط اور فون کے ذریعے تعزیت کی اور مرحومہ کی مغفرت کے لئے دعا کی، اس پر میں ان کا بے حد مشکور ہوں، آپ کی غم گساری نے ہم سب کا حوصلہ بندھا ہوا ہے اور ہمیں یہ صدمہ جانکاہ برداشت کرنے میں مدد دی ہے، گزارش ہے کہ آپ آئندہ بھی مرحومہ کی مغفرت اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کرتے رہیں اللہ آپ کو جزا دے۔

اس شمارے میں:- گلوکار عاطف اسلم سے ملاقات، صبا جاوید اور ساجدہ تاج کے مکمل ناول، مدیحہ بسم اور شازیہ مصطفیٰ کے ناول، تحسین اختر، ہمارا ڈا اور اسماء بدر کے افسانے، فوزیہ غزل اور ام مریم کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

نعت رسول مقبول ﷺ

رستے میں مسافر کو تری یاد اگر ہے
پر لطف سفر ہے وہی پر لطف سفر ہے

تیرے بنا بنتا نہیں ہے کام کسی کا
محتاج ترا دہر میں ہر فرد و بشر ہے

سوکھے ہوئے اشجار کو کرتا ہے شمر و
رحمت سے تری بیز ہر اک شاخ جگر ہے

تیرے ہی کرم سے ہیں شب و روز منور
ہے شام اگر تیری تو تیری ہی سحر ہے

کوئی نہیں در ایسا جہاں ملتا سکوں ہو
عالم کے لئے جائے اماں تیرا وہی در ہے

بن مانگے عطا کرتا ہے وہ شان ہے تیری
کیا کس کو ضرورت ہے تجھے سب کو خبر ہے

باتا ہے سکوں آ کے ترے گھر میں ہر انسان
محفوظ ہر اک رنج و بلا سے ترا گھر ہے

ترکین کائنات برگ دگر ہے آج
جشن ولادت شہ جن و بشر ہے آج

صدیوں سے فرش راہ تھے جس کے لئے نجوم
آغوش آمنہ میں وہ رشک قمر ہے آج

صبح ازل کو جس نے دیا حسن لازوال
وہ موج نور زینت دیوار و در ہے آج

کس کے قدم سے چمکی ہے بطحا کی سر زمین
ظلمت کدوں میں شور نوید سحر ہے آج

اے چشم شوق شوکت نظارہ دیکھنا
ماہ فلک چراغ سرہ گزر ہے آج

شوق نظارہ نے وہ تراشا ہے آئینہ
جس آئینے میں جلوہ آئینہ گر ہے آج

ناصر در حضور سے جو چاہو مانگ لو
وا خاص و عام کے لئے باب اثر ہے آج

مدتیق فتح پوری

ناصر ظلمی

آپ کی آرا کا منتظر
سر دار محمود

چاندنی کی پیاد کی باتیں

زیادہ مال رکھنے والوں کا بیان

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”زیادہ مال رکھنے والوں کے لئے ہلاکت ہے مگر جس نے مال کو اس طرح، اس طرح، اس طرح اور اس طرح سے (خرچ) کیا۔“ یہ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دائیں، بائیں آگے اور پیچھے چاروں طرف (ہر طرف ایک بار) اشارہ فرمایا۔

نوآئد و مسائل:-
مال حرص اور غفل کے ذریعے سے جمع ہوتا ہے اور بیداروں مذموم خصالتیں ہیں۔ جائز طریقے سے کمایا ہوا مال بھی اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا ضروری ہے، اپنی ذاتی آسائشات اور تعیشتات پر مال کرنا درست نہیں۔

سخاوت کرنے والا ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مال اس کے لئے نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے، جس قدر زیادہ خرچ کرے گا، اتنا ہی جنت میں بلند درجات کا حق ہوگا۔

حلال کمائی

حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”زیادہ مال والے قیامت کے دن

(دوسروں سے درجات میں) نیچے ہوں گے مگر جس نے مال کو اس طرح اور اس طرح خرچ کیا اور اس کی کمائی پاک (اور حلال ذرائع) سے ہوئی۔“

فائدہ و مسائل:-
سخاوت سے اس شخص کو فائدہ ہو سکتا ہے جس کی کمائی حلال ہو، لہذا حرام کمائی سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”زیادہ مال والے زیادہ نیچے ہوں گے، مگر جس نے اس طرح، اس طرح اور اس طرح خرچ کیا۔“
(نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین بار اشارہ فرمایا۔

سخاوت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو میں نہیں چاہوں گا کہ مجھ پر تیسری رات آئے اور (اس وقت بھی) اس میں سے کچھ میرے پاس (بچا ہوا) موجود ہو، مگر اتنی چیز جسے میں قرض کی ادائیگی کے لئے سنبھال رکھوں۔“

نوآئد و مسائل:-
اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت کا بیان اور امت کے لئے ترغیب

ہے۔

احد ایک بڑا پہاڑ ہے، اتنا سونا دو تین دن میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش یہی تھی کہ اگر اتنا مال بھی ہو تو وہ بھی دو تین دن میں مکمل طور پر تقسیم کر دیا جائے۔

قرض کی ادائیگی قرض خواہ کا حق ہے، اس کی ادائیگی سخاوت سے اہم ہے۔
قرض لینا دینا جائزہ ہے لیکن قرض لینے وقت یہ نیت ہونی چاہیے کہ جلد از جلد ادا کر دیا جائے۔

سنبھال رکھنے کی ضرورت تب پیش آسکتی ہے جب ادائیگی کا مقررہ وقت آنے میں کچھ وقفہ باقی ہو، تاکہ جب قرض خواہ مطالبہ کرے تو ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے ادائیگی میں تاخیر نہ ہو جائے۔

اگر قرض خواہ قریب موجود ہو تو مقررہ وقت سے پہلے خود جا کر ادائیگی کر دینا افضل ہے لیکن اگر اس سے رابطہ مشکل ہو تو رقم سنبھال کر رکھنا مناسب ہے تاکہ ادائیگی جلد از جلد کی جاسکے۔

دعا

حضرت عمرو بن خیطان ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”یا اللہ! جو شخص مجھ پر ایمان لایا، میری تصدیق کی اور اس نے (دل سے) جان لیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے تو اسے کم مال اور اولاد دے اور اسے اپنی ملاقات کی محبت نصیب فرما اور اسے جلدی موت عطا فرما اور جو مجھ پر ایمان نہ لایا، میری تصدیق نہ کی اور یہ یقین نہ کیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے، اس کو بہت مال اور اولاد دے اور اس کی عمر

طویل فرمادے۔“

دعا

حضرت نقادہ (بن عبد اللہ) اسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیج کر اس سے ایک اونٹنی طلب فرمائی، اس شخص نے اونٹنی دینے سے انکار کر دیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ایک اور آدمی کی طرف بھیجا ہے، اس نے ایک اونٹنی بھجوا دی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اونٹنی کو دیکھا تو فرمایا۔

”یا اللہ! اس میں برکت عطا فرما اور اسے بھیجنے والے کو بھی۔“ حضرت نقادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، میں نے کہا۔

”جو اسے لے کر آیا اس کے لئے بھی برکت کی دعا فرمائیں۔“
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”اور جو اسے لے کر آیا۔“ (اللہ اسے بھی برکت دے۔)

پھر آپ کے حکم سے اسے دو ہا گیا، اس نے بہت دودھ دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پہلے حص کے بارے میں، جس نے انکار کر دیا تھا فرمایا۔

”یا اللہ! فلاں کا مال زیادہ فرما۔“ اور جس نے اونٹنی بھیجی تھی اس کے حق میں فرمایا۔
”یا اللہ! اس کو روزگار و رزق دے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”ہلاک ہو جائے (تباہ ہو جائے) دینار کا بندہ، درہم کا بندہ، کبل کا بندہ اور چار درہم کا بندہ، اگر اسے دیا جائے تو خوش رہتا ہے، اگر نہ دیا جائے تو

(بیعت والا) وعدہ پورا نہیں کرتا۔“

ہلاکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”ہلاک ہو جائے دینار کا بندہ، درہم کا بندہ اور چادر کا بندہ، ہلاک ہو جائے، اوندھا ہو جائے، اسے کاٹنا لگے تو نکالنا نہ جائے۔“

فوائد و مسائل:-

دنیا کا لالچ مذموم ہے۔

جب محبت و نفرت کی بنیاد محض دنیوی مفاد پر ہو جائے تو خلوص باقی نہیں رہتا، اس صورت میں خلیفہ المسلمین یا اس کے نائب سے بیعت بھی اللہ کی رضا کے لئے اور اسلامی سلطنت کی حفاظت اور خدمت کے لئے نہیں ہوتی، اس طرح یہ عظیم نیکی بھی یتیم برکات سے محروم ہو کر برائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دینی جماعتوں اور تنظیموں سے تعلق اللہ کی رضا اور ثواب کے لئے ہونا چاہیے، اسی نیت سے عہدہ اور ذمہ داری قبول کی جائے، اگر محسوس ہو کہ محنت کرنے کے باوجود جماعت میں اہمیت تسلیم نہیں کی جا رہی تو اکابر سے ناراض ہو کر جماعت سے الگ نہ ہو جائے، ہاں اگر محسوس کیا جائے کہ جماعت یا تنظیم کے عہدیدار صحیح انداز سے کام نہیں کر رہے اور توجہ دلانے کے باوجود اصلاح پر آمادہ نہیں تو خاموشی کے ساتھ تنظیم سے الگ ہو جائے۔

درہم و دینار کے بندے سے مراد وہ شخص ہے جو دنیا کے مال و دولت کی اتنی خواہش رکھتا ہے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا محور حصول دولت بن کر رہ جاتا ہے، اس طرح وہ دولت سے خدمت لینے کے بجائے دولت جمع کرنے اور سنبھالنے میں مصروف رہتا ہے، گویا دولت اس کا

آقا یا معبود ہے اور وہ غلام یا پجاری۔

دولت کے پجاری کے لئے بد دعا کی گئی ہے کہ وہ تباہ ہو جائے، منہ کے بل گرنے اور سر کے بل اوندھا ہو جانے سے یہی مراد ہے، کاٹنا نہ نکالے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ مشکلات میں پھنسا رہے اور اس کی مدد اور نجات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو، واللہ اعلم۔

قناعت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”امارت سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ امیری تو دل کی امیری ہے۔“

فوائد و مسائل:-

انسان دولت اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اس کے کام چلتے رہیں لیکن جب دولت خود مقصود بن جائے تو پھر مال دولت کی کثرت کے باوجود وہ سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوتا جس کے لئے کوشش کی جاتی ہے۔

قناعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے پاس موجود رزق کا کافی سمجھے اور اپنی ضروریات کو اس حد تک محدود کر لے کہ حلال روزی میں گزارا ہو جائے۔

دولت مند وہ ہے جس کا دل دولت مند ہے اور دل دولت مند تب ہوتا ہے جب اس میں حرص اور بخل نہ ہو، ایسا آدمی تھوڑے سے مال سے اتنی خوشی حاصل کر لیتا ہے جو حریص آدمی کو بہت زیادہ مال سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔

کامیاب

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”کامیاب وہ ہے جسے اسلام کی ہدایت مل گئی، ضرورت کے مطابق رزق مل گیا اور وہ اس قانع ہو گیا۔“

فوائد و مسائل:-

اسلام سب سے بڑی دولت ہے کیونکہ اس سے آخرت میں جنت ملتی ہے جس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔

”رزق کفاف“ کا مطلب اتنی روزی ہے جس سے بنیادی ضروریات، بغیر فضول خرچی کے، پوری ہوتی رہیں اور قرض اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

کامیابی دولت کے ڈھیر جمع کرنے کا نام نہیں، بلکہ موجود رزق پر قناعت اور شکر اصل دولت اور بڑی کامیابی ہے۔

ضروری حاجات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”یا اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر والوں کو ضروری حاجات کے مطابق رزق عطا فرما۔“

فوائد و مسائل:-

انسان کو چاہیے کہ اپنے گھر والوں کے لئے بھی اچھی عادات و خصائل کی خواہش رکھے۔

ضرورت کے مطابق رزق کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ ملے جسے جمع کر کے رکھا جائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زہد و قناعت امت کے لئے بہترین نمونہ ہے۔

خواہش

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”قیامت کے دن ہر دولت مند اور نادار کی

خواہش یہی ہوگی کہ اسے دنیا میں صرف (زندہ رکھنے کے قابل) تھوڑی سی روزی ملی ہوئی۔“

پوری دنیا

حضرت عبید اللہ بن محسن انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جس کی صبح اس حال میں ہوئی کہ اسے بدن میں عافیت، اپنے بارے میں امن اور دن بھر کی خوراک حاصل ہو، اسے گویا پوری دنیا جمع کر کے دے دی گئی۔“

فوائد و مسائل:-

جسے کوئی بیماری اور خوف نہ ہو اور دن بھر کی ضرورت کا سامان موجود ہو تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

ہم زیادہ کی خواہش میں ان نعمتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو ہمارے پاس موجود ہوتی ہیں جس کی وجہ سے دل میں شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

جس شخص کے پاس ایک دن کی ضروریات موجود ہیں، اسے اس دن کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ جب کل کا دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات بھی مہیا فرما دے گا۔

کم تر کو دیکھو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

(دنیا میں) ”اپنے سے نیچے والے (کم مال) کو دیکھو، اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو، اس سے یہ ہوگا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔“

فوائد و مسائل:-

نیچے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت

ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں کی
دل درد سے بو جھل ہو تو پھر نیند کہاں کی
تم چرخ چہرہ ام کے تارے ہوئے لوگو!
تاوانِ کمرو زنگیاں اہل جہاں کی
اچھا نہیں بنتے ہوئے سنتے ہوئے دیکھو
ہم موبج گریزاں ہی سہی آبِ رواں کی
انشا سے ملو اس سے نہ روئیں گے ولیکن
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی؟
مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا سودا
بائیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی
اے دوستو اے دوستو اے درو نصیبو
گیلوں میں چلو سیر کریں شہر بیتاں کی
ہم جائیں کسی سمت کسی چوک پہ ٹھہریں
کیونکہ کوئی بات کسی سودو زیاں کی
انشا کی غنزل سن لو پہ رنجور نہ ہونا
دیوانہ ہے دیوانے نے اک بات بیاں کی

ہوتا ہے یہی عشق میں ہنسا سبھی کا
بائیں یہی دیکھی جس محبت زدگان کی

☆☆☆

کے ہاتھ میں نہیں بلکہ یہ اللہ کی محبت کے مطابق
ہوتا ہے، کوشش کرنی چاہیے کہ عمل اچھے ہوں
تاکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کیا جاسکے۔

اللہ کے ہاں مال اور بے زر برابر ہیں، مال
دار کو محض دولت مند ہونے کی وجہ سے معافی نہیں
مل سکتی اور نادار کو محض اس کی مفلسی کی بنا پر مجرم
نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

مال دار ہونا بھی اللہ کی آزمائش ہے اور
مفلس ہونا دوسری طرح کی آزمائش، اگر مال دار
شکر کرے تو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اور ناشکری
کرے تو ناپسندیدہ ہے، اسی طرح نادار آدمی صبر
کرے تو اللہ کا پیارا ہے اور بے صبری کرے اور
حرام کمائی کی کوشش کرے تو اللہ کے قرب سے
محروم ہے۔

انسان اگر نیکی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو
اس کی نیت اور خواہش ضرور رخصی چاہیے، ایسی
نیت پر بھی ثواب ملتا ہے۔

بھوک

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ
سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔
”میں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کو بھوک کی وجہ سے کروٹیں بدلتے دیکھا
آپ کو معمولی سی مہجوریں بھی میسر نہ تھیں جن سے
پیٹ بھر لیتے۔“
فائدہ:-

اس میں امت کے لئے سبق ہے کہ وہ تنگ
دستی کی حالت میں بھی صبر اختیار کریں، حرام کمائی
کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

☆☆☆

میں ہم سے کم ہے اور اوپر والے سے مراد وہ شخص
ہے جو کسی نعمت میں ہم سے بڑھ کر ہے۔

اپنے سے زیادہ نعمت والے کو دیکھنے سے یہ
خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے یہ نعمت کم حاصل ہے،
اس کی گوشیطان اس انداز سے پیش کرتا ہے گویا
یہ نعمت حاصل ہے نہیں، اس طرح محدودی کا
احساس پیدا ہوتا ہے جس سے شکر کے بجائے اللہ
سے شکوہ کرنے کو جی چاہتا ہے جو ناشکری کی ایک
بڑی صورت ہے۔

اپنے سے کم تر نظر ڈالنے سے حاصل شدہ
نعمت کی قدر معلوم ہوتی ہے جس سے شکر کا جذبہ
پیدا ہوتا ہے۔

ہر نعمت کے بارے میں یہ کیفیت ہے کہ
ایک فرد کو وہ نعمت کسی سے کم ملی ہے تو وہی نعمت
اسے کسی دوسرے سے زیادہ بھی ملی ہے، اس
معاملے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک فرد کو
ایک نعمت کسی سے کم ملی ہے تو کوئی دوسری نعمت
اسے زیادہ بھی ملی ہے، جس طرح ایک شخص کسی
سے کم دولت رکھتا ہے اور کسی سے زیادہ دولت
مند بھی ہے، اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ
اس سے دولت میں کم ہے تو صحت یا قوت میں
اس سے بڑھ کر ہے، اگر حسن صورت میں کم ہے تو
علم و فضل یا حسن سیرت میں اس سے بھی زیادہ
ہے، لہذا احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ
نہیں اور اللہ سے شکوہ کرنے کی کوئی ضرورت
نہیں۔

اعمال اور دل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں
دیکھتا بلکہ تمہارے عملوں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔“
نوٹ و مسائل:-

خوب صورت یا بد صورت ہونے بندے



”عاطف اسلم“ ایک نام..... ایک سنگر..... برائینڈ آف فارمنس جس نے آج کل ہالی ووڈ کی فلموں میں اپنی آواز سے وطن عزیز کا نام کافی مشہور کیا ہے۔ آج کوئی فلم عاطف اسلم کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ”ریس، عجب پریم کی غضب کہانی، قسمت کنکشن، مائی نیم از خان“ وغیرہ جیسی فلموں میں عاطف اسلم نے اپنی آواز سے بھارتی فلموں کو دنیا بھر میں ایک نئی پہچان دی ہے آج عاطف پاکستان کا موسٹ پاپولر آرٹسٹ بلکہ ان کا شمار مصروف ترین سنگر میں ہوتا ہے لگ وائیز (شکل و صورت) کے کم نہیں انہیں حال ہی میں بھارت کے متعدد فلم میکرز نے بطور ہیرو فلموں میں اداکاری کی آفر کی ہے جس کا کافی الحال عاطف نے منع کیا ہے۔ اس کی تمام تر توجہ فی الحال گائیکی کی طرف ہے۔ ہم آج

”حنا“ کے قارئین کی خصوصی فرمائش پر ”عاطف اسلم“ کا ایک مختصر انٹرویو پیش کر رہے ہیں جو یقیناً ضرور انجوائے کریں گے۔

☆ عاطف اسلم یہ کی ہیڈ کا نام ہے دو شخصیات ہیں یا ایک نام ہے؟

○ عاطف میرا اور مائی فادر نیم اسلم..... اور یہ کسی ہیڈ کا نام نہیں ہے۔

☆ آپ آج کل بھارتی فلموں کی ضرورت بن گئے۔ آج بھارت کا کوئی فلمی موسیقار آپ کے بغیر فلم بنانے کا سوچ نہیں سکتا ہے کیا آپ اس بات سے خوش ہیں؟

○ بالکل خوش ہوں..... مجھے یقین نہیں تھا کہ میں محض ایک ”ریس“ فلم کے گانے سے پاپولر سنگر بن جاؤں گا۔

☆ کیا اس سے قبل آپ پاکستان میں پاپولر سنگر نہیں تھے؟

○ آف کورس۔ میں یہ نہیں کہتا..... میں پاپولر نہیں تھا..... میں بالکل ایک اسٹیج کونسٹ آرٹسٹ تھا اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، یو اے ای، یو کے، کینیڈا میں میری پہچان پاکستانی تھی۔ مگر بھارتی فلموں کی گائیکی کے بعد میری شہرت میں مزید اضافہ کیا ہے۔

☆ آپ کے دوست، فیملیز میں بھارتی فلموں میں

☆ آپ جب بھارتی فلموں میں گائیکی کر رہے ہیں..... آپ سے بھارتی سنگرز جیلس تو نہیں ہیں؟

○ جی نہیں ایسی بات نہیں ہے سب مجھ سے پیار کرتے ہیں۔

☆ مگر سنا ہے آپ نے سونو نگم جیسے سنگرز کی چھٹی کر دی۔

○ ایسی بات نہیں ہے سونو مجھ سے اچھا گاتا ہے وہ آج بھی گارہا ہے میں نے کسی کی چھٹی نہیں کی



ہے..... دراصل بھارت کی فلم انڈسٹری بہت بڑی ہے سنگرز کے لئے کام بہت ہے۔

☆ مگر ہمارے عاطف نے اس بڑی انڈسٹری میں اپنا نام روشن ملک پاکستان کا وقار بلند کیا ہے؟

○ مجھے خوشی ہے کہ حکومت پاکستان نے سرکاری سطح پر میری جو پزیرائی کی ہے مجھے پرائیڈ آف۔ پر فارمنس سے نوازا میں نے اس کا حق ادا کر دیا آج عاطف اسلم کو نہیں میرے ملک کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

☆ بھارت میں پاکستانی ایکٹر کے علاوہ جو پاکستانی

گانوں سے خوش ہیں جبکہ وہ ہمارا حریف ملک ہے جو ہر معاملے میں ہم سے حسد کرتا ہے؟

○ جی نہیں! میرے حلقہ احباب سے میری بھارتی فلموں کی مقبولیت سے کافی خوش ہیں اور بات رہی دونوں ملکوں کی دشمنی اور حسد کی ہم فنکار اس دشمنی کو امن دوستی میں تبدیل کرنے میں اپنا پارٹ پلے کر رہے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ اب برف پکھل رہی ہے اب بھارتی فلمیں پاکستانی سنیما گھروں میں ہر لئے نمائش کے لئے پیش کی جا رہی ہیں۔

جانے والے اب کہاں ملو گے

دوست تھیں) آج بھی بڑی چاہت اور لگن سے ان کا کمرہ سنواری رہی ہیں کہ جیسے وہ کہیں باہر گئی ہوں اور کسی بھی لمحے لوٹ آئیں گی، ان کے چھوٹے بیٹے سردار طارق محمود کا سب سے چھوٹا بیٹا وہ کیوٹ سا محمد احمد جس کی عمر سوا دو سال ہے وہ اپنے تاپا باپ کی انگلی پکڑ کر یہ کہہ کر چل پڑتا ہے کہ امی جانی کو سلام کرنے جا رہا ہوں، کون ہے جو انہیں بھلا سکا ہے کوئی بھی تو نہیں، وہ ان کی چادر ہلکیاں، جن کو صبح سویرے وہ بلاناغہ فون کرتی تھیں آج بھی جب فون کی تیل ہوتی ہوگی بے ساختہ پتی ہوں گی، امی جان کا فون ہو گا یہ سوچے بنا کہ وہ جہاں گئیں ہیں وہ ایسا دیس ہے جہاں سے نہ کوئی چھی آتی ہے اور نہ کوئی سندیس، جو جاتا ہے لوٹنا بھول جاتا ہے واپس نہیں آتا، ان کی وہ لاڈلی پوتیاں تحریم طاہر، انوار طارق اور حمیرا طارق جن کی صبح ہی اپنی امی جانی کی مسکراتی صورت کو دیکھتے ہوئے ہوتی تھی کہ آنکھ کھلتے ہی وہ ان کے کمرے میں آتیں اور السلام علیکم کہتے ان کے کندھے پر سر رکھ دیتی تھیں اور جواباً وہ مسکرا کر ان کو پلٹا لیتی تھیں، مگر آج وہ پیاری ہستی کہیں نہیں، صبح آج بھی ہوتی ہے لیکن نہ جانے کیوں اس میں تازگی نظر نہیں آتی، سورج آج بھی اپنی اسی آب و تاب سے نکلتا ہے مگر اس کی روشنی ایک روشنی اس شفیق، ہستی کے چلے جانے سے ماند نظر آتی ہے۔

”حضرت علیؑ کا ایک قول ہے کہ تم دنیا میں اس طرح رہو کہ جب تک زندہ رہو لوگ تم سے

ان کے جانے سے یہ کیا ہو گئی تھری صورت نہ وہ دیوار کی صورت نہ در کی صورت لوگ دنیا میں آتے ہیں اور ایک مخصوص مدت گزار کر اس عارضی قیام گاہ کو چھوڑ جاتے ہیں یہاں کون ہے جو آکر واپس نہیں گیا، انسان بہر حال فانی ہے، اسے موت سے، اندھیرے میں گم ہو جانے سے، کوئی طاقت نہیں روک سکتی، لیکن انسان کا کردار، اس کا اخلاق لا فانی ہے اور انسان کی یہی خوبی ہے جس کے سامنے موت بھی عاجز ہو کر سرنگوں ہو جاتی ہے اور جانے والا ہمیشہ کے لئے زندہ رہ جاتا ہے، اپنے پیاروں کی یادوں، ان کی باتوں میں، ان کے دلوں میں۔ مرنے والے مہرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں وہ حقیقت میں بھی ہم سے جدا ہوتے نہیں سردار محمود صاحب کی اہلیہ بیگم سردار محمود کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا، انہیں اس دنیا کو چھوڑے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے لیکن کوئی بل کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جو ان کے ذکر سے خالی ہو سکی نہ کسی حوالے سے ان کا نام بے ساختہ زبان پہ آئی جاتا ہے، وہ چاہے ان کے شریک حیات سردار محمود ہوں یا ان کے تخت جگر سردار طاہر محمود، میں نے دونوں کو ہی ان کی یادوں میں کھوئے ہوئے دیکھا ہے وہ یہ کیا، ان کی دونوں بہوؤں (جن کی وہ ساس نہیں ماں نما

ہوئیں؟

○ پاکستان میں اب فلمیں نہیں بن رہیں ہیں مگر سنا ہے کہ کچھ لوگ جن میں شان، ہمایوں سعید اور شعیب منصور شامل ہیں وہ فلمیں بنانے کی تیاریوں میں مصروف عمل ہیں اور مجھے انہوں نے گائیسی کی آفر کی ہے اگر میوزک اور فلم پروڈکشن بین الاقوامی انداز کا لگا ضرور کروں گا۔

☆ آپ کے حوالے سے مشہور ہے کہ شعیب منصور نے ”خدا کے لئے“ کے بعد اپنی ٹیکنہ مودی شروع کی ہے اور آپ کو ہیرو کے لئے منتخب کیا گیا ہے کیا آپ کو اب اداکاری کا شوق ہے۔

○ جی ہاں! اداکاری کا شوق ہے مجھے ہیرو شعیب بھائی نے فلم آفر کی ہے اس کے بارے میں فی الحال سوچ رہا ہوں کیونکہ میں اچھا شگزر ضرور ہوں مگر اداکار نہیں..... اس لئے بھارت مجھے بے شمار فلم میکرز نے آفرز دی مگر میں نے وہ آفر قبول نہیں کی کہ دو کشتیوں کا مسافر ڈوب جاتا ہے جس کی مثال سو نوگم اور ریمیش ہیں جو فلموں میں چل نہیں سکے۔

☆ آپ کے پاس اس وقت کتنی بھارتی فلمیں ہیں جن میں آپ کے گانے آپ کے فینز کو عاطف بنے گا نیکی کے انداز میں نظر آئیں گے۔

○ آپ کو فخر یا ہر اچھی کاسٹ کرڈٹ کی فلم میر میری آواز سننے کو ملے گی۔

اس کے ساتھ ہم نے عاطف سے اجازت چاہی اس وعدے کے ساتھ کہ ان کو جیسے ہی وقت ملے وہ حنا کے لیے ایک تفصیلی انٹرویو دیں گے۔

☆☆☆☆

آرٹسٹوں کی حمایت کرتا ہے ان کو دھمکی دی جاتی ہے جس طرح ٹیلی صدیقی کے ساتھ انہوں نے کیا۔ اس کے بعد شاہ رخ خان، ہمیش بھٹ کو محض اس لئے دھمکی دی گئی کہ انہوں نے پاکستان آرٹسٹوں، سنگرز کی حمایت کی تھی۔ آپ کے ساتھ کسی نے اس طرح کی دھمکی یا ناروا سلوک تو نہیں کیا؟

○ دیکھئے..... اچھے اور برے لوگ ہر جگہ موجود ہیں اور ٹیلی بھائی کے ساتھ ایک تعصب پسند تنظیم نے جو کیا اس کی معافی ہالی ووڈ اور ٹی وی والوں نے مانگی اور شاہ رخ خان کو بال بھلا کرے نے دھمکی دی اس کے باوجود سب نے ”مائی ٹیم از خان“ کی کامیابی دیکھ کر اندازہ لگایا کہ عوام شاہ رخ خان کے ساتھ ہیں۔

☆ آپ کو کرکٹ سے دلچسپی ہے؟

○ یس ٹھیکے کے لیے اب ٹائم نہیں ملتا..... مگر ٹائم ملتا تو دیکھتا ضرور ہوں۔

☆ جس طرح آج کل IPL کرکٹ ہو رہی ہے اور پاکستان کے کھلاڑی محض ایک سازش کے تحت موجود نہیں ہے کیا آپ کو دکھ ہوا؟

○ سچ بتاؤں..... مجھے بار بار IPL اس لئے پسند نہیں کہ اس میں ہمارے پاکستانی اسٹارز شامل نہیں ہیں اور شاہ رخ خان، پریتی زنبھارتی فلم اسٹارز کرکٹر، ٹی وی، ماڈل اس بار IPL سے واپس ہیں اور انویسٹمنٹ کرنے والے ادارے کو کافی نقصان ہوا اس کی وجہ پاکستان کرکٹر کو شامل نہیں کیا گیا جس کا مجھے دل سے دکھ ہوا ہے۔

☆ آپ کو کسی پاکستانی فلم پروڈیوسر نے اپنی فلم میں چانس کیوں نہیں دیا؟

○ یہ آپ پاکستانی فلم میکرز سے سوال کریں.....

میر خود جانے سے رہا۔

☆ اب آپ بھارتی فلموں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں کیا آپ کو پاکستانی فلمیں آفرز

ملنے کی آرزو کریں اور جب چلے جاؤ تو تمہارے لئے دعائے مغفرت کریں۔“

آج میں بڑے فخر سے کہتی ہوں کہ بیگم سردار محمود کا شمار ان ہی لوگوں میں تھا کہ زندہ رہیں تو اپنے پرانے سب پر اپنی جنتیں بچھا کر لے گئیں اور جب چلی گئیں تو کیا چھوٹا کیا بڑا اپنا یا غیر سب کے لبوں پر ان کے اخلاق کی تعریف اور زبان پر ان کے لئے مغفرت کی دعا تھی۔

آسمان تیری لحد پر سنبھلنا افسانہ کرے! سبزہ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے! اکتوبر کے شمارے میں ان کی رحلت کی خبر شائع ہوئی تو ہمیں اظہار تعزیت کے لئے لا تعداد قارئین کے فون موصول ہوئے، بے شمار خطوط اور ای میل کے ذریعے اظہار ہمدردی کیا گیا، جس کے لئے ادارہ حنا ان سب چاہنے والوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہے جنہوں نے دکھ کی اس گھڑی میں ہمارا غم بٹایا۔

سب لوگوں کے خطوط شائع کرنا تو ہمارے لئے ممکن نہیں لیکن ان میں سے چند مصنفین کے تعزیت نامے ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔

زندگی کا بھروسہ ہی کیا ہے

بشرہ ناز

زندگی کا سب سے بڑا راز جس پر ہمارے جینے کی خواہش اور اس کے لوازمات کا پردہ پڑا ہے وہ موت ہے، کیونکہ یہ زندگی جس کے لئے لوازمات زندگی سجائے جاتے ہیں انہی لوازمات زندگی کو موت ایک جھٹکے سے نکل لیتی ہے، زندگی خدا نے بہت خوبصورت چیز بنائی ہے اور عورت کے لئے یہ حسین ترین اس وقت بن جاتی ہے جب محبت کرنے والا شوہر اور فرماں بردار اولاد اسے نصیب ہو، مگر یہ بھی حقیقت ہے زندگی کتنی

ہی حسین کیوں نہ ہو اس فانی زندگی کو موت کی آغوش میں جانا ہی پڑتا ہے۔

زندگی انسان دو طرح سے جیتا ہے، ویسے تو ہر انسان زندگی دوسروں کے لئے جیتا ہے لیکن اگر زندگی عورت کی ہو تو اس کی زندگی دوسروں کے لئے صرف ہوتی ہے اپنی زندگی دوسروں کے نام کرنے کے لئے بھی ہوتی ہیں پہلی کیبیکری میں صرف شوہر اور اولاد ہوتی ہے جس پہ وہ اپنا تن من دھن سب کچھ وار دیتی ہے صبر محبت مامتا اور وفا شعار کی ہاتھوں، دوسری کیبیکری خاندان و دوست احباب و ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کی ہے جن کے ساتھ اسے ان کے دکھوں، خوشیوں میں تنگی سہاٹی بننا پڑتا ہے۔

سترہ ستمبر بیگم سردار محمود کے سفر کا آخری دن تھا جسے انہوں نے اپنی محبت و خدمت گزار اور وفا شعار کی کے ساتھ کیے گئے تمام وعدوں کی بجا آوری کر کے ان سے آخری سفر کی اجازت مانگ لی مگر یہی سترہ ستمبر جہاں ایک انسان کو محبت بھرے شریک سفر سے محروم کر گیا وہیں سردار طاہر محمود اور صائمہ محمود جیسی ہستیوں سے محبت کرنے والی ماں اور دعاؤں سے بھرا چھتار درخت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لے گیا۔

سترہ ستمبر محض سردار محمود کی شریک حیات اور سردار طاہر صاحب کی والدہ کی وفات کا دن نہیں ہے بلکہ یہ ایک عظیم عورت کی وفات ہے جس کی محبت اپنے پرانے سب کے لئے یکساں تھی میں بیگم سردار محمود سے کبھی نہیں ملی مگر قلم سے جڑے رشتے نے ہمیں اس گھرانے سے محبت کی ایسی ڈور سے باندھ دیا ہے جو شاید اب صرف سانسوں کے ساتھ ہی ٹوٹ سکے، دعا ہے کہ اللہ پاک محترمہ کے درجات بلند کرے آمین اور سردار انکل و سردار طاہر محمود صاحب، صائمہ محمود صاحبہ

کے ساتھ ان کے دیگر اہل خانہ کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

زندگی کی حقیقت تو ازل سے جیسی ہے موت کی آغوش میں اسے خدا اس کی آگاہی کے صلہ میں صبر اور بھی عطا کرے۔

رت ہی بدل گئی ہے

تخسین اختر
موسم بدلنے کو ہے، ماحول کی تپش خشکی میں ڈھلنے لگی ہے، دن چھوٹے اور راتیں بڑی ہونے لگی ہیں، ایسے میں اگر کوئی اپنا اچانک پچھڑ جائے، بیٹھے بیٹھے یوں کھو جائے جیسے ہاتھ سے کوئی قیمتی چیز نکل گئی ہو تو کچھ دکھائی نہیں دیتا، اس زیاں پر لگتا ہے موسم ہی نہیں بدلا زندگی ہی بدل گئی ہے، پچھلے ماہ کے شمارے میں آئی فوریہ کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ نے دھی کر دیا، محترم جناب سردار محمود صاحب کی اہلیہ کی وفات کی خبر پڑھی تو دل انجانے دکھ سے بھر گیا، سوچا تعزیت کن الفاظ میں کی جائے، دنیا میں بے شمار زبانیں ہیں، لا تعداد الفاظ ہیں مگر ایسے ہر موقع پر سب الفاظ، سب زبانیں ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، جو بھی الفاظ ادا کیے جائیں یا لکھے جائیں وہ غم کو اپنے کے لئے کم پڑ جاتے ہیں، وہ الفاظ بھی ہیں اس دکھ کا اظہار اور اندازہ نہیں کر سکتے جو کسی پیارے سے پچھڑنے کا ہوتا ہے۔

میں نے صرف چودہ سال کی عمر میں اپنے باپ کے پچھڑنے کا غم سہا تھا اور یہ غم اتنا بڑا تھا کہ آج تک اس کی شدت کم نہیں ہوئی، بہت سے لوگ ہمارے ساتھ روئے تھے، ہمارے دکھ میں شریک تھے، ہمیں غم کے ان دنوں میں ساتھ لے کر چلے تھے مگر اس سب کے باوجود ہمیں لگتا تھا کہ جو نقصان ہو گیا وہ کوئی بھی پورا نہیں کر سکتا اور حقیقت بھی یہی ہے، آج سردار محمود صاحب

سے دکھ کا اظہار کرتے وقت مجھے اپنا وقت یاد آنے لگا ہے، کیا میں ان کا غم الفاظ میں بانٹ سکوں گی، ان کی ہم سفر پچھڑ گئی بچوں کی ماں جدا ہو گئی، محبت و الفت کا اک باب زندگی سے ختم ہو گیا، نرم مزاجی اور حلیمی اس گھر سے رخصت ہو گئی درود یوار کی رونق چلی گئی کیا اس پر میرا قلم کچھ لکھ سکے گا نہیں۔

غم یقیناً بہت بڑا ہے مگر موت برحق ہے، جو اس دنیا میں آیا ہے اسے واپس بھی جانا ہے، ہاں جانے والے بلاشبہ پیچھے رہ جانے والوں کا سب کچھ ساتھ لے جاتے ہیں، وہ خالی ہاتھ جاتے ہیں مگر پیچھے کچھ چھوڑ کر بھی نہیں جاتے، پیچھے رہ جاتے ہیں تو آنسو، سسکیاں اور یادیں۔ غم دالم کے ان دنوں میں جب تسلی تسلی نہیں لگتی اور دکھ کسی بھی طرح کم ہونے کو نہیں آتا، میری خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ آپ سب کو صبر و جمیل اور مرحومہ کو اپنی جوار رحمت میں کر دے کروٹ کروٹ جگہ نصیب فرمائے (آمین)۔

دنیا کے کام بونہی چلتے رہیں گے، کہیں کچھ تبدیلی نہ آئے گی، مگر یہ کہنے کی بات ہے، جو اپنے ہیں، جو پیارے ہیں جن سے دلی، قلبی، جسمانی و خونی رشتے ہیں ان کے لئے اس کمی کے بعد بہت کچھ تبدیل ہو جائے گا وقت کا مرہم آہستہ آہستہ اس گھاؤ کو مندل کر دے گا مگر ابھی تو۔

پچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا کہنے کو الفاظ نہیں

ساجدہ تاج
اکتوبر کا شمارہ حسب توقع ساٹ تاریخ کو ملا، بہت بے صبری سے رسالہ کھولا تو ”کچھ باتیں

ہماریاں، میں جناب سردار محمود کی اہلیہ کی وفات کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا، اگرچہ کہ یہ صدمہ ان کے لئے بہت بڑا ہے اور میرے پاس اظہار افسوس کے لئے جو الفاظ ہیں وہ اس صدمے اور اس دکھ کے سامنے بہت کم اور بہت چھوٹے ہیں، ان کی زندگی کی سہمی ان کی رفیقہ حیات اس دنیا سے چل بسیں جنہوں نے نجانے قدم قدم پر ان کا کتنا ساتھ دیا ہو گا، وہ مہربان اور بے دریغ محتسب، بے لوث چاہتیں لٹانے والی ہستی اب اس دنیا میں نہیں رہی یہ سوچ ہی ان کے اہل و عیال اور عزیز و اقارب کے لئے دکھ اور تکلیف کا باعث ہوگی میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جناب سردار محمود صاحب اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور روز قیامت ان کی اہلیہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے (آمین)۔

وہ خواب تھا

فوزیہ غزل وہ خواب تھا بکھر گیا خیال تھا ملا نہیں دل کو میرے کیا ہوا یہ کیوں بجھا پتا نہیں تمام دن اداس دن تمام شب اداسیاں پھنڑا کسی سے کیا محسن کہ جیسے کچھ بچا نہیں زندگی میں بہت سے لمحے ایسے آتے ہیں جب دل کا بوجھ ایک دم سے بڑھ جاتا ہے وہ شاید بیس تمبر کا دن تھا جب فوزیہ شفیق سے بات ہوئی سلام و دعا کے بعد حسب معمول میں نے سردار محمود صاحب کی خیریت دریافت کی تو فوزیہ نے بہت بوجھل لہجے میں بھابھی صاحبہ کے انتقال کی خبر دی اور میں کچھ دیر کو تو بالکل ساکت چپ رہ گئی، فوزیہ غم لہجے میں مرحومہ کی خوبیاں، ان کی باتیں اور بہت کچھ بتا رہی تھیں اور میں، مجھے سمجھ نہ آ رہی تھی میں کن الفاظ میں انہیں تسلی دوں،

حوصلہ دوں کیسے تعزیتی الفاظ ادا کروں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا اپنا بہت اچھا لگنے والا مجھ سے بچھڑ گیا ہو، وہی دکھ جو کسی بیٹی کو ہو سکتا ہے، مجھے بھی تھا ویسے بھی حنا کے سارے ادارے کے اراکین، رائٹرز، قارئین سے ایک خاص انیت ہے ہر ایک کی خوشی کامیابی اپنی لگتی ہے تو ہر ایک کا دکھ بھی آنکھیں بھر دیتا ہے، میری بھی نگاہیں ٹپکن پانیوں سے پر تھیں اور فوزیہ کہہ رہی تھی۔

میرے لئے وہ ایک شفیق ماں، بہترین رہنما اور اچھے دوست کی طرح تھی، مجھے بہت سے رشتے ملے تھے ایک ان کی ذات سے اور اب یوں ان کا اچانک جانا، بالکل بھی برداشت نہیں ہو رہا، ان کا نرم انداز گفتگو، اچھے خیالات اور بلا تفریق سب سے اچھا سہارا برتنا، یہ سب فوزیہ کی زبانی جانتے ہوئے مجھے تاسف ہو رہا تھا کہ کاش ایسی ہمہ صفت شخصیت سے میں ملی ہوئی، وہ گھر جو ان کی پر نور شخصیت سے چمکتا تھا جس کے درو دیوار نے کمینوں سے ان کی بے دریغ محتسب بے لوث چاہتیں دیکھی ہوں گی، وہ گھر اب کیسا سنسان ہو گا وہاں کے مکین کتنے اداس ہوں گے۔

سردار صاحب کے لئے اتنی بہترین شریک سفر، بچوں کے لئے مہربان ماں اور بہوؤں کے لئے شفیق ساس کتنے انداز تھے جو انہیں میسر تھے اور اب یہ سب نہ ہو گا تو یہ سب لوگ کتنے افسردہ ہیں۔

الفاظ نہ تو دکھ کا مداوا کر سکتے ہیں نہ تسلی غم کم کر سکتی ہے مگر یہ احساس کہ کوئی ہے جو ہمارے غم کو غم سمجھتا ہے ہماری خوشیوں کے لئے دعا گو ہے یقیناً جیسے کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے۔

سردار صاحب ان کی فیملی حنا کے سارے شاف سے یہی کہتا ہے کہ دکھ کی اس کیفیت میں

ہم آپ کے ساتھ ہیں اور دعا ہے کہ اللہ آپ کو صبر و حوصلہ دے ہر آزمائش سے بچائے (آمین)۔

سنسان دل کی بستی

نبیلہ ابرار راجہ

امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے، پچھلے دنوں حد سے زیادہ مصروفیت رہی، میں نے آج حنا دیکھا تو سردار محمود صاحب کی اہلیہ کی وفات کا پتہ چلا، پھر فوزیہ آپ کا لکھا ہوا مضمون پڑھا، جس میں آپ نے مرحومہ کے ساتھ اپنے دلی لگاؤ کا اظہار کیا۔

سردار محمود صاحب ان کے اہل خانہ اور دیگر احباب کے ساتھ میں بھی آپ کے دکھ درد میں برابر کی شریک ہوں اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور سب اہل خانہ کو صبر و جمیل عطا کرے (آمین)۔

مجھے پتہ ہے اپنے پیاروں کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا کتنی مشکل ہوتا ہے اور جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ دل کی بستیاں سنسان کی سنسان ہی رہتی ہیں، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سردار صاحب اور تمام اہل خانہ کو صبر دے (آمین)۔

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں؟

ام مریم

وہ سترہ ستمبر کی صبح تھی جب میں نے آپ کی ایک نیکسٹ بھیجا تھا، اس میں، میں نے کیا سوال کیا اب مجھے یہ بالکل یاد نہیں لیکن آپ کا جواب مجھے یاد رہ گیا، انہوں نے لکھا تھا۔

”مریم میں سر کے گھر جا رہی ہوں، ان کی وائف کی ذمہ دہ ہو گئی ہے۔“ بیشک ہم اللہ کے لئے ہیں اور بیشک اسی کی

طرف لوٹائے جانے والے ہیں۔ مجھے یہ سن کر بے حد شاک لگا تھا، اگلے دن میں نے پھر آپ کی ایک میسج کیا تھا، میں نے ان سے پوچھا تھا آپ کی جی آئی (سردار انکل کی مسز) کو کیا ہوا تھا، کیا وہ بیمار تھیں؟

جواب میں انہوں نے کہا نہیں کچھ بھی نہیں ہوا بس ایک دم وہ چلی گئیں، اس کے بعد ہماری اس موضوع پر بات نہیں ہوئی، دن گزرے اور جب مدیجہ سے میری فون پر بات ہوئی تو میں نے یہ خبر انہیں بھی سنائی تھی، اس نے بھی اظہار افسوس کیا تھا، بلکہ چند دن بعد جب میری دوبارہ اس سے بات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا تھا، کہ میں طاہر بھائی سے فون پر تعزیت کروں گی، میں نے جواب میں کہا ہاں میں بھی کروں گی، مگر سچی بات ہے میں چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر پائی، حوصلہ ہی نہیں تھا، مجھے یہ دنیا کا سب سے دشوار کام لگتا ہے، کسی پیاری، ہستی کی جدائی کے موقع پر تسلی دلا سہ دینا، الفاظ جیسے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، یہی وجہ تھی کہ میں حنا کے آفس کال نہیں کر سکی، چھ تاریخ کو جب حنا ہمیں ملا تو آپ کی ان کے بارے میں لکھا گیا عقیدت نامہ پڑھا تو وہ کیفیت پھر سے اپنے اوپر طاری ہوئی محسوس ہوئی جو اس خبر کو سن کر ہوئی تھی۔

مجھے کسی کو خراج تحسین پیش کرنا نہیں آتا مگر میں نے اس عظیم ماں کے لئے چند الفاظ لکھنے کی کوشش کی ہے جس کے قدموں تلے رب تعالیٰ نے جنت کو بچھایا ہے، خدائے ازل سے التجا ہے ان کی آخرت کے سفر کو آسان بنائے انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ و ارفع مقام عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے آمین تم آمین۔

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں تو جدا ایسے موسموں میں ہوا

آئینے جس کو ڈھونڈتے تھے
ایسا بے مثل عکس گر تھا وہ
سارے کانے سمیٹ لیتا تھا
ایسا انمول ہم سفر تھا وہ
اپنے دل میں سنبھال کر اس کو
آج ہاتھوں میں کھور ہے ہیں اسے
ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی
آئینے خانے زور ہے ہیں اسے
اس کو کس روشنی میں دفنائیں
اس کو کس خواب کا بدن ہم دیں
وہ جو خوشبو میں ڈھل گیا یارو
اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں

واقعی کچھ لوگ ایسے ہی خاص ہوتے ہیں،
میں انہیں جانتی نہیں تھی مگر جو تعارف آپ کی
ذریعے ہم تک پہنچا وہ اتنا مکمل تھا کہ ایک مقدس
خاکہ آپوں آپ ذہن تراش لیتا ہے، خدا ان کی
مغفرت فرمائے آمین۔

اب کہاں وہ مہرباں

مدیحہ تبسم
کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم نے
کبھی دیکھا نہیں، برتا نہیں لیکن ان رشتوں کی
محسوس کی جانے والی چھایا ہمیشہ ہمیں ایک
خوبصورت احساس سے باندھ رہتی ہے، کچھ
ایسا ہی رشتہ ہے میرا سردار انکل سے، حنا میں لکھتے
ہوئے ایک عرصہ ہو گیا، لیکن ابھی ان سے بات
کرنے کی ہمت نہیں کی، ”کچھ باتیں ہماریاں“
کے ذریعے ان سے ایک تعلق بندھ گیا تھا گویا ہر
مہینے ہی ہم ان سے ہم کلام ہو جاتے ہیں۔

جو رشتے صرف دلوں کے ذریعے خلوص کی
نیت پہ قائم کیے گئے ہوں وہ رشتے خوبصورت
ہونے کے ساتھ ساتھ بہت نازک بھی ہوا کرتے

الوداعی ملاقات ہو جانی۔

لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں ناں جن
سے اگرچہ ہم برس برس نہیں ملیں، ان کے خیال کی
خوشبو، محبت کی مہک اور پاکیزہ دعاؤں کا حصار
ہمیشہ ہمارے گردنا تاباندھے رکھتا ہے کچھ لوگ
ایسے ہی ہوتے ہیں جب وہ اس دنیا سے چلے
جاتے ہیں تو اگرچہ کہ ان کی کو کوئی بھی پورا
نہیں کر سکتا، لیکن پھر بھی ان کی یاد ایک
خوبصورت خیال بن کے ہمیشہ ہمارے ارد گرد
منڈلاتی رہتی ہے اور یہ احساس دل کو تقویت بخشتا
ہے کہ یہ ہستی ہمیں عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ
اپنے رب کو بھی بہت عزیز تھی، یقیناً وہ اس کے
پاس ”عیشۃ راضیہ“ کے مصداق خوش و خرم ہوں
گی۔

کیونکہ یہ تو ہر انسان کا ابدی سفر ہے جو اس
نے ہر حال میں طے کرنا ہے، کامیاب انسان
وہی ہے جس کا یہ سفر خوش اسلوبی کے ساتھ کٹ
جائے اور اس کے اس دار فانی سے چلے جانے
کے بعد بھی لوگ ان کی تعریفوں میں ربط لکھان
ہوں اور مرحومہ یقیناً ان تمام صفات کا پیکر تھیں۔
آخر میں، میں دعا کروں گی کہ اللہ پاک
انہیں اپنی خصوصی رحمت سے نوازے اور کروٹ
کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے درجات
کو بلند کرے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا
فرمائے آمین ثم آمین۔

وہ گھنی چھاؤں

سہاس گل

اکتوبر کے حنا میں انکل سردار محمود کی اہلیہ
کے انتقال کی غمناک خبر پڑھی تو بہت دکھ ہوا۔
حنا سے فوزیہ آپ کی اور انکل سردار محمود
صاحب سے ہمارا دس برس کا تعلق ہے اور یہ تعلق

محض فلمی تعلق نہیں رہا، اس تعلق اور رشتے میں
خلوص اور اپنائیت و محبت کا احساس و اعتبار بھی
شامل ہے اور جن سے اتنا طویل تعلق ہو اور
اپنائیت کا احساس ہو ان کے دکھ بھی اپنے سے
گتے ہیں اسی طرح انکل سردار محمود کی اہلیہ کی
وفات کا پڑھ کر دل دکھ ہوا، فوزیہ آپ نے جس
طرح بیگم سردار محمود کے ساتھ اپنے تعلق کی بابت
لکھا پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں، بے شک موت
برحق ہے اور ہم سب کو جانا ہے، مگر کچھ لوگ جا کر
بھی نہیں جاتے، بظاہر قبر میں سو جاتے ہیں لیکن
ہمیشہ کے لئے اپنے پیاروں کے دلوں میں گھر کر
جاتے ہیں ایسے انسان بہت خوش نصیب ہوتے
ہیں، جو دنیا سے چلے جاتے ہیں اور پیچھے رہ
جانے والوں کے دلوں میں مقیم ہو جاتے ہیں
ایسے ہی خوش نصیب افراد میں بیگم سردار محمود بھی
شامل ہیں، ان کی زندگی جن رشتوں، ناطوں سے
جڑی تھی وہ آج بھی ان کو اپنے آس پاس محسوس
کرتے ہیں ان کے جانے کا کسی کو یقین ہی نہیں آ
رہا، جیسا کہ فوزیہ آپ نے بھی کہا ہے، دراصل یہ
محبتیں ہی بیگم سردار محمود کی عمر بھر کی کمائی ہیں اور
رشتے تعلق اور ناٹے وہ پودے ہیں جنہیں اگر
خلوص اور پیار کا پانی ملتا رہے تو وہ تناور درخت
بن جاتے ہیں، سایہ دار چٹ بن جاتے ہیں اور
اپنے ہی نہیں پرانے چھٹی اس پیڑ کی جھاؤں میں آ
کر بیٹھنے لگتے ہیں، ہم انکل
سردار محمود سے ان کے اہل خانہ سے فوزیہ آپ کی

سے ان کی وفات پر دلی تعزیت کرتے ہیں اور دعا
گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی قبر کا کونہ کونہ منور
فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، انہیں
جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں اور سردار محمود
انکل اور ان کے دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل عطا
فرمائے (آمین)۔

وہ ستارہ صبح امید کا

نوزیہ غزل

دسویں قسط کا خلاصہ

سنعیہ اپنی بوتیک میں مصروف اور شہر یار اس کے کترائے رویہ سے بے حد ڈپر لیس ہے زندگی کی دوڑ میں پھر سے شامل ہونے کے لئے اور خود کو ہر مشکل کا حل تلاشنے پہ مجبور پانی اریہ شدید ذہنی تناؤ میں ہے۔
ماریا کا ذہن گزرے واقعات سے متاثر ہو کر دسویں کا شکار ہے، شہر یار ہر صورت سنعیہ کو شریک سفر رکھنا چاہتا ہے سنعیہ کا گریز برقرار ہے۔

شہر یار کے التفات اور اپنے تحفظات کو سوچ کر سنعیہ مسلسل ڈپریشن کا شکار ہے وہ اس سلسلے میں صبا سے بات کرتی ہے تو وہ اسے کی انتہائی اقدام سے منع کرتی ہے، ماریا کو لیڈی ایلون پھر سے زندگی کی طرف واپس لانے کی کوشش کرتی ہے، مگر وہ اسی نیم دیوانگی میں گھر کا تمام قیمتی سامان توڑ پھوڑ دیتی ہے۔

اریہ اپنے گھریلو مصائب سے بچنے کو اک فیصلہ کن موڑ پر آ پہنچتی ہے۔
سنعیہ، شہر یار کو اک ناپسندیدہ فیصلہ قرار دیتے ہوئے اپنی زندگی سے دور ہونے کا عندیہ دیتی ہے جو شہر یار کو یکسر شاکد کر دیتا ہے۔

گیارہویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے



کیسی دھند تھی اس کی سمندر ہوتی نگاہوں کے سامنے کہ جس کے غبار میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، خود یہ حتی الامکان قابو پانے کی کوشش میں اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا اس کی روح جیسے گہرے سکوت میں گھبرائی تھی اس کے دل پہ ابھی بھی سعید خان کے سب سے کھلاتے الفاظ کی پیش نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔

اسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب خود سعید نے کہا ہے اور یقین کرنے کے سوا چارہ بھی نہ تھا اگرچہ سعید جیسی موڈی لڑکی سے کچھ بھی بعید نہ تھا مگر الفاظ دیوے کی ایسی درشتی، وہ کس قدر آسانی سے اور کس بری طرح سے اس کے جذبات کو گھمرا کے جا چکی تھی۔

اس نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ شہر یار کے دل پہ اس کے تلخ الفاظ کیا قیامت ڈھائیں گے، وہ کس عذاب سے گزر رہا تھا یہ اسی کا دل جانتا تھا، بہت سے روپیلے خواب جو آنکھوں میں چمک رہے تھے وہ محبت کی تعبیر پانے سے قبل ٹوٹ گئے تھے، اپنی طرف سے محبت کی شدت سے تو وہ واقف تھا مگر اتنا نہ جانتا تھا کہ یہ شدت کی طرف ہی ہے، سعید کے گریز کو اس نے ہمیشہ لڑکیوں کی مخصوص مغروریت یا حیا کا نام دیا تھا، لیکن آج وہ بہت کھلے اور صاف الفاظ و انداز میں بتا رہی تھی کہ یہ بے نیازی یا حیا کا خول نہ تھا، بلکہ شدت کی بیزاری تھی جو وہ شہر یار کی شخصیت سے محسوس کرتی تھی اور اس بیزاری کو مسلسل اپنے اور اوڑھے رکھنے کا اسے کوئی شوق نہ تھا اور محبت تو ایسی چیز ہے جو زبردستی کسی سے کروائی جاسکتی ہے نہ چھینی، یہ تو اپنے آپ دل کی گہرائیوں سے نرم کوئلوں کی مانند پھوٹ پڑنے والا جذبہ ہے، محبت خواب بن کر جب آنکھوں سے ناسا جاوڑی ہے تو اگلا بندہ خود بخود اس کی شدت و خوبصورتی سے متاثر ہو کر اپنا آپ دوسروں کو سونپ دینے پر راضی ہو جاتا ہے، جبکہ یہاں تو سرے سے ایسا کوئی سلسلہ ہی نہ تھا، جو تعلق اور ربط ان کے درمیان میں تھا وہاں دکھ سکھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی انسان اس تعلق کی خوبصورتی و نزاکت اور احساسات تلخ کھویا سب خود بخود سمجھ جاتا ہے، مگر سعید علی خان جب تعلقات و رشتہ رفوز کر چکی تھی تو سمجھ کا ریزن آپ ہی آپ ختم ہو گیا تھا۔

اور یہ معمولی بات نہ تھی جو شہر یار پریشان نہ ہوتا اس کی تو پوری زندگی کا مسئلہ تھا اس کو سعید علی خان جتنی پیاری اور عزیز تھی، یہ وہ جانتا یا محبت میں سانسیں گننا بے چین دل کا مالک، ابھی سعید کے وجود و محبت سے ہٹ کر اس نے کسی لڑکی کے لئے سوچا تک نہ تھا وہ ہمیشہ اسی کے ساتھ جینے اور خوبصورتی سے زندگی کو بسر کرنے کے ڈھنگ سوچتا تھا، اسے اپنے محسوسات میں وہی کیفیت اچھی لگتی تھی، جو سعید کو دیکھتے، سوچتے ہوئے اس کی دھڑکنوں میں ابھرتی تھی اور اس کیفیت میں پورے دل سے جیتے ہوئے اس کے وہم و گمان تک بھی نہ تھا کہ کہیں چاہت سے سرشار کھوں میں انکار، نفرت اور بیزاری کا فریزنگ پوائنٹ بھی آجائے گا، اب جو انکشاف اس کی خوش فہمی میں جیتی ذات پہ منکشف ہوا تھا تو پورا وجود اگلی دم سے زلزلوں میں گھر گیا تھا۔

”اور سعید کو اس رویے کی وجہ.....؟“ بہت سوچنے پر بھی سمجھ نہ آ رہی تھی یہ تو وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی اور شخص موجود نہیں ہے اور واقعی وہ نہیں اور انوالو نہ تھی تو اس قدر کڑھکی کیوں، اتنا صاف انکار کیوں؟

”کیا وہ اپنے اور شہر یار کے مابین قائم تعلق، موجودہ رشتے کی نوعیت سے باخبر نہ تھی، پھر اتنا

بڑا فیصلہ یونہی تو نہیں ہو گیا اور اس کا اصل سبب کیا ہو سکتا تھا، شہر یار کو بھی کھوجنا تھا اس معاملے میں سب سے زیادہ قابل بھروسہ سعید کی واحد دوست صبا ہی ہو سکتی تھی جس سے وہ بڑے آرام سے ہر بات کر سکتا تھا اور صبا معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں اس کی مدد بھی کر سکتی تھی، ورنہ اس بوجھ کو خود پہ لادے پھرنے سے اسے اپنا آپ پاگل ہوتا محسوس ہوتا تھا، اپنے جذبات و احساسات کو کھسک کر دھوتے دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو پوری طرح لٹی ہوئے محسوس کیا تھا، اس کے وجہ سے چہرے پر دکھ کا گہرا احساس جیسے ثبت ہو گیا تھا۔“

دولت، شاندار نگہداشتی لائف اسٹائل، ایک متاثر کن شخصیت اور بہت ہائی کوالیفیکیشن سب کچھ تو تھا اس کے پاس، وہ سب جس کی کوئی بھی لڑکی خواہش کرتی ہے۔

”اور کیا الگ چاہے تھا سعید نہیں، جو تم نے اس شاندار لائف سٹائل رکھنے والے مکمل شخص میں نہ دیکھا کیا کی ہے جو تم متاثر نہ ہو پائیں اور تم نے دل کے آئینوں میں خود کو سنورنے دیا نہ بھرنے، آنکھ کی بستی میں ہلکورے لیتے خوابوں کی تعبیر کا نیا موسم جو آیا ہی چاہتا تھا، اسے اترنے یہ نہ دیا اور طلب کے سوکھے پتوں پہ سانس لیتے خواب توڑ دیے تم تو بہت حساس تھیں کسی غیر کی تکلیف پہ بھی تڑپ اٹھنے والی پھر میرے لئے یہ سرد مہری کیوں ابھری، تمہیں فیصلہ سناتے ہوئے مجھ پہ ترس کیوں نہ آیا، تم میری تکلیف کے احساس سے کیوں نہ تڑپ پائیں؟ کیوں، سعید آخر کیوں، ہ سب تم نے میرے ساتھ ہی کیوں کیا میں جو تمہیں اپنا سب کچھ مان بیٹھا تھا تم نے میرا مان توڑنے، مجھے کچی کچی کر کے میں لمحہ ہی لگایا کیوں؟“

بہت سے ان گنت سوالات اس کے سامنے سر اٹھائے کھڑے تھے اور وہ تفکرات کی چکی میں پستایوں متاسف کھڑا تھا جیسے اپنا کل اثاثہ ہار چکا ہو۔

نہ جانے کیسے ہیں شب و روز

نہ جانے کیسے ہیں نقیب شہر

نہ جانے ہنسنا بستا سادل

ہو گیا کیوں پل میں آسیب درد کا در

نہ بھائی ہیں کتابیں نہ سنتے ہیں گانے

نہ دوستوں سے ہوتی ہے گپ شپ

نہ انہوں سے ملن کا موقع ملتا ہے

اب تو موسم ہی ہے ایسا

کہ جتنا چھپاؤ زخم کو، یہ اتنا ہی کھلتا ہے

حسین چاندنی را میں بھی آرزو کوئی

جگاتی نہیں من میں

عجب بے کار سا دور ہے ہم پہ

پڑے ہیں عجب سی ابھمن میں

پرندے جھپکتے ہوئے گزرتے ہیں

نہ کوئل کوئی ہے آنگن میں

اب وہ بھی نہیں جو کہ
بے نام سی آس کا دیا تھا پہلے
پہنے ہوئے ننگن دکھا
گھڑے رہتے ہیں درپن میں
اندر ہی اندر دکھ سہتے ہیں
کوئی پوچھے تو چپ رہتے ہیں
گلوں میں ہوں کہ گھڑاروں میں
حسین دادی سے گزریں
بارہن مرغزاروں میں
کوئی داستان چھپنے فریب حسن یاراں کی
کوئی کرے باتیں جشن بہاراں کی
بھلا کے تجھ کو روش پہ شبنم کی ٹہلنا نہیں آتا
اب کسی بھی طرح سے دل کو بھلنا نہیں آتا

☆☆☆

لاؤنج میں ہوئی توڑ پھوڑ نے جیسے لیڈن ایلون کے دماغ میں خطرے کا سائرن بجادیا، ٹوٹی
کھڑکیاں، اکھڑے پردے قیمتی کا مینکس، امپورٹڈ شوپس، شیشے کے کینٹ بے جھانکنے والے
جدید ماڈل کا خوبصورت ٹی وی سیٹ سب چوراہا بڑا تھا، وہ اندر جاتے جیسے ٹھٹھک کر مڑی تھی
اسے ماریا کے انتہائی اسٹریس زدہ موڈ کا اندازہ ہو چکا تھا اس نے ہینڈل سے ہاتھ ہٹا کر لاک پھر
سے لگایا اور بڑے پریشان کن انداز میں اپنی پیشانی کو مسلاتھا۔

”انسان جب کسی بھی چیز سے مایوس ہو جاتا ہے تو یہ غیر تو جی اے آہستہ آہستہ ذہنی طور پر
بیمار کرنے لگتی ہے بہت سے معاشرتی مسائل اور اپنوں کی بے حسی سے مایوس ہوتے ہوتے وہ
زندگی کو ناکام تصور کرتا ہے تنہائی، بے چارگی اور رشتے چھوٹنے کا احساس اسے بہت جلد گہرے
ڈپریشن کی گہرائیوں میں چھوڑ دیتا ہے خراب صحت، خراب صورتحال اس کیفیت کو اور بھی نقصان دہ
بنادیتی ہے جب فرد اپنی زندگی سے صرف اور صرف کامیابیاں اور خوشیاں نکش کرنا چاہتا ہے اور
مقاصد کے حصول میں مسلسل ناکامی کا سامنا اور مزید ناکامی کا خوف اس کی زندگی کو ابنا کرنا
شروع کر دیتا ہے جس کے بعد ایک غیر مطمئن، اضطرابی کیفیت فرد کا گھیراؤ کر لیتی ہے اور مایوسی کا یہ
ڈپریشن ایک آکٹوپس کی طرح جسم و دماغ پر قبضہ کر کے زندگی اور خود کی درمیان ایک لکیر کھینچ
دیتا ہے، ڈپریشن کے شدید ترین لحاظ میں ایسا فرد اپنی یا کسی کی جان لینے پر تیار ہو جاتا ہے۔“

لیڈی ایلون کی سماعتوں میں کچھ دیر پہلے سائیکلٹرسٹ سے ماریا کی طبیعت پر ہونے والے
رد عمل کے متعلق الفاظ و گفتگو کی گونج سی ہوئی تو وہ ایک اضطرابی کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ماریا کا موجودہ رد عمل خطرناک تھا اور عین ممکن تھا دروازہ کھلنے پر وہ اپنی یا لیڈی ایلون کی
جان کے درپے ہو جاتی کچھ بھی تھا مگر لیڈی ایلون کو دروازہ کھولنا تھا کیونکہ ماریا کا شدید ڈپریشن
اور اسٹریس کی انتہائی حالت میں دیر تک کمرے میں بند رہنا بھی درست نہ تھا اور اسے باہر نکالنا

بھی اک رسی عمل۔

چند لمحے گونگو کی حالت میں رہنے کے بعد لیڈی ایلون نے بہت آہستگی سے دروازہ کھولا تھا
اور کمرے میں جھانک کر دیکھا تو ماریا اوندھے منہ بستر پر پڑی ہوئی تھی، اس کے گولڈن تراشیدہ
بال کندھوں پہ بکھرے تھے، لیڈی ایلون نے نرمی سے ایک ہاتھ سے اس کے سونے جیسے بال
چہرے سے اٹھا کر پرے کیئے اور دوسرے ہاتھ سے اسے سیدھا کیا تو گلے باز دوں، ٹانگوں پہ جگہ
جگہ کٹ لگے ہوئے کے باعث خون رس رہا تھا اور وہ نیم بے ہوشی میں بے سدھ پڑی تھی۔

”یہ لڑکی کیا بھی نازل زندگی جی سکے گی یا اسی طرح کی حرکتوں سے خود کو اور مجھے تکلیف دیتی
رہے گی۔“ لیڈی ایلون نے انتہائی پریشانی، کوفت اور بیزاری سے اپنے سامنے لیٹی رہی لڑکی کو
دیکھا تھا، جسے ڈاکٹر زمیڈیکل ٹریٹمنٹ دے رہے تھے، بہت احتیاط اور شدید کوشش کے بعد اس
کے زخم بینڈج کیئے گئے، ڈریس لگی ہوئی تھیں اس کی نبض اور بی پی سرکولیشن بھی بار بار چیک کی جا
رہی تھی۔

”دکٹ بہت گہرے اور خون بہت سا ضائع ہونے کی وجہ سے یہ بمشکل بچ پائی ہیں اگر انہیں
ہاسپٹل لانے میں ذرا بھی تاخیر ہو جاتی یا ان کے گروپ کا بلڈ نہ ملتا تو انہیں بچانا ممکن نہ تھا، ہائے دا
وے ایسا مسئلہ کیا ہے کہ یہ بار بار سوسائڈ (خودکشی) کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔“ ڈاکٹر زخم ختم شدہ
ڈرپ کی سرخ نکال کر نئی ڈرپ لگاتے ہوئے پوچھا تھا۔

”نیمیری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، بہترین سہولیات، بہترین طرز زندگی اور بہترین تعلیم کے باوجود
یہ کس قسم کے ذہنی خلجان میں مبتلا ہیں۔“
”کسی سائیکلٹرسٹ کو دکھایا۔“ ڈاکٹر نے پرسوج انداز میں پوچھا۔

”دکھایا ہے مگر ڈاکٹر صاحب سر پر والدین ہوں اور مذہب کا سر ہاتھ میں ہو تو کچھ بنے نہ تو
یہ کسی مذہب سے منسلک ہے اور والدین بھی لاطعلقی اختیار کر چکے ہیں، میں ایسی بوڑھی عورت اس
کو لے کر کہاں کہاں پھروں اور اس عمر میں کتنا کما سکتی ہوں جو اس کی ایسی حرکتوں پہ لگاتی جاؤں
پھر بھی مجھے اسے سنبھالنا پڑتا ہے کیونکہ یہ چند سال کی تھی جب میرے پاس آئی اسے ماں بن کر پالا
ہے کیسے مرتے دیکھوں۔“ لیڈی ایلون کا لہجہ بھرا گیا تھا بولتے ہوئے اس نے نشوونکال کر آنکھیں
صاف کیں۔

”میں زندگی کے اس حصے میں ہوں جب انسان ہر وقت موت کے دھڑکے کا شکار رہتا ہے
اور کسی لمحہ اجل نے مجھے آلیا تو اس لڑکی کا کیا بنے گا یہی سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔“ لیڈی
ایلون کا لہجہ حقیقی پریشانی کا غماز تھا۔

”اسٹریس اور ڈپریشن دو ایسی چیزیں ہیں جو خواتین خصوصاً طالبات پر بری طرح اثر انداز
ہوتی ہیں اور اسٹریس بنیادی طور پر ہماری زندگی اور اطراف کے ماحول میں تبدیلی کا رد عمل ہے اور
یہ مختلف حالات، ماحول اور لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق الگ الگ ہے جب ہمارا دماغ کوئی
اسٹریس یا ڈپریشن قبول کرتا ہے تو رد عمل کی ایک چین سی بن جاتی ہے نتیجے کے طور پر کئی منفی اثرات
سامنے آتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے مستقل ڈپریشن اور اسٹریس نے ان کے اندر غصہ اور نفرت پیدا کر دی ہو جو

دبانے سے مزید طاقت درہوتی چلی گئی اور نفرت کا زہر یلا درخت دشمن کو ختم کرے نہ کرے مگر جس انسان کے اندر اگتا ہے اس کے کردار میں ایک مستقل خامی پیدا کر دیتا ہے ایسا انسان بھی نارمل انسانوں کی طرح جی نہیں سکتا، وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے اور یہ بھی نہیں جان پاتا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے، اس کی منفی سوچ، ذہنی حالت خراب کرتی جاتی ہے تو پھر ایک کا عمل بار بار ہونے لگتا ہے اور اعصابی انتشار بھی بڑھتا جاتا ہے اور اس انتشار کا انتہا تک پہنچنا ایک خطرناک بات ہے، مریض صرف خود کو نہیں بلکہ کسی بھی دوسرے شخص کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور وہ دوسرا شخص آپ، میں یا کوئی بھی ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر نے بہت بار ایک مینی سے ماریا کی موجودہ ذہنی و جسمانی حالت پر تجزیہ پیش کیا۔

”اس صورت حال سے نکلنے کی کوئی راہ بھی تو ہوگی؟“ لیڈی ایلون نے امید افزا انداز میں ڈاکٹر کو دیکھا تھا۔

”یقیناً دنیا میں ہر عمل کا رد عمل اور ہر مرض کا علاج ہے، میں آپ کو ایک بہت زبردست اور کامیاب سائیکوٹرسٹ کا پتا دیتا ہوں جو فینک شونی (قدیم طریقہ علم) کے ذریعے حالات اور ماحول کی مناسبت سے مرض و ڈپریشن کو دور کر دیتے ہیں، مگر اس کے لئے آپ کو تنگنائی جانا پڑے گا۔“

ڈاکٹر نے دیکھا تو اس کا ہوش میں آنا اور چہرہ سہکتا ہوا اہم ہے باقی سب بعد میں دیکھا جائے گا۔

”یقیناً سب سے اہم چیز مریض کی ریکوری ہے اور دل پاور کا بازیو ہونا بھی۔“ ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور ایک بار پھر ماریا جو فک کی بغض چپک کرنے لگا اسی پل اس کی پلکیں لرزی گئیں بے حد اندھیرے میں ڈوبتے ذہن نے جیسے روشنی کا کوندھا لپکا تھا اور اس کی آنکھیں وا ہو گئیں۔

”Hello gud girl are you ok!“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اس کا رخسار تھپکا تھا۔

”Just fine“ مختصر سے دو لفظ کہہ کر اس نے لحظہ بھر سامنے کھڑی لیڈی ایلون کو دیکھا تھا اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

”ماریا تم ٹھیک ہونا، کیسا محسوس کر رہی ہو۔“ لیڈی ایلون بے تابگی سے پوچھتے ہوئے اس پر جھک گئی۔

”پلیز لیڈی ایلون شی از ویل، آپ زیادہ باتیں نہ کریں، یہ ہوش میں آچکی ہیں ان کے لئے آرام و سکون بہتر ہے حافظہ و ذہن یہ زیادہ بوجھ انہیں مننی ٹھکر کا شکار کر سکتا ہے۔“ ڈاکٹر پروفیشنل لہجہ میں بولا۔

”ڈاکٹر صاحب یہ اب خطرے سے باہر ہے ناں۔“

”ہنڈ رڈ پرسنٹ البتہ کچھ ٹریسٹ ہے جو ان کی سانس کی دیکھتے ہوئے شو ہوگی، فی الحال انہیں آرام کرنے دیں۔“ لیڈی ایلون نے کچھ طمانیت اور کچھ پریشانی کے ملے جلے تاثرات لئے خاموش لیٹی ماریا کو دیکھا پھر سینے پہ صلیب کا نشان بنا کر یسوع مسیح سے دعا کرنے لگی۔

☆☆☆

شیانستہ بیگم کچھ دنوں کے لئے دوسری گلی تھیں وہاں کئی ملکوں کے اشتراک سے ایک صنعتی نمائش ہو رہی تھی اور صبا بھی گھومنے پھرنے کے شوق میں ان کے ساتھ چلی گئی، اصرار تو انہوں نے سستیہ کے لئے بھی کیا تھا مگر وہ نئے نئے شارٹ کردہ بزنس کو چھوڑ کر ہرگز جانا نہیں چاہتی تھی اور اس وقت اسے ان کا چلا جانا غنیمت محسوس ہو رہا تھا، اگر وہ گھر پہ موجود ہوتیں اس کے اور شہر یار کے مابین ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی کانوں میں پڑ جاتا تو سستیہ کی خیر نہ تھی رہے پایا تو ویسے صبح کے گئے شام کو آتے تھے اور شہر یار وہ کہاں مصروف تھا کتنا بڑی تھا یہ بھی پایا سے معلوم ہوتا کیونکہ اپنے بزنس کی کچھ نئی برانچز کے لئے وہ بزنس ڈیلنگو کے لئے ہر وقت نہیں گیا ہوتا یا آفس میں رہتا، اس پہ بھی کام کا بوجھ تھا پھر بھی وہ صبا کو بہت مس کر رہی تھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو یا اپنی جذباتی کیفیت کو دور کرنے کے لئے۔

زندگی کے جس موڑ پہ وہ آ رہی تھی بڑا عجیب سا تھا، شہر یار اس کے لئے اچھے جذبات رکھتا ہے یہ وہ عرصہ سے محسوس کرتی آ رہی تھی مگر اس کے باوجود اس نے بھی ایسا اشارہ نہ دیا تھا کہ وہ غلط تھی کا شکار ہوتا، ویسے بھی حد درجہ حساسیت کے ساتھ وہ دل میں آئی بات فوراً کہہ دینے کی قائل تھی، چاہے وہ بات کیسی ہوئی اسے پریشان کرتی تو وہ دلوں سے نکالنے میں دیر نہیں لگاتی تھی یہ سوچے بغیر کہ مقابل پہ اس کا کیا اثر ہو گا لیکن شہر یار سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے میں اس نے سوچتے خود سے اچھے بڑے دن لگائے تھے۔

ہر بات پہ فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے خود کو سب کی نگاہ میں اچھا بے حد اچھا بنا کر پیش کرتا شخص جو ان کی نوازشات تلے دبا اس سے رشتہ جوڑتا اور دلچ زدہ چہرے، چھوٹی خوشی، دکھاوے کا سکھ، خود پہ طاری کر کے وہ سب کو اپنی آئینڈل زندگی کے بھلاوے میں مبتلا رہتی تو بھلا کیسے؟ جبکہ وہ ظاہر و باطن ایک سار کھنے والی صاف گوشت کی تھی اگر وہ خوش نہیں تو خواجواہ ایکٹنگ کر کے خود کو خوش ظاہر کرنے کی اسے کوئی خواہش نہ تھی، ایک مجبوری اور سمجھوتے کا رشتہ جو اس کی بے بسی سے مل جاتا تو زندگی کتنی اجیرن ہو جاتی اور وہ یہ کیسے ہونے دیتی وہ بھی اپنے ساتھ، وہ تو دوسروں کی خوشیوں، ان کے جذبات و احساسات کی اتنی پروا کرتی تھی تو اپنے جذبات و احساسات پر پھر رکھ کر اپنی ہی خوشیوں کی قربانی کیوں دیتی؟

اور یہ سب سوچ سوچ کر اس کا ذہن بہت الجھا ہوا صحنے لگا تھا، کیونکہ یہ سارا مسئلہ براہ راست اس کی ذات سے تعلق رکھتا تھا اور اس صورتحال سے باہر آنے کو اسے کوئی راستہ نکالنا تھا وہ راستہ کیا تھا، جب شہر یار کے سامنے فرضی سہمی مگر وہ تو سچ سمجھتا ناں اس کی جھوٹی کہانی محبت کو اور اس جھوٹے آپشن کا سننا تو اس کے متعلق کیا سوچتا اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی اسے غرض نہ تھی کیونکہ بے سمت راستے پہ چلتے رہنے کا سوچتے ہوئے اس کی اپنی جان مشکل میں پڑ جاتی، مشکل سے نکلتا تھوڑا دقت طلب ضرور تھا مگر ناممکن نہیں، صبا نے اس سے کہا تھا۔

”اول تو تمہارا ذہن خراب ہے علاوہ اور کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر اس سارے معاملے کو تم مسئلہ سمجھ بھی رہی ہو تب بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا، بہت دیکھ بھال کہ جس سے تمہاری آئندہ زندگی پر کوئی برا اثر نہ پڑے کیونکہ تم میری بہت پیاری دوست ہو اور میں تمہیں کسی غلطی کے سبب ندامتوں میں گھرا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔“

اور اس نے سوچ سمجھ کر جو شہر یار سے کہا وہ غلط تھا یا نہیں اور صبا کو یہ سب پتا چلتا تو وہ کیا کہتی، شائستہ بیگم جان جاتیں یا عفنان علی خان کو علم ہو جاتا کیا بنتا، مسئلہ جو بھی تھا اپنے تئیں اس نے ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ جانتی تھی وہ بچی نہیں جسے سب انگلی پکڑ کر غلط اور صحیح بتائیں اور وہ سب کی مانتے مانتے اپنی زندگی دشوار کر لیتی بلاشبہ وہ ایک حساس دل رکھنے والی لڑکی تھی، اپنے سے منسلک تمام رشتوں کے لئے جذباتی مگر جذباتیت کی کتاب میں یہ کہاں لکھا تھا کہ معاشرتی رشتوں کو بچاتے صرف ایک شخص کے لئے اپنی زندگی تباہ کر لیں، زندگی جیسی اصول نیت یونہی بے وجہ ضائع کرنے کے لئے تو نہیں عطا ہوئی تھی، بلکہ ہنس کر جینے خوشی پانے کے لئے ملی تھی تو وہ اداس کیوں رہے؟

”اچھا ہے موصوف خود کو بڑا ”بیبا بچہ“ بنائے پھرتے ہیں، اب پتا چلے گا کہ اس کھیل میں پاؤں رکھنے والے مخالف کو پلٹا بھی کتنا بھاری ہے۔“ بہت کمین سی خوشی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنے پسندیدہ سیاہ رنگ کا جدید انداز میں سلا فراک نکال کے پہنا، سفید کینوں سے چمکتی سیاہ نازک سے اسٹریپ والی جوتی، کلائی بھر جوڑیاں اور بہت نفیس چپلری سیٹ کھلے سیاہ بالوں کے بچ اس کا صبح چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا، لکٹی پرسکون اور خوش باش سی وہ میزھیال اتر رہی تھی ایک ایک قدم کچھ کچھ گر رہی تھی لالچ میں شہر یار کھڑا تھا اور وہ ہنسی مسکراتی اس کی موجودگی سے لاپرواہ اس کی توجہ سے بے نیاز یوں گزر رہی تھی جیسے جانتی تھی کہ نہ ہو اور یہ کچھ ہی تھا وہ اجنبی ہی تو تھی شہر یار کے لئے، اگر وہ جان پہچان یا اپنائیت کے رشتے سے منسلک ہوئی خود کو اس سے نسبت کا پاس دلائی تو پھر وہ سب کیسے کہہ دیتی جو اس نے ایکدم سے کہہ دیا تھا۔

شہر یار اپنے خوابوں، ارمانوں کی کرچیاں سمیٹتا اپنے ہاتھ لہو لہان کرتا محبت کی جنوں خیزی کے اس انجان موڑ پر ”محبت یوں نہیں اچھی“ کا راگ کیوں الپ رہا ہوتا۔

وہ لڑکی جسے اس نے اپنی سوچ کے زاویے پر بھی بڑی احتیاط سے اتارا تھا اس نے محبت بھرے جذبات کو رد کر کے اپنے شرعی تعلق کو نفی کرتے ہوئے اس کے سامنے، اس سے بہتر آپشن کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ اس کے شفاف کردار پر یہ کیسا حرف آئے گا پھر لڑکیوں کی عزت تو قہر مایٹر کے پارے کی طرح ہوتی ہے جس طرح قہر مایٹر ٹوٹ جانے پر اس کا بارہ ہاتھ نہیں آتا اسی طرح عزت کے نازک آئینے کو ٹھیس لگ جائے تو اس کی کرچیاں سمیٹی نہیں جا سکتیں۔

مگر یہ سب تو تیب ہونا ناں، جب حرف و لب کی توقیر کا پاس ہوتا کتنا حساس اور ہمدرد دل رکھنے والی ظاہر کرتی تھی وہ اپنے آپ کو اور اس کے احساس و دل کے ساتھ کیسے داؤ کھیل گئی۔

شہر یار کو وہ تو ہین آمیز لحاظ یاد آئے تو آنکھیں اہانت کے شدید احساس سے جل اٹھیں بہت سے خواب اور خواہشیں اس الاؤ میں سلنے لگی تھیں۔

تمہارے آخری خطوں کی

سطروں میں

عجب کچھ اسرار پنہاں تھے

کچھ خواب جو تم نے

آدھے آدھے بانٹ کر
میری آنکھوں میں رکھ دیئے تھے
وہ خواب ابھی تک جاگ رہے ہیں
گلاب کی جس ٹہنی پر تم نے
اپنے پیار کا ہاتھ دھرا تھا
وہ ٹہنی ابھی تک تازہ ہے
تیرے احساس کو خوشبو کی طرح
بارش کی بو جھاڑ میں
بھینکتی اس لڑکی کا چہرہ
اب تک وہ دیکھ رہا ہوں
آدھے سوکھے، آدھے گیلے خوابوں والی
اس لڑکی کو
بے خود سا، چپ چاپ سا نکلتا
کہیں اپنے اندر ڈھونڈ رہا ہوں

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں گاؤ ٹیکے کے سہارے بیٹھی تھی ہاتھوں میں گرم مٹر پلاؤ کی پلیٹ تھی جس سے تھوڑا تھوڑا کھاتے ہوئے وہ زندگی کے متعلق سوچ رہی تھی، زندگی کے اس مشکل روپ کے متعلق سوچ رہی تھی جس پر وقت کے بے رحم تھپڑے نے ایکدم سے لاکھڑا کیا تھا اور زیست یوں مشکلوں میں گھری گئی کہ گزرا زمانہ، خواب خواہشات سب اک موموم خیال محسوس ہو رہا تھا۔

نئی آسان زندگی، بسر ہو رہی تھی جس میں سکھ، آرام، بے فکری کے ساتھ کسی کی نرم لود بیتی نگاہوں کا احساس چاہ بھی تھا توجہ و محبت کا مان بھی اور کچھ دن گزرتے تو یہ ادھ کھلا پھول پوری توجہ سے دمکتا کہ اب اور معاذ کی موت نے سب کچھ ملامیت کر دیا، خوابوں، تمناؤں کے خوف شکنی کے ساتھ گھر کا بوجھ بھی اس کے ناتواں کندھوں پر آگیا، سب سے بڑھ کرائی کی نیم خستہ حالت اور ان کا خیال آئے ہی اریہ کے اندر درد کی ٹیس سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا تھا اللہ میاں جو آپ امی کو تندرستی دے دیتے کم از کم اتنی اذیت تو محسوس نہ ہوتی جتنی اب ہو رہی ہے۔“ آنسواریہ کے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے ان ممکن آنسوؤں کا ذائقہ اپنے حلق میں اترتا محسوس کیا تھا۔

”یہ کیا رہا آپ، آپ ابھی انہی جاو لوں کو لئے بیٹھی ہیں، ارے رو رہی ہیں پلیز آبا زندگی کا جو رخ سامنے آیا ہے اس سے سمجھوتہ کر لیں۔“ ربیعہ جو بولتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی اب اس کے سامنے پریشان نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”سمجھوتہ مگر کیسے ربیعہ، سبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی حج تفریق کے لاتعداد سوالوں کے درمیان لاکھڑا کرے گی یہاں زندگی، احساسات، خواہشات سمیت سب جذبے تقسیم ہوں گے ضرب نہیں اور حاصل تقسیم کچھ نہ آئے گا۔“ اس کی آواز میں گہرے درد کا رچاؤ تھا جسے اندر آتے

وہاں حسن نے بھی شدت سے محسوس کیا۔
 ”اریہ تم صرف گٹیوں ہی کیوں لیتی ہو رہات کو، یوں تو زندگی اور بھی مشکل لگے گی، کھلے دل و دماغ سے سوچو تو سب آسان لگے گا۔“
 ”آسان، ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کیونکہ تم درد کے اس کوہ گراں میں نہیں کھڑے یہاں ہم ہیں۔“ وہ طنز اُبولی۔
 ”اریہ، تمہارا درد تو پورے احساس سمیت محسوس کر سکتا ہوں، درد بٹا سکتا ہوں۔“ وہ کچھ دکھ سے بولا۔
 ”نہیں وہاں اپنا دکھ صرف اپنا ہوتا ہے، یہ جان لیا، جب سے جان لیا تب سے ایسے دعوے زبانی کلائی لگنے لگے ہیں۔“ وہ بنا تاثر بولی۔
 ”کسی کو آزمائے بنا ایسی بات نہیں کرتے۔“
 ”اور جو پتا ہوا اگلا کسی آزمائش میں پورا نہ اترے گا تو۔“ وہ بہت کھوجتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”ضروری نہیں کہ تم ہر کسی کو صرف اپنے معیار کی کسوٹی پر رکھو۔“ وہ خفا ہوا۔
 ”اچھی بات ہے چلو اگلے بندے کے معیار پر رکھ لیں گے ذرا وقت آنے دو، فی الحال تم یہ بتاؤ صبح مجھے یونیورسٹی چھوڑ دو گے۔“ وہ یکدم موضوع گفتگو پلٹتی ہوئی بولی۔
 ”ابھی ٹھیک سے تندرست بھی نہیں ہو میں اور یونیورسٹی۔“ وہ الجھا۔
 ”وہاں یہاں میں ہوں وہاں مجھے تندرستی سے یہیں زندگی سے غرض ہے زندگی کے معاملات جو میری توجہ چاہتے ہیں۔“
 ”کیسی توجہ؟“ وہاں نے بغور اسے دیکھا تھا۔
 ”میرا خیال ہے میں کچھ وقت کے لئے تعلیمی سلسلہ موخر کر دوں اور کہیں جاب دیکھ لوں تاکہ گھر کا نظام کچھ ایڈجسٹ ہو سکے۔“ وہ کچھ پرسوج انداز میں بولی۔
 ”جاب مگر کیوں؟ تم جاب نہیں کر دو گی اریہ۔“
 ”اچھا اور شہباز، ربیعہ، جویریہ کی پڑھائی کا خرچہ میرے یونیورسٹی کے اخراجات گھریلو بجٹ اتنا کچھ کیسے ہوگا۔“

”میں ہوں یاں سب کرونگا مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میری ہونے والی عزت کچھ روپوں کی خاطر سڑکوں دفاتر پہ پھرنی طرح طرح کی اچھی بری نظروں کے حصار ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔
 ”انتہا حساس ہے اس عزت کا تو مجھے اپنالو۔“ وہ یکدم بولی۔
 ”اریہ میں نہیں ہی اپناؤں گا مگر کچھ وقت آسان ہونے دو ابھی تم جانتی ہو انزلہ کی شادی ہوئی ہے ہمارے آئندہ بیٹی ہیں جوان بہنوں کو چھوڑ کر صرف اپنا سوچنا میں کیا اچھا لگوں گا؟“ وہ ناصحانہ انداز میں بولا۔

”تمہارا وقت بھی آسان نہیں ہوگا وہاں کیونکہ تم اسے آسان کرنا ہی نہیں چاہتے، جب تک تمہارے سر پہ یہ ذمہ داریوں کے پہاڑ تھے ہیں تمہیں میرا وجود کہیں نظر ہی نہیں آئے گا اور تم بوڑھے ہو جاؤ گے نہیں بیاہتے بیاہتے۔“ وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

”بوڑھا ہو گیا تب بھی شادی تو تم سے ہی کروں گا۔“ وہ اس کا غصہ کم کرنے کو نیم مزاحیہ انداز میں بولا۔
 ”اور تم کیا سمجھتے ہو کہ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے تھکے دے ادھ کھچڑی زدہ بالوں والے شخص کا میں سالوں انتظار کروں گی۔“ وہ تھکے لہجہ میں بولی۔
 ”محبت تو بڑی بڑی مشکلات سہتی ہے تم ذرا سا انتظار نہیں کر سکتیں۔“ وہ اب بھی اس کے لہجے کی تتلی کو نیم مسکراہٹ زدہ لہجہ میں لے گیا۔

”وہ پاگل پن ہوتا ہے وہاں محبت نہیں اور میں یہاں کھڑی ہوں وہاں مجھے زندگی کی حقیقتیں دکھائی دے رہی ہیں جو ہوشمندی چاہتی ہیں مجھے خواب نہ دکھاؤ بغیر دو، وہ تعبیر جس کی خواہشیں تم نے میرے اندر اتاری تھیں، مجھے اس وقت تمہارے الفاظ نہیں عمل کا ساتھ چاہیے ورنہ تم مجھے کھودو گے۔“ اریہ کا لہجہ و الفاظ دونوں تھے وہ یک نیک اسے دیکھ گیا کیونکہ اس کے دہم و گمان میں بھی اریہ کا یہ انداز درویدہ نہ آئے تھے۔

”کیسا عمل چاہیے تمہیں؟“ وہ کتنی دیر بعد خود کو سنبھالتا بولا۔
 ”دیکھ وہاں بات بالکل سیدھی اور سچی یہ ہے کہ مجھے فوری طور پر دورا سے نظر آرہے ہیں ایک تو یہ کہ تم مجھ سے شادی کر لو اور میرے ساتھ مل کر میرے گھر کو سپورٹ کرو کیونکہ ایک مضبوط سہارا اور آمدنی کا اک مستقل ذریعہ میری اشد ضرورت ہے، دوسری صورت میں مجھے خود اپنے لئے راستہ تلاشنا ہے ہر بھر دوسرے تعلق چھوڑ کر نئے موڑ سے زندگی شروع کرنی ہے اور اس دوسری راہ میں صرف میری ترجیحات ہوں گی تم کہیں نہیں ہو گے اگر چاہو تو فرسٹ آپشن قبول کر لو ورنہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“ وہ بہت مادہ پرست انداز میں بولی تھی۔
 ”اریہ تم سب جانتے بوجھتے میرے حالات و زندگی سے واقف ہوتے مجھے ایک مشکل راہ سمجھا رہی ہو۔“ وہ کچھ دکھ اور غصے سے بولا۔
 ”میں کچھ نہیں جانتی سوائے، اس کے کہ مجھے اپنی پاگل ماں کا علاج کر دانا ہے بہنوں بھائی کو اچھی تعلیم دلوانی ہے۔“

”اور میری بہنیں، میری ماں ان کا کیا سوچا تم نے جن کا واحد سہارا میں ہوں، مجھے بھی ان بہنوں کو بیاہنا ہے، مگر ساتھ ساتھ تمہارا بوجھ بھی اٹھاؤں گا ہمدردانہ طور پر، اخلاقی اصولوں کے تحت، ہاں شادی کے لئے مجھے کچھ وقت چاہیے کم از کم ہمارا دشمن کے فرض سے سبکدوش ہو کر ہی اپنے لئے سوچنا ہے مجھے۔“ وہ اپنی مجبوری بتاتا گیا۔

”اور میرے لئے، میرے لئے کون سوچے گا۔“ وہ کتنے تلخ انداز میں بولی تھی۔
 ”میں..... میں ہوں اریہ تمہارے لئے سوچنے والا۔“ وہ بہت خلوص و جذب سے بولا تھا۔
 ”نہیں وہاں تم اپنی مجبوریوں تلے دے صرف اپنی بہنوں کا سوچ سکتے ہو، اریہ اشفاق کا نہیں جسے گھر سے نکلنے سے کسی مضبوط نام کا حوالہ چاہیے، جسے اپنا سرکٹ چلانے کو اک ذریعہ آمدنی چاہیے، ہمدردی اور اخلاقی امداد کے ٹوکے تم سنبھال رکھنا کسی وقت تمہیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے، میں اپنا بوجھ خود اٹھا لوں گی۔“ وہ جیسے بات ختم کرتے ہوئے دو ٹوک لہجہ میں بولی۔

”اربیہ اتنی روڈ اور خو غرض نہ بنو تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“
”میں سب سمجھتی ہوں زندگی کے اکیس سال گزار چکی ہوں، مجھے اپنے اچھے برے کا بخوبی علم ہے۔“

”اگر تمہیں اچھے برے کا علم ہوتا تو یہ الفاظ نہ کہتیں۔“ وہ متاسف ہوا۔
”مجھے کیا کہنا ہے کیا نہیں یہ ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں اور بخدا اس وقت تم چلے جاؤ۔“ وہ جیسے زچ ہو کر بولی۔

”Areeba behave your self۔“ وہ سر زش کرنے والے انداز میں بولا۔
”Wahaj for God, please leave me alon۔“ وہ ایکدم سے بہت سیٹ لہجے میں سیٹ تاثرات کے ساتھ بولی تھی وہاں کچھ دکھ غم غصے اور اشتعال کے ملے جلے تاثرات بھری خفیف نگاہ اس پر ڈالتا دروازے کو ٹھوکر لگاتا نکل گیا۔

دیکھو کہ آچلی عذاب رت
سنو کہ مجھے آنسو چھانے دو
سنبھالو تم بھی ادھوری خواہشیں اپنی
مجھے بھی خوابوں کی راکھ اٹھانے دو

☆☆☆

خواب جلتے ہیں میری آنکھوں میں
دربانی کے موسم میں
دشمنوں کی عجب کہانی ہے
تیری آنکھوں نے جو کی ہے
وہ کوئی تھا، مٹو رک وفا ہونے کو ہے
سوچوں بھی تو دل لرزتا ہے
عجب اک حادثہ ہونے کو ہے

کیسا عجیب سفر تھا کہ جہاں سے شروع ہوا تھا وہیں پہ آ کے ختم گیا تھا، یہ محبت کا موسم اتنا جلد ڈھل جانے والا اور ظالم کیوں ہوتا ہے؟ اگر محبت مہربان ہے تو ہم انسان ایک دوسرے پہ اتنا ظلم کیوں کرتے ہیں، محبت کو عزیز کیوں نہیں رکھتے اور اسے پھلتا پھولتا دیکھنے کی بجائے خالی کرتے جاتے ہیں، کتنی خاموشی سے اپنی جاں ٹوٹتے، ارمان ٹھکرتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کر پاتے۔
”جس دل میں بدگمانی ہو اس کی منڈیروں یہ محبت کے چراغ بھی نہیں جلتے، تمہارے دل میں بھی بدگمانی ہے مگر کیسی جو دور کی جاسکتی ہے نہ مٹائی جاتی ہے۔“

”مجھے معلوم نہ تھا محبت ایک ایسا خواب ہے جو کسی دوسرے کی مرضی پر منحصر ہے اور ایسا خواب جو میرے لئے خوشی تمہارے لئے اذیت کا باعث بنے کیسے دیکھوں اور کیسے بھلاؤں، ہم جو سوچتے ہیں سب پورا نہیں ہوتا مگر کتنا مشکل ہے دل کو سمجھنا جبکہ دل سمجھنا ہی نہ چاہے۔“ ایک بار اس نے اپنے استاد سے ایک بات سنی تھی۔
”ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کا جائزہ لیں تاکہ وہ کبھی بڑی غلطی بن کر آپ کی ناکامی کی

وجہ نہ بن جائیں۔“

اور اس نے یہ بات اپنے ذہن میں محفوظ کر کے رکھ لی تھی جب وہاں حسن نے اس کی بنی بنائی پوزیشن کو اپنی ذاتی محنت، حد درجہ ذہانت کی وجہ سے اپنے نام کیا تھا تب بھی اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کر کے اسے گلے لگاتے اس نے بڑے حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا اور مثبت رویے کو پروان چڑھایا تھا۔

سعید کے لئے سوچتے ہوئے بھی اس نے زندگی کو، رویوں کو جب بردتا تو ہمیشہ ان سے خوشیاں کشید کرنی چاہئیں اور اپنی پرفیکشن (اندر کی توقعات) کو متاثر ہونے نہیں دیا مگر انھوں سے رنگ چنتے اس نے بھی گمان تک نہ کیا تھا کہ اس پرفیکشن کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا، سعید کے دل و دماغ پر لاکھ بدگمانی سہی مگر شہر یار نے تو اسے پوری توجہ سے چاہا تھا، دل کی تمام تر شدتوں سے سوچا تھا اور اس کی بیزاری کے باوجود بار بار اس کی طرف پلٹتا تھا کیونکہ وہ اس سے محبت کرتا تھا جنونی محبت، وہ ہمیشہ خود کو ناقابلِ تسخیر گردانتا تھا مگر سعید خان اس کی ذات کی ساری مضبوط دیواروں کو توڑتی اس کے دل تک آچھپی تھی، خود سے بے پروا موڈی لڑکی اس کی ساری پرواہ سمیٹتی رہی تھی، پھر اب اس وقت، اس لمحے وہ خود کو اپنی زندگی کو اپنے سے وابستہ خوشیوں کو اس سے الگ کر کے سوچتا تو بھلا کیسے؟

جبکہ وہ جی ہی اس کے تصور میں رہا تھا اس کی صمیمیت اس کے دلچسپ چہرے سے ضیاء پا کر چمکتی تھیں تو شامیں اس کی پلکوں سے سلونی ہوتی تھیں وہ اپنے دل کو لاکھ سمجھاتا مگر دل مانتا کب ہے؟
دل کو اس راہ پہ چلنا ہی نہیں
جو مجھے تجھ سے جدا کرتی ہے

اس نے گھر میں کسی سے سعید سے ہونے والی گفتگو کا تذکرہ تک نہ کیا تھا اور کرب کے تمام موسم وہ اپنے اوپر تنہا جھیل رہا تھا اور کیوں جھیل رہا تھا یہی سوال جب وہاں نے کیا تو وہ بڑی بے دلی سے ہنسا تھا۔

”محبت کرتا ہوں ناں، محبت گوارہ ہی نہیں کرتی اسے کسی کی نظروں میں ہلکا بڑنے دول، خواہ وہ اس کے اپنے ماں باپ کیوں نہ ہوں اور صرف یہ ہی کیا میں سب کچھ سہہ سکتا ہوں وہ کچھ بھی کہے، کچھ بھی کرے، کوئی رخ بات، رخ اقدام، میں جھیل سکتا ہوں کیونکہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“

اور وہاں محبت کی اس حیران کن شدت یہ کتنی دیر ساکت اسے دیکھے گیا، ایسی شدتیں یہی، دیوانگی وہ بھی تو رکھتا تھا ارہ یہ کے لئے اور وہ بھی تو اس سے رخ ہو گئی تھی مگر ارہ یہ اور سعید کے رویے و حالات کے پس پردہ بہت فرق ہے ارہ یہ کے اپنے گھریلو اسباب، معاشی تنگدستی اور ہمدردی و خلوص کی بے رعیتی ہے جو اسے اکثر و بیشتر رخ کر دیتی ہے جبکہ سعید کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔

یہ اس کی بے لوث محبت کی انتہا تھی کہ وہ سعید کے مد مقابل ارہ یہ کو Plus point دیے جا رہا تھا اور ساتھ شہر یار کو بھی حوصلہ دے رہا تھا۔

”یار یہ محبت اتنی بے بس کر دینے والی چیز کیوں ہوتی ہے کہ آپ کتنا ٹوٹ جائیں، کتنا

بکہ مہرتے جائیں مگر یہ محبت نام کا چار حرنی لفظ کسی محاذ پر مارنے نہیں دیتا ہاں بس کبھی شکست و ریخت کے لمحوں میں احساس برف ہونے لگتا ہے پھر یوں لگتا ہے جیسے حوصلے ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہوں، تاہم جلتی بجتی آنکھوں میں کسی حسین آرزو کے لودیتے خواب کروٹ لیں تو ہمتیں پھر سے چمک اٹھتی ہیں حوصلے پھر مسکرا اٹھتے ہیں اور آپیں بھر تادل پھر کہنے لگتا ہے تم میرے ہو۔“ شہر یار نے جیسے بڑے بے بس سا ہو کر پوچھا تھا اور وہاں حسن مسکرا اٹھا تھا۔

”یہ کچھ چھٹی کچھ باندھتی، کچھ لوثی، کچھ جوڑتی کیفیت ہی تو محبت کا حسن ہے محبت کی کشش ہے بہت آرام سے بنانا لگے ملتی شے کی اتنی قدر اتنی کشش کب ہوتی اور وہ اپنا احساس اتنی شدت سے کب دلاتی ہے جیسے شدید دعاؤں کڑی ریاضتوں اور لمبے انتظار کے بعد ملی چیز اپنا آپ باور کراتی ہے، اپنی ہمت سمجھاتی ہے، محبت تو محبت ہے، آپ اپنا حسن آپ اپنی خوبصورتی تنہائی میں یکجائی، ویرانی میں محفل اور محفل میں شہنائی۔“ وہاں نے اسے دیکھا تھا جو اب کھرا سا لگ رہا تھا، وہ کچھ دیر اسے یوں دیکھتا رہا پھر اک گہرا سانس سچتے ہوئے کہا تھا۔

”دوسرے تم نے اس کی ٹھوڑی سی آبی ڈالی تھی، اس کے انکار کے پس پردہ محرکات کیا ہیں کیونکہ ہو سکتا ہے وہ کسی اور سے محبت کرتی ہو۔“ شہر یار نے تڑپ کر وہاں حسن کو دیکھا تھا بھلا وہ لڑکی جسے وہ کرم دراز سے پوری شدتوں سے چاہتا آ رہا ہو پھر وہ اس کی منکوحہ بھی ہو اس کے لئے ایسے سوچنا کہ ہنا کتنا سواہان روح تھا کوئی اس کے دل سے پوچھتا اس کی آنکھیں یکدم بھر آتی تھیں اور وہاں نے اپنے عزیز دوست کا دکھ جیسے دل سے محسوس کیا تھا۔

”دیکھو شہر یار زندگی اور محبت کے آپشنز بدل بھی سکتے ہیں اور ہمیں کسی بھی لمحہ کسی بھی روئے و موڑ کو لے کر اگلے بندے کے لئے اپنے طور پر طے کرنا ہوتا ہے تھوڑا ریلیف دینا پڑتا ہے بعض اوقات ایسا کرنا ہمارے اپنے حق میں بھی بہتر ہوتا ہے، ہم خود بھی کسی نتیجہ خیز موڑ پر پہنچ جاتے ہیں اور اگلے بندے کے راستے بھی آسان ہو جاتے ہیں تم اسے جانو، سمجھو، پوچھو کہ گریز و انکار کی اس منزل تک لانے والے عوامل کون سے ہیں اور ان کا تدارک کیا ہے اسی طریقے سے سمجھ کر تم معاملہ سلجھا سکتے ہو یا پھر اس کی دوست سے مدد لو کیونکہ دوست آپس میں ایک دوسرے کے بہت سے معاملات و رویوں کو جاننے میں سلجھانے میں قریبی عزیزوں سے زیادہ مددگار ہو سکتے ہیں۔“

”اس کی صرف ایک دوست ہے اور وہ ان دنوں دوئی ٹور پر ہے رہا اس سے پوچھنا تو تم کیا سمجھ رہے ہو اس کی کلانی کے بعد بھی وہ ریلیکس موڈ میں مل سکتی ہے۔“

”کیوں نہیں وہ صرف تمہاری کزن یا محبت ہی نہیں بلکہ منکوحہ بھی ہے تم جب جس وقت چاہو اسے رو برو پوچھ سکتے ہو کچھ بھی۔“

”یہ صرف کہنا آسان ہے کیونکہ تم اسے جاننے نہیں حد سے زیادہ موڈی لڑکی ہے چاہے تو مل میں سامنے کھڑے بندے کو عرش پر بیٹھا دے چاہے تو لمحہ کے ہزار ویں حصہ میں زمین پر بھی کھڑے ہونے کے قابل نہ چھوڑے۔“

”اگر تم کہو تو میں بات کروں۔“ وہاں کچھ پرسوج انداز میں بولا۔

”نہیں اسے یہ بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ باہر سے اٹھ کر کوئی ٹھڈ پر سن اس کی زندگی کو ڈمسک کرے۔“ شہر یار نے فوراً انکار کیا۔

”تو پھر ایسے میں تم کیا کرو گے۔“ وہاں نے استفسار انداز میں دیکھا۔

”سوچتا ہوں کیا کروں۔“ وہ آنکھیں بند کر کے سر یوں لوٹ چیر کی بیک سے نکاتے ہوئے بولا اور وہاں اس پیارے انسان کو دیکھتے ہوئے اس کی محبت کے ملاپ کی دعا سپرد فضا کرنے لگا۔

میرا چشمہ خلستان سائیں

میرا بادل سبز بھر
تو بخت میرا تو بخت میرا تو محل میرا تو گھر
میں پچھی اک دعا مانگوں تو کر منظور اگر
یا شجرہ ہنجرہ شام نہ دے، یا کاٹ لے میرے پر

☆☆☆

”ایسی کون سی چیز ہو سکتی ہے جو زندگی اور زندگی کے رویوں کو آسان کر دے۔“ وہ زہر جو خیالوں، دل، دماغ اور نظروں میں آ کر اندر باہر کی ساری فضا کو مکدر کر دیتا ہے اسے دھو ڈالے۔

غیر اطمینانی رشتوں، رویوں، مذہب، معاشرتی اصولوں کی، بے سکونی جو اندر تک دل و دماغ کو جھلک اچھا دینیں پھنسا دیتی ہے۔

حد درجہ حساسیت، دماغی چیقلش، ذہنی تناؤ اور جذباتی دباؤ، کیا وہ واقعی ان سب چیزوں کا شکار ہو گئی تھی وہ جو مثبت احساسات تعمیری سوچوں کے ساتھ زندگی کو چھٹی تھی جو انسانیت سے محبت کرتی تھی بلا تفریق رنگ و نسل، مذہب و قوم، جو اپنے پیدا کی مذہب سے محض اس لئے باغی ہو گئی تھی کہ وہ انسانیت کے کلی رہنما اصولوں کا داعی نہ تھا اور وہ انسانوں میں امتیاز کی قائل نہ تھی، اس نے تو دوسروں کے منہ پر برتاؤ کے پیچھے بھی وسیع اقلیتی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے اپنی روشن اصولی اور پر جوش فطرت کو بھی کبھی تباہ ہونے نہ دیا اور اسے معلوم تھا یہ راتوں رات اعلیٰ ریاضت کے حامل سوامی بننے یا ریاضتوں کی کڑی آزمائش سے گزرنے والے اولیاء کی کہانی نہیں بلکہ ایک گڈ آئی، کیو، لیول یا ملڈ میو ریل گرل کی کہانی ہے، ایک سیدھی سادی مائنڈ یا ڈی سیٹیکلک تھی جو جانے کیسے براہ راست اسٹریٹس رسپانس تک پہنچی اور اس کے کاری سول مسئلہ دباؤ کا شکار کرنے کے باوجود ظالمانہ انداز سے اس کے عضلات کے نشوز بر باد کرتے ہوئے قوت مدافعت میں کمی کر دی، اب وہ خیالوں، خیالوں میں اپنی خواہشوں کی ناکامی پر روئی، اپنے مقاصد کی منزل نہ پانے پر جذبات بھڑکانا اور دوسروں سے انتقام لینے پر کمر بستہ ہو جانی اور عملی طور پر اپنی استطاعت نہ رکھتے ہوئے اپنے مقاصد کی راہ میں آنے والوں کو بھی دیواروں میں چنوا دیتی، بھی خیالوں ہی میں انہیں ذبح کر دیتی اور یہ دماغی مصروفیت تھا کہ لہکان کر دیتی اس کا پورا وجود ایک ان دیشی آگ میں جلنے لگتا ایسی آگ جس سے دھواں اٹھنے نہ جگا رہاں لگیں مگر وجود پھر بھی راکھ یا خاک ہوتا جائے۔

”اور وقت و واقعات کے ان خوفناک اثرات سے وہ بھی باہر بھی نکل سکتی تھی کہ نہیں؟“ یہ ایک ایسا خوفزدہ کر دینے والا سوال تھا جس نے لیڈی ایلون کو بالکل توڑ کر رکھا دیا تھا، آج چرچ میں بڑا مذہبی اور روحانی اجتماع تھا لیڈی ایلون نے ماریا کے لئے خصوصی طویل دعا کروائی تھی وہ یسوع مسیح پر مکمل یقین رکھتی تھی اور اس کا ایمان تھا کہ ہر انسان کو نجات صرف عیسائیت کا عقیدہ ہی دے سکتا ہے، بھلے ماریا مانے نہ مانے مگر اس کی نجات بھی عیسائی تعلیمات کے ماننے میں ہی تھی۔

چرخ سے واپسی یہ وہ ماریا کو شہر گھمانے لے آئی تھی تاکہ ماریا کی طبیعت میں کچھ بٹاشت اور بہتری آئے اور ماریا بھی بڑے آرام، حد درجہ خاموشی سے لیڈی ایلیون کے برابر بس میں بیٹھ گئی بس میں شہر گھومنے کے لئے تقریباً ڈھائی ڈالر سے بھی کم خرچ ہوتے ہیں اور پیدل چلنے والوں کے لئے بھی دقت نہیں کیونکہ شہر میں مختلف جگہیں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

پینکٹن اپنے خوبصورت قدرتی مناظر اور ہری بھری پہاڑیوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے یہاں پر خوبصورت ولاز نظر آتے ہیں اس شہر میں تقریباً باغی سو مربع کلومیٹر پر پارک اور جنگلات پھیلے ہوئے ہیں اور اسی خوبصورتی کی وجہ سے ماریا نے یہیں تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور شہر کے مغرب میں پہاڑی کے اوپر مشہور وکٹوریہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا، ان کی بس اسی جگہ موجود پینکٹن یونیورسٹی کے گارڈن کے پاس سے گزرتی تھی یہی اسی گارڈن میں اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں بیٹھی گھنٹوں گوسپ کیا کرتی تھی، گارڈن میں کچھ دیر گزارنے کے لئے اترنے والے لوگ کیبل کار کی سہولت سے مستفید ہو رہے تھے اور ماریا خالی الیون کے عالم میں ایک تنگ تیزی سے گزرتے دور ہوتے مناظر کو دیکھ رہی تھی اس کی نگاہوں میں کوئی تاثر تھا نہ چہرے پہ کوئی احساس، بس اک ساپاٹ رویہ ساپاٹ نظریں جیسے وہ یہاں موجود نہ تھی لیڈی ایلیون نے تاسف کے اک گہرے احساس میں گھر کر اسے دیکھا تھا اور اس کو متوجہ کرنے کے لئے پوچھا۔
”ماریا اگر تم جاہو تو ہم کسی بار میں جا سکتے ہیں۔“ ماریا نے صرف دیکھا تھا بولی کچھ نہیں تو لیڈی ایلیون نے وہ مشہور بارز جوبن کے دقت کھلے رہتے ہیں ان کی تفصیل اور ڈیوڈ اپنے ٹور گائیڈ سے معلوم کرنے شروع کر دیے۔

”ڈے ٹائم تک میں پھر شوٹز، کوپولس، اسٹبلشمنٹ، گڈ لک، بلیٹنڈ پینکٹن کے مشہور بار میں اور اگر آپ کو انڈر گراؤنڈ میوزک میں دلچسپی ہے تو والو ایک مشہور بار ہے یہاں ابھرتے فنکاروں کا ہر وقت جھمکھار رہتا ہے، جبکہ ہنگ برڈ اپنے لائیو میوزک، ڈیرس کافی اور کاک ٹیل کے لئے مشہور ہے، ڈک لیور پارٹی یہاں کہ ہر دلچیز مشروب ہے۔“ ٹور گائیڈ اپنے مخصوص روایتی انداز میں فر فر تفصیلات بتا رہی تھی اور ماریا اس کے بے فکرے خوش باش انداز و اطوار کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر یاسیت میں گھرنے لگی۔

”کیا اس سفر میں موجود لوگوں کو بھی کوئی پریشانی ہوگی، وہ بھی اپنے ارد گرد اپنے اندر بار اپنے روحانی و مذہبی تضاد سے شاکی تھے کہ نہیں؟“

”کیا کسی مقصد، کسی تلاش کے حصول نے انہیں بھی بھٹکایا، تھکایا اور رلا یا ہوگا کہ نہیں؟ کیا میری طرح ان لوگوں نے ذہنی و جسمانی اذیت سہی ہوگی اور اپنے حصول شوق کی ناکامی نے ان کے اعصاب کی توڑ پھوڑ کے اعتادات کو شکست کا شکار کیا ہے؟ کیا یہ لوگ بھی سب غبار ہونے سب راکھ ہونے کی تکلیف سہہ چکے ہوں گے اگر نہیں تو پھر اتنے انسانوں کو خوش رکھتے ہوئے میرا خیال کیوں نہ آیا؟ جبکہ میں تیرے لئے کتنا بھگتی، پھر بھی۔“ اس کی آنکھیں بھرا کیں اور دل بوگھل ہونے لگا۔

”پھر بھی تو نے اتنے سارے لوگوں میں خوشیاں، سکھ، طمانیت بانٹتے دکھ دینے کو صرف مجھے چنا جبکہ میں تیر خلیق تھی تو نے مجھے میری مرضی سے نہیں اپنے حکم سے دنیا میں بھیجا تھا، اچھا ناک

نقشہ اچھا رنگ روپ اور اعلیٰ حسب و نسب دے کر پھر مجھے اس سب عطا کے باوجود سکون سے محروم کر دیا کس لئے؟ کیا میں تجھے اتنی ناپسند تھی جبکہ بہت سے لوگ کیوں کجیوں کے باوجود تیرے کرم سے محروم نہیں، برائیوں میں پڑے ہونے کے باوجود تجھے پالیتے ہیں، میں مثبت راہ، مثبت طرز فکر کے باوجود میں زندگی کی ڈور میں پیچھے رہ گئی، ایسا میرے ساتھ کیوں ہوا؟ ان میں سے کسی کے ساتھ کیوں نہیں ہوا؟ کیا یہ سب لوگ تجھے مجھ سے زیادہ پیارے ہیں یہ سنی، افسی، شرابی مرد و عورتیں، برہمن، جسم، آلود خیالی اور گندی خواہشات سے بھرے گندے لوگ؟ مجھ سے زیادہ پیارے ہیں تجھے، میں جو سبھی کی قسم کے نشے کے قریب تک نہ گئی جس نے بھی کسی بوئے فریڈ کے ساتھ ڈیٹ نہیں ماری اور بھی اپنے جسمانی حسن کو غیر مردوں کی نگاہوں میں نہیں آنے دیا پھر بھی، پھر بھی تو نے میرے ساتھ برا کیا کیا کیا میں نے تجھے پانے کو کیا کچھ نہ کیا ہندوستان گئی مراکش کے طول و عرض میں بھگتی رہی، اسرائیل کے صحراؤں کی خاک چھان آئی کتنے لوگوں سے ملی کتنے لوگوں کو دیکھا کتنے مختلف مذاہب کو پرکھا، ان کی تعلیمات کو جاننا مگر کیا ملا مجھے، کیا ملا ازیتیں، سانچے، کرب، مشکلات کم نہ ہوئیں بلکہ بڑھتی گئیں اور میرے حوصلے کتنے ٹوٹے ہیں، کتنی بار بھری کیسے حادثوں سے گزری اور کیا ملا یہ پاگل پن یہ وحشت اور بد اعتمادی کا جنون میرا مقدر بن گیا۔“
”یہ ان سب کا مقدر کیوں نہیں بنایا یہ سب کیوں ہتے کھیلے بے فکرے خوش باش پھر رہے ہیں میری طرح یہ سب کیوں نہیں روتے، کیوں نہیں روتے، ان سب کو رونا چاہیے بالکل اسی طرح جیسے میں روتی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں ایک لخت اک عجیب سسکی کیفیت در آئی تھی اور سانس تیز ہونے کے ساتھ ساتھ دیرا مظراری لرزش میں آگئے۔

”I will kill you, I will kill you“ وہ یکا یک اٹھی اور اپنے سامنے بیٹھی اڈھیر کوری میم کا گلا دبانے لگی لیڈی ایلیون حیرت شکام میں اسے روکتی جیسے بے حواس ہو رہی تھی اور پوری بس میں شور برپا ہوا ڈرائیور نے بس کو روک لیا تھا۔

☆☆☆

دہاج کی خفگی کے باوجود وہ سنجیدگی سے جاب کا سوچ سوچ رہی تھی بلکہ کچھ دنوں سے اس نے یونیورسٹی جانا بھی شروع کر دیا تھا اسے معلوم تھا خالی بی اے کی ڈگری کوئی شاندار جاب نہ دے سکتی تھی پھر بھی ڈوسے کو تنک کا سہارا کے مصداق اس نے اخبارات میں خالی ویکلنسیوں کے لئے دیے گئے اشتہار دیکھنے شروع کر رکھے تھے، کیونکہ وہ خواہوں کی دنیا سے باہر نکل آئی تھی اسے معلوم تھا حالات پہلے جیسے ہونے میں وقت درکار تھا اور وقت کو ڈھیر سارا اعتماد، حوصلہ جو وہ دیتی اور یہ سب کرنے کے بعد بھی پتا نہ تھا صورتحال بہتر ہوتی یا حالات مزید خمدوش ہو جاتے مگر امی کو یوں دیکھنا بھی تکلیف دہ تھا پھر جو یہ اور بیچہ کی تعلیم، شہباز کا کیریئر ایوزنڈ تھے تو انہوں نے بھی اولاد کو تکلیف پہنچنے نہ دی اب وہ کیسے یہ سب برداشت کرنی، رو بہ زندگی کی ایسی ضرورت تھا جس سے وہ انکار نہ کر سکتی تھی خاص کر ان حالات میں جب امی کے لئے اچھے اور بھلے علاج کی ضرورت تھی نہ صرف علاج بلکہ اچھی اور متوازن خوراک کی بھی بھائی بہنوں کے تعلیمی اخراجات کے ساتھ خود اس کا ادھورامش رز اور وہ کسی صورت تعلیم سے منہ نہ موڑ سکتی تھی کہ ایو کا خواب تھا اپنی اس ہونہار اور ذہین بیٹی کو پروفیسر بنانا اور زندگی نے اس کے لئے کیا طے کر رکھا تھا یہ کوئی نہ جانتا تھا۔

وہ رہے اور جو یہ کوئی کا دھیان رکھنے کی خصوصی ہدایت کر کے تلاش رزق کی تلاش میں پہلی بار گھر سے نکلی تو دل کے اندر کہیں ہلکا سا دھڑکا بھی تھا، وہاں کی خانف نگاہیں اور تپا تپا لہجہ تصور میں ابھرا تھا پھر اس نے سر جھٹک کر خود کو جیسے ہر تاثر سے آزاد کرنا چاہا تھا۔

اس نے ٹیکسی کی تلاش میں نگاہیں سیاہ سڑک پہ دوڑائیں تو قریب ہی بائیک رکی اور وہاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر متوجہ کیا تھا۔

”اتنی لیٹ یونیورسٹی جا رہی ہو۔“ وہ یوں بولا جیسے ان کے درمیان خفگی کا کوئی لمحہ آیا ہی نہ ہو

اریہہ کو اس کی یہی عادت تو پسند تھی کہ وہ اس سے بہت زیادہ دیر تک نہ خود بخود ہوتا تھا نہ بخار پہنے دیتا تھا۔

”کیا بہت ناراض ہو۔“ اس کی خاموشی پہ وہاں نے بغور دیکھا تھا۔

”نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو، میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتی۔“

”تو پھر اتنی اجنبی اور گریز اں ہو کر کیوں کھڑی ہو جبکہ تم میرے کہے بنا فوراً بائیک پہ بیٹھ جا کر تھی ہو۔“ وہاں نے شکوہ کیا۔

”کیونکہ آج مجھے تمہارے والے راستے نہیں چلنا میرا راستہ الگ ہے۔“

”مطلب؟“ وہاں نے اچھٹے سے دیکھا۔

”مجھے یونیورسٹی نہیں ایک پرائیویٹ ایجنسی جانا ہے اور مجھے وہاں پہنچاتے تم آفس سے یقیناً لیٹ ہو جاؤ گے۔“

”پرائیویٹ ایجنسی مگر کس لئے؟“ وہاں صحیح معنوں میں چونک اٹھا۔

”جواب کے لئے۔“ وہ نظریں جھٹک کے بولی اور وہاں کی پیشانی پہ یکدم بل پڑ گئے۔

”میں نے تم سے کہا تھا اس کی ضرورت نہیں ہے لہذا یہ فضول خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔“ وہ ناگوار لہجہ میں بولا۔

”وہاں، مجھے میرے گھر کو اس کی ضرورت ہے میں نے پہلے بھی کہا تھا آخر تم کب تک اور کتنا احسان کرو گے ہم پہ، جلد یا بدیر یہ بیڑا ہی کواٹھانا ہے تو.....“

”شٹ اپ اریہہ جسٹ شٹ اپ۔“ وہ لہجہ بھر میں غصہ سے چلا اٹھا۔

”وہاں تم مجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ جتنی ہوئی۔

”میں سب سمجھ رہا ہوں، بچہ نہیں میں، تم بیٹھو سڑک پہ تماشا لگانے سے بہتر ہے ہم آرا سے کہیں بیٹھ کر اس موضوع پہ بات کر لیں۔“

”لیکن وہاں مجھے انڈر پوکے لئے جانا ہے۔“ وہ ہچکچائی۔

”جب میں کہہ چکا ہوں تم جا نہیں کر دو گی تو بس پھر نہیں کرو گی بیٹھو۔“ وہ حکم آمیز لہجہ میں سختی سے بولا تو اریہہ نہ چاہتے ہوئے بھی خانف سے تیور لئے بیٹھ گئی۔

اریہہ اور وہ پارک میں آنے تک بالکل خاموش رہے ایک قدرے تہا اور برسکون گوشے میں رکھے بیٹھ ہوئے وہاں نے اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا تھا اور قدرے مدھم مدھم میں پوچھا تھا۔

”کیا تمہیں اعتبار نہیں مجھ پر، کیا تم مجھ پہ یقین نہیں رکھتیں جو سمجھنے لگی ہو میں اپنی کمینٹ

دونگا، کیا تم سمجھتی ہو وہاں حسن تم سے دھوکہ کرے گا۔“ اس کی آنکھوں میں سمندر آرکا، وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی بس سر کو جھکا گئی وہاں حسن نے اس کے صبح چہرے کو دیکھتے ہوئے شانوں سے تھاما تھا کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا پھر اضطرابیت زدہ لہجہ میں بولا۔

”کیا تمہیں لگتا ہے، میں تمہیں تمہارے حصے کی خوشیاں نہیں دے سکوں گا۔“ فضا بوجھل ہوئی پکلوں پہ بھڑے اس کے آنسو بہت خاموشی سے رخساروں کو بھگونے لگے۔

”تم میرے لئے کیا سوچتی ہو، کیا سوچتی ہو کیا ہے تمہارے دل میں بولوار یہ میں سب سننا چاہتا ہوں، جو تم اپنے دل و دماغ میں لکھے بیٹھی ہو سب کہہ دو۔“

”وہاں تم سے الگ میں نے خود کو بھی سوچا نہیں میں تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں۔“ وہ اس کے شانے پہ سر رکھ کے سسکتے لگی اس کے بے تحاشا ٹوٹے آنسو وہاں کا شانہ بھگور رہے تھے، وہاں نے اس کا سر تھکا تھا۔

”ایسا ہے تو تم میری بات مانتی کیوں نہیں ہو، جب میں نے تمہارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے تو آخر دم تک نبھاؤں گا۔“

”مگر وہاں تمہاری زندگی میں صرف میں نہیں اور بھی لوگ ہیں ان کا بھی تم سے حق ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے میں خود سے باندھ کر تمہیں سب سے بے پروا کر دوں۔“ وہ سراٹھائے بولی تو وہاں دھیرے سے مسکرایا۔

”اپنے سے وابستہ ہر رشتے کی پرواہ ہے مجھے اور ہر رشتے سے بڑھ کر اپنی خوشی کی خوشی بھی وہ جودل سے وابستہ ہے اور دل کی منشاء تو تم ہو۔“ وہ بڑے دلکش انداز میں بولا، ڈھیر سا نمکین پانی اس کی آنکھوں میں پھر آن رکا تھا یہی محبتیں تو اسے حوصلہ دے تھیں۔

”اگر میری زندگی میں یہ شخص نہ ہوتا تو جانے ہم سب کا کیا بنتا کتنے درد بانٹے ہیں تم نے میرے وہاں حسن۔“ وہ اپنے سامنے بیٹھے خوبصورت شخص کو دیکھ رہی تھی۔

”وہاں تم بہت اچھے ہو، میں تمہیں کتنا بھرا بھلا کہہ جانی ہوں کتنی باتیں کتنے اشتعال آمیز الفاظ اور تم سب بھلا کر پہلے جیسے ہو جاتے ہو، وہاں تم اتنے اچھے کیوں ہو؟“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے بھرائی آواز میں بولی۔

”اوپنوں آنسو نہیں، بہت رو چکی ہو۔“ وہاں نے انگشت شہادت سے اس کے آنسو صاف کیئے۔

”کیوں کرتے ہو مجھ سے اتنی محبت، کیوں ہواتے اچھے جبکہ میں..... میں تو بہت بری ہوں بالکل بھی اچھی نہیں۔“

”تم اچھی ہو بہت اچھی، یہ جو محبت ہوتی ہے نا اسے اچھائی برائی سے کوئی غرض نہیں ہوتی یہ تو احساس ہے بس محسوس کرنے کا رشتہ روح سے روح کا ناٹھ اور روح، انسانی احتیاج و غرض سے ماورا ہوتی ہے اور رہا سوال اتنی محبت کا تو ریا یہ کوئی ناپ تول کے تھوڑا ہوتی ہے کہ ہم کم یا زیادہ کر لیں، یہ تو بڑا بے ساختہ سا جذبہ ہے جو خود بخود دلوں کی سرزمین پر اگتا ہے پھلتا پھولتا ہے اپنے آپ کھلتا ہے اور نوجہ کی نگاہ سے بھٹکا ہے۔“

”وہاں مجھے اتنی اہمیت نہ دو کہ زندگی کا سفر کبھی تنہا بھی کاٹنا پڑ گیا تو سب مشکل ہو جائے۔“

ماہنامہ (43) حنا

ماہنامہ (42) حنا

”تہا کیوں اریہ، میں نے جس تمنا کو اپنے دل میں بسایا ہے اسے تمہاری شدتوں نے ہی جینے کا حوصلہ بخشا ہے پھر محبت کرنے والوں کے دل میں تو بڑی گنجائش ہوتی ہے اور ان کا دل دوسرے لوگوں سے بہت بڑا ہوتا ہے جب بہت مشکل حالات میں تم نے مجھے نہیں چھوڑا تو میں تمہیں کیسے چھوڑ دوں گا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ زندگی میں ایسے موڑ بھی آتے ہیں جب ایک راہ کے آگے دوسری راہ دکھائی نہیں دیتی سارے راستے تم ہو جاتے ہیں اور جو راستہ نظر آتا ہے وہی زندگی کا آخری موڑ لگتا ہے۔“ وہ پوچھل آواز میں عجیب یاسیت سے بولی۔

”اریہ محبت اور کسی کی پر توجہ ہمت کا ساتھ ہونا تو اس بندگی کے آگے کے راستے بھی واضح نظر آنے لگتے ہیں، بات صرف ہمارے اندر دنی احساس کی ہے ہمارا ضمیر زندہ ہونا تو کچھ بھی کہیں بھی کم نہیں ہوتا۔“

”مگر وہاں یہ جو مشکلات ہوتی ہیں ناں یہ زندگی کے میدان میں خود روپوں کی طرح بوجھ جاتی ہیں اور مشکلات میں گھر انسان وہ کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو عام حالات میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا اور تمہیں میں نے بتایا تھا کہ ہمارے مسائل کلی توجہ کے متقاضی ہیں ان حالات میں جبکہ تم پر تین جوان بہنوں کا بوجھ ہے اور ان کے لئے اچھے رشتے ہی نہیں اچھا جہیز بھی تمہاری مجبوری ہے اپنے معاشی مسائل نپٹانے تم میرا کتنا ساتھ دے سکتے ہو، کب تک ہمارے اخراجات پورے کرو گے اور یوں تمہارا گھریلو بجٹ بھی متاثر ہو جائے گا، اس کے بعد تمہارے گھر والے تنگ آ جائیں گے، تو اس وقت کے آنے سے پہلے اگر میں کوئی وسیلہ رزق ڈھونڈ لوں تو برا کیا ہے، دیکھو ناں جابز پلیٹ میں رکھی تو ملتی نہیں مجھے بھی ٹھوڑی جلد جھپکنا پڑے گی، تم خود سوچو ایسے حالات کے تحت اگر میں اپنے گھر والوں کے لئے ایک اچھی زندگی کے لئے کوشش کر لوں تو کوشش میں حرج ہی کیا ہے؟“ خود یہ قابو پائی وہ بڑے نمبرے لہجے میں بولی تو وہاں پہلی بار خاموش سا رہ گیا، وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی اس کی خدشات بہت حد تک درست تھے۔

”اور دوسرا راستہ صرف ایک بچتا ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو بنا دیر کئے، لیکن ایسا کرنا یقیناً تمہارے لئے فی الحال مشکل ہے کیونکہ بقول تمہارے جوان بہنوں کی موجودگی میں تم شادی بالکل نہیں کر سکتے اس کا مطلب مجھے انتظار کرنا ہے سال دو سال یا جانے کتنا، اس مسلسل انتظار کی کیفیت میں گلے رنے سے کیا بہتر نہیں میں جاب ہی کر لوں۔“

گزشتہ ملاقات کی نسبت اس وقت وہ بڑے متوازن اور سنجیدہ لہجہ و الفاظ میں بات کر رہی تھی یہی وجہ تھی کہ وہاں بھی اشتعال میں آئے بنا اس کی باتیں سننے بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

”بہت دیر ہو چکی ہے چلو تمہیں گھر چھوڑ دوں اور تم ابھی چند دن یونیورسٹی جاؤ، رہا جاب والا معاملہ تو میں سوچ کر تمہیں جواب دوں گا اور تب تک تم کہیں انٹرویو نہیں دو گی۔“ وہ یکدم اٹھے ہوئے بولا۔

”اُس اوکے۔“ اریہ گھر اسانس کھینچتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وقت کے سمندر میں
زندگی کی ناؤ کو

کچھ اور ڈمگنا ہے
پر ہم کو لوٹ آنا ہے
تم سے کیا کہیں جاناں
دھواں دھواں سا آسمان
کٹے کٹے سے یاد باں
شوریدہ سر ہوا میں بھی
ڈھکی چھپی مسافتیں
مسافتوں کی دھند میں کم
ہزار ہا جزیروں میں
ہزار ہا جزیروں میں
ایک وہ جزیرہ ہے
جس کی وسعتوں میں کم
ہمیں واپس ملانی ہے
میرے چار سو بہت دور تک
بڑی کبر ہے جی ہوئی
اور مسدور ہیں راستے
پر ہم کو لوٹ آنا ہے
اس جزیرے کی طرف
جس پر تم کھڑے ہو
تم جو اک جزیرہ ہو
اور آخری جزیرہ ہو
محبت کے سمندر میں

☆☆☆

اس کا آج کا دن بہت مصروف گزرا تھا درگزر سے
سائیکس دیکھنا پھر اپنی بوتیک کا چکر بھی لگایا کچھ ضروری امور کی سرپرستی کی
خود کو ریلیکس کرنے کے لئے لاگ ڈرائیور پر نکل آئی۔
”صبا کو گئے کتنے دن ہو گئے وہ ہوئی تو کتنا خرا آگیا، اس کے پاس اس کے پاس اس کے پاس
موسم بہت خوشگوار اور ٹھنڈا تھا ایسے موسم میں اس کے پاس اس کے پاس اس کے پاس
کر سڑک سے کھڑے ہو کر بھٹے کھانے اور وہی بھٹے کے شوق میں اس کے پاس اس کے پاس اس کے پاس
”کیا ضروری ہے ہر وقت اپنے سوکالڈ مائیکروں پر غور کرنا؟“ اس نے سوچا اور کار ایک برگر پوائنٹ تک پہنچ گئی۔
محروم رکھیں۔“ اس نے سوچا اور کار ایک برگر پوائنٹ تک پہنچ گئی۔
آئی۔

”اے شمن دیکھو یہ وہی لڑکی نہیں ہے جو تمہارے گھر آگئی تھی۔“
”جائے جائے جائے۔“

غلوں کی خوشبو آئے اس جذبے کے ساتھ ملتے رہنا ہے۔“ سعید نے انہیں پر خیال نظر دیا سے دیکھا۔

”ڈیش گڈ ٹائیس ویری ٹائس، آپ سے واقعی اک ٹکلف اور اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔“

”تو دوستی پکی۔“ سعید نے ہاتھ بڑھایا جسے ان دونوں نے محبت سے تھام لیا۔

”اسی خوشی میں آج کا بل میری طرف سے۔“ سعید نے کہا۔

”جی نہیں بل ادا ہو چکا ہے کیونکہ اور اس کی ادائیگی بھائی نے کی ہے وہ ہمیں لینے آئے ہیں۔“

”خمن نے سمجھتے کاؤنٹر پہ بقیہ وصولیے دہاج کا بتایا تو سعید کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

”کیا سوچتے ہوں گے تمہارے بھائی، تم لوگوں نے یہ اچھا نہیں کیا؟“

”کم آن سعید، بھائی ایسا کچھ نہیں سوچتے ہمارے بھائی انسانیت کے تقاضوں اور اخلاقی اصولوں کو اہمیت دیتے ہیں روپے پیسے کو نہیں، بہت اچھے ہیں وہ۔“ خمن بہنوں والے مخصوص مان اور نعرے بولی۔

”واقعی، اگر دہاج حسن تم اتنے اچھے نہ ہوتے تو سعید خان تمہارے پیچھے تمہارے گھر تک کیوں آتی، تمہارے لئے اتنی زور در زور کیوں ہوتی۔“ وہ سوچتی ہوئی ان کے ہمراہ ہول کی بڑھیاں اترتی نیچے آئی۔

”السلام علیکم کیسے ہیں آپ؟“ وہ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے دہاج کو دیکھ کر مسکرائی۔

”علیکم السلام اللہ کا کرم ہے، آپ یہاں اس جگہ آپ کا لیول تو پی سی اور آداری کا ہے یہ جگہ تو ہم جیسے غریبوں کے لئے ہے۔“

”یہ شخص طنز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔“ سعید نے گہرا سانس لیا۔

”دہاج صاحب یہ لیول بھی ہمارے اپنے بنائے ہوئے ہیں ورنہ اللہ کے ہاں سے تو ہم سب صرف انسان بن کر آئے تھے اور جو بن کر آئے تھے وہی مقام نہ رکھ سکے تو لیولز اور درجے کیا چیز ہیں اصل چیز تو اندر کا ستھراؤ ہے دل وسیع ہونا تو غربی امیری میں اور امیری غربی میں سما جاتی ہے۔“

”یقیناً اور کبھی جو اپنے اصول آگے آجائیں پھر سب الٹ ہو جاتا ہے۔“ وہ بڑے سکون سے مسکراتے ہوئے بولا تھا، جبکہ ہمارا خمن آپس میں خیر بھری نگاہوں کا تبادلہ کر کے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”دہاج صاحب اصول زندگی کے لئے اچھے ہوتے ہیں اور بعض اوقات لازمی بھی۔“

”اور اتنے لازم کہ کسی کی زندگی، کسی کا مستقبل داؤ پہ لگ جائے تب بھی نہ ٹوٹیں۔“

”لگتا ہے آفس میں کا برڈن بہت ہوتا ہے۔“ سعید نے بھی ہلکا سا طنز کیا تو وہ کھلے دل سے مسکرایا۔

”اچھا لگا یہ انداز بھی اور ایک بات کہوں گے برائے نامیں اپنے اصولوں پہ کبھی کبھی کپور و مائز کر لینا چاہیے، یہ صرف ہمارے اپنے لئے ہی نہیں ہم سے وابستہ بہت سے لوگوں کے لئے بہتر ہوتا ہے اوکے اللہ حافظ۔“

”کون، کب آئی تھی ہمارے۔“ خمن کو فوری طور پر یاد نہ آیا۔

”ارے وہ این جی ادا والی، جو ہمارے آگے کو ملا نرمت دلوانے کا وعدہ کر رہی تھی۔“

”اوہ، ہاں، واقعی یہ تو وہی ہیں اور سوٹ دیکھو کیسا زبردست پہنا ہوا ہے، خود بھی بہت پیاری ہے۔“

”ایکسی کیوزی میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔“ سعید ان کے قریب آ چکی تھی۔

”Most welcome۔“ وہ دونوں خوشدلی سے مسکرائیں۔

”آپ کو میں نے پہلے دیکھا ہوا ہے۔“ سعید نے کچھ مسکراتے چہرے سے

اقاعدہ ہمیں مل چکی ہیں بلکہ ہمارے گھر آئی تھیں ایک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور دہاج حسن اس کے

ت آپ کی بہت ڈینٹ مدر، ہماری

مگر گھر انے دیکھے ہیں

”ہیں۔“

کی ہم

مگر آ

ہو انداز

سے جس میں اچھا

وہ اچھلے ہی لمبے ہمارے دشمن کو آنے کا اشارہ کرتا پلٹا جبکہ سعید اسی آخری سیزم پہ کھڑی اس کے الفاظ کے پس پردہ منہم کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

آ جاؤ.....

کہ ابھی ہے وقت مٹھی میں

تمہاری خوشبو میں زندہ ہیں

پھولوں کے بدن میں

مگر ایسا نہ ہو کہ پھول جل جائیں

تمہارا لمس مر جائے

گلابوں کے بدن میں رنگ لگ جائے

کہیں ایسا نہ ہو جاناں

تمہارے اور میرے درمیان بھی دیوار آگ آئے

ابھی تو آنکھوں کی مشعل میں رستہ دکھائی دیتا ہے

ابھی تو آئینہ چہرہ دکھاتا ہے

☆☆☆

دوبئی کا موسم بہت اچھا خشک اور ٹھنڈا، آسمان پر ہر وقت سفید اور سیاہ بادلوں کے ہولے دکھائی دیتے، صاف ستھرا گردوغبار سے پاک ماحول کھلی اور نکھری سڑکیں جن کے گر بلند و بالا درخت تھے تو کہیں خوبصورت کانچ جن کے پھولوں بھرے لان چھوٹی چھوٹی باؤنڈری والے سے دکھائی دیتے، ابھی امارت و شوکت کا اظہار کرتی ہوئی بڑی بڑی عمارتیں جو آسمان کو چھوتی محسوس ہوتیں۔

صا اس سارے ماحول و دلکشی کو پورے جوش و خروش سے محسوس کرتی مگر پورے طریقے سے انجوائے کر رہی تھی، ساتھ ہی اپنی اگلی دوست سعید کو شہر بدس کرتے ہوئے ڈھیر دلی ایس ایس ایس بھیج رہی تھی۔

صفتی نمائش ہفتہ بھر کے لئے تھی اور ان کا دوبئی میں آج آخری دن تھا کل واپسی کی فلائٹ سے وہ واپس پاکستان آ رہی تھیں، اس نے ونڈ و شاپنگ کے دوران بے شمار چھوٹے مگر نادر آئٹمز لئے کرشل کے قیمتی ڈیکوریشن پیسے، گولڈ اور قیمتی سٹونز کی جیولری، اچھے اسٹائلش ڈریسز، جدید شو، مختلف اور منفرد سٹائلز کے شوئرز، بیگز وغیرہ اس کا بس نہ چلتا تھا وہ پورے دوبئی کی مارکیٹیں اور شاپنگ پلازے اٹھا کر پاکستان لے آئی، نزہت اور شائستہ بیگم اس کی دیوانگی پہ ہنس رہی تھیں۔

”صفتی کیوں پاگل ہوئی جا رہی ہو ایسی ہزاروں چیزیں پہلے تمہارے پاس موجود ہیں، کیا کرو گی اتنا کچھ لے جا کر۔“ نزہت نے ٹوکا۔

”اوہ سویت مہاشاپنگ میرے کرپز ہے اور آپ کو پتا ہے شوق کا موتی مول نہیں، مجھے جو چیز بھی

اچھی لگے میں ضرور لیتی ہوں قیمت خرابہ کوئی بھی ہو۔“

”پھر بھی بیٹا ایک جیسی کتنی چیز لیتی رہو گی۔“ شائستہ نے بھی کہا۔

”سمجھا کریں ناں، آخر میری دنیا میں واحد دوست بھی ہے سعید خان اسے چھوڑ کے میں

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے، لہذا جو صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حسرتی سے غور و خوض کریں۔

اپنے لیے چیزیں نہیں لے سکتی کیونکہ اس کے بغیر میری زندگی کسٹیم نہیں ہو سکتی۔“

”اور جو تمہاری زندگی کا مالک بن کر آئے گا وہ۔“ شائستہ نے چھیڑا۔

”ذہیر آئی جب وہ موصوف آئیں گے تب دیکھا جائے گا، ابھی تو جو ہے اسی کو سوچنا ہے

لیکن ایک بات ہے آئی اگر میری زندگی میں وہ شخص آیا اور جب بھی آیا تو اس کے ساتھ اپنا ہنسی

مومن نہیں مناؤں گی۔“ ذہیر بے مزے سے بولی۔

”بس کرو ذرا شرم جھک نہیں۔“ نزہت نے پیار سے اس کے سر پہ چت لگائی۔

”اوہ سویت ماما آپ نے سنا نہیں جس نے کی شرم اس کے پھوٹے گرم، تو خواہ شرم شرم

کرتے اپنے گرم کیوں کھونے کر لوں۔“

”گرم بی بی اب میری بھی سن لو بہت ہو گئی شاپنگ، دوبئی کے کسی اچھے سے مسلم ہوٹل پہ

چلیں اور کچھ لاہوری نوڈلز کی یاد تازہ کر لیں۔“

”کیوں نہیں نئی اور پوچھ پوچھ دیے بھی سیانوں کے کہنا ہے پہلے پیٹ پوچھا پھر کام دو جا۔“

”یہ آج محاورے کچھ زیادہ ہیں یاد آ رہے۔“ شائستہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

”جب کوئی یاد آنے والی چیز زندگی میں آئی نہ رہی ہو تو محاورے ہی یاد آتے ہیں۔“ اس نے

سرد آہ بھری اور شائستہ بیگم بے اختیار ہنس دیں۔

”نانی گرل، چلو اب ہمارے بھوپلین کو اتنا نہ آزماؤ اور ہمارے بھو کے پیٹوں کا خیال کر لو۔“

”اور اس کے بعد وہ شو ضرور دیکھنا ہے جو سلمان خان کترینا کیف اور اکتے کار شاہ رخ خان

دیگر انڈین سپر اسٹارز کر رہے ہیں۔“ صبا نے یاد کر دیا۔

”بالکل اور یہ دوبئی میں ہمارا آخری ایونٹ ہے اور میں تو اسے پاکستانی سنگر علی ظفر کی وجہ سے

دیکھ رہی ہوں نہ کہ انڈین سٹارز کی وجہ سے۔“ نزہت نے کہا۔

”پاکستان ہمارے لئے فخر اور الگ پہچان کا اعزاز ہے بھلا ہم اپنے پیارے وطن اور

پیارے لوگوں کو کیسے نہ امیری شٹ کریں بی کا وہ پاکستان سے ہیں اور پاکستان اس اللہ کی رحمت

سے۔“ شائستہ نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

”جی صبا کے موہاں ہے بار بار میگزینوں نے تو اس نے اپنا سیل دیکھا شہر یاری کی طرف سے میسج

تھے جو کچھ لکھا تھا وہ پڑھتے ہی صبا کے چہرے پر یکدم پریشانی کے تاثرات چھلک اٹھے اس نے نچلا

لب کاٹتے ہوئے تاج کو پھر سے ری وائنڈ کیا تھا۔

(جاری ہے)

راہ الفت میں

صبا جاوید

”ہاں تو پھر چوہدری رفیم حاشر کے چہرے پر تاریک سائے منڈلا رہے تھے پیشانی پر نظر لکیروں سے سلوٹ زدہ تھی۔

سب کچھ پر ہیچ اور الجھا ہوا تھا، آخر قدرت انہیں وہیں لے آئی تھی جس سے وہ گزشتہ انیس برس سے بھاگ رہے تھے، عجیب گنجشک تھی، سب کچھ طے ہونے کے باوجود کوئی نئی تحریر رقم ہونے جا رہی تھی جسے کندہ ہونے سے وہ روک نہیں پا رہے تھے، وہ زندگی میں بھی چوہدری کریم حاشر کے خلاف نہیں گئے تھے، وہ خود میں حکم عدولی کی جرات نہیں پاتے تھے، مگر یہاں سوال ان کی سنی اولاد کی خوشیوں کا تھا وہ خود کو ان کے مخالف کھڑا ہونے پر مجبور پاتے تھے، چوہدری رفیم حاشر کا مطالبہ رد کرنا ناگزیر ہو گیا تھا، وہ لوگ

ہے تم نے انابت بی بی کے بارے میں؟ معاملہ بااوجہ طوالت پکڑتا جا رہا ہے اگر تم سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تو ہمیں درمیان میں آنے دو ہم خود ان لوگوں سے نمٹ لیں گے۔“ چوہدری کریم حاشر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے پورے مطراق و ممکنات سے اپنے مخصوص گونج دار لہجے میں مخاطب تھے، چائے سرد کرنی ارم کے ہاتھوں میں واضح لرزش پیدا ہوئی تھی، انہوں نے کن اکھیوں سے چوہدری کریم حاشر کی طرف دیکھا جو ان کے شوہر سے چودہ سال بڑے تھے ان کی بے حد سفید رنگت، سفید اور نہیں کہیں سے چھانکتے کالے داڑھی کے بالوں کے پیچھے چھپی تھی، مگر اس چہرے کی اصلیت سے وہ خوب آشنائی رکھتی تھیں، چوہدری

کمل ناول



انابت کا طلاق دینے پر راضی نہیں، انہوں نے لگ بھگ ایک سال سے دہرایا جانے والا جملہ من وعین دہرایا، چوہدری کریم حاشر کے تاثرات میں سختی پیدا ہوئی تھی ان کے الفاظ نے تندہی اختیار کی تھی۔

”اتنے سے تھے جب سے تمہیں سنبھال رہے ہیں ہم۔“ انہوں نے ہاتھوں سے اشارہ کیا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے رقیم سائیں ہمیں تمہارے ٹال منول سمجھ نہیں آتے، گزشتہ ایک برس سے یہی بہانہ کانوں میں انڈیل کر ہم صبر کر رہے ہیں مگر ہمیں تمہارے طور ٹھیک نہیں لگتے اگر انابت بی بی کی شادی ہو چکی ہے تو ہم اسے نہیں مانتے، ہم ہمارے اصولوں اور ماحول کو خوب سمجھتے ہو رقیم سائیں۔۔۔۔۔!“

”فیصلے کی تاخیر کی وجہ ارم بی بی اور انابت بی بی ہیں بہتر ہے تم ان دونوں کو بھی سمجھا دو، جو چیز ہماری ہے ہم اسے پاتال میں بھی نہیں چھوڑتے۔“ ان کا انداز تحکمانہ تھا، گویا وہ کوئی ٹک دکھانا نہیں چاہتے تھے

”بابا سائیں! آپ کیوں نہیں سمجھتے، انابت کا اشعر اور منیب کا کوئی جوڑ ہے، یہ اس معصوم بچے کے ساتھ بھی نا انصافی ہے اور انابت کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔“

”بابا سائیں! چھوڑیں ان کھوٹے رسوں اور جھوٹی شان کو، مت بھیٹ چڑھائیں ان معصوم بچوں کو اپنے جاگزیں اور پراگندہ اصولوں کی، آپ یہ بات کیوں نہیں مانتے؟“ انہوں نے دبے دبے الفاظ میں ان کے فیصلے کی نفی کی، مگر لہجے میں نفی اور سرکشی کا عنصر قدرے نمایاں تھا، ان کے فیصلے کی تردید کر کے چوہدری رقیم حاشر نے گویا ان کے عتاب کو آواز دی۔

”بہت خوب رقیم سائیں! بہت خوب،

اب تم ہمیں سچ اور غم میں فرق سمجھاؤ گے، تم ہم سے باز پرس کرو گے، سب کچھ تمہارے اختیار میں ہوتا تو اب تک تم ان روایات کو جو ہماری

پہچان ہیں، اپنی جدت پسندی کر آگ میں جھونک چکے ہوتے، ہمارے اصولوں کو اپنی ترقی کی مٹی تلے دین کر چکے ہوتے، تم اب بی بی کی خاطر ہماری شان کو بے بنیاد قرار دے رہے ہو ہماری روایات کی پاسداری کرنے کی بجائے ان کو کھوٹا اور بے معنی ثابت کرنے پر تلے ہو، ہم نے صدیوں سے اپنے خاندان کی بیٹیوں کو اسی طرز پر بیاہا ہے، تمہاری بیٹی کے ساتھ کچھ کیا نہیں ہونے جارہا، ہماری رسم کو ہماری ضد مت بناؤ ورنہ بہت پیچھے تلو گے۔“ چوہدری کریم حاشر نے چوہدری رقیم حاشر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ان کی آنکھوں میں ابلیغ غصہ گویا کوئی تھرپا کرنا چاہتا تھا، ان کی آواز میں گویوں کی بوچھاڑ تھی تو انداز میں اہل وحشی فیصلے کی سی مضبوطی۔

”بابا سائیں! اس کی شادی ہو چکی ہے۔“ انہوں نے بے بسی سے کہا، آواز اور نگاہیں دونوں ہی پست ہو چلی تھیں، گویا احتجاج بھر پور نہیں تھا۔ اصرار نہیں ہوا تھا لیکن انکار میں بھی شدت نہیں تھی، عجب بے بسی کا دور تھا، وہ اپنی بیٹی کے لئے کچھ نہیں کر پارہے تھے، ان کے اندر جوار پھانا جل رہا تھا وہ تمام اصول، روایات، رسوم ہمیں نہیں کر دینا چاہتے تھے مگر سامنے کھڑا شخص ان سے چودہ سال بڑا ہونے کے ساتھ ان کا بھائی بھی تھا، وہ ان کے ساتھ محاذ آرائی میں ملن تھے۔

”ہم نہیں مانتے اس شادی کو، کیا لکھ کر دیں تمہیں؟ بہت غلط فائدہ اٹھایا ہے تم نے ہماری آزادی کا، تم نے اپنی پسند سے شادی کی، ہم نے منع نہیں کیا کہ یہ ریشموں کا شیوہ ہے، تم نے اپنی بیٹی کی پرورش جدید دستوروں پر کی ہم نے کڑوا

گھونٹ پیا، کیونکہ ہم جانتے تھے کہ آخر کار انابت بی بی ہماری امانت ہے اور اسے ہمیں آنا ہے، مگر تم نے بغاوت کی ہے رقیم سائیں! بیٹیاں ہمارے ہاں خاندان سے باہر دینے کا رواج نہیں تم نے ہمارے اعتماد کو سینے میں بغاوت کا چھرا گھونپا ہے، تم ہمارے بھائی نہ ہوتے تو ایسی سزا دیتے کہ دھری کا سینہ پھٹ جاتا، اگلی بار جب ہم آئیں تو معاملہ صاف ہونا چاہیے ورنہ طلاق یافتہ انابت نہ سہی یہ وہ تو ہم لے ہی جائیں گے۔“ ان کے الفاظ دل دہلا دینے کی حد تک بے رحم اور سفاک تھے ان کی آنکھوں میں جنوں خیز اشتعال تیر رہا تھا، ان کی باتیں نیزے کی الی کی طرح ارم اور چوہدری رقیم حاشر کے وجود میں پیوست ہوئی تھیں، ان کے الفاظ تھے یا زہر میں پھینکی ہوئی خوںچکاں حکایتیں، عقب میں کھڑی انابت رقیم کا دل سینے میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

”لیکن بابا۔۔۔۔۔!“

”باس۔۔۔۔۔ رقیم سائیں ہمارے قہر کو آواز مت دو۔“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں کچھ بھی کہنے سے باز رکھا، ان کے قدموں کی آواز سنگسار پتھر کی طرح ارم انابت اور چوہدری رقیم حاشر کے دلوں پر پڑی رہی تھی، تپتے ہوئے خود خال لئے وہ قدرے بھڑکے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے، مگر تمام جملہ افراد پر جامد سا نا طاری ہوا تھا جیسے ہر احساس سے رشتہ ٹوٹا تھا، انابت رقیم بہت بے بسی سے واپس اپنے کمرے میں گئی تھی، دل میں اٹھتے خوف کے سائے اس کی رنگت میں زردی گھولنے لگے تھے، خون جیسے بوند بوند پھوڑ لیا گیا تھا، اس ساحر کی ڈیڈ بالی سی تصویر اس کی نم آلود نگاہوں میں اترتی تھی۔

☆☆☆

ارم، ملازمہ کے ساتھ مل کر افطاری کے بعد ڈائینگ ٹیبل پر کھانا چن رہی تھیں، چوہدری رقیم

حاشر عشاء کی نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد روانہ ہو چکے تھے، انابت رقیم اور ارم انہی کا انتظار کر رہی تھیں، ہر سو مہیب سنائے کا راج تھا، محض برتنوں کی کھٹ پیٹ سے ماحول میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو جاتا، مختصر سے افراد پر مشتمل اپنا گھر دیکھ کر اسے بھرپور ”ابصار ہاؤس“ یاد آنے لگا تھا، کوئی بھولی بھٹکی یاد دامن بھگونے کو بے تاب تھی، انابت رقیم کو ایسے اندر عجیب سی ویرانیاں اترتی محسوس ہو رہی تھیں، بہت اکتا کر وہ لاؤنج سے اٹھ کر گلاس ڈورڈر کیلانی لان میں چلی آئی، ہر شے پر تاریکی کی راجدھانی تھیں، اسے خاموش اور پراسرار تاریکی بہت بھلی لگ رہی تھی، انابت رقیم نے لان میں کچھی چیمیز میں سے ایک اپنے لئے منتخب کی اور اس پر ٹنگ گئی، اس نے ٹانگیں سپار کر سرکری کی پشت پر ٹنگ لیا، نظریں آسمان کے وسیع سینے میں محو سفر تیسرے دن کے چاند پر تھیں جو نجانے کیسی سرگوشیوں میں مگن تھا کمان کی شکل اختیار کیے تیسرے دن کا چاند بھی بادلوں کے ٹوٹتے پھرتے سیاہ ٹکڑوں کی اوٹ میں ہو جاتا اور کبھی ان کو پیچھے چھوڑ کر چپکے سے فلک پر آشکار ہو جاتا۔

دو ننھے ننھے قطرے آنکھوں سے راستہ بھٹک کر عارض بھگونے لگے تھے، اس نے درد کی کوئی لہر سینے میں انتہی محسوس کی تھی، کوئی بھولا بسرا شخص اپنی بادلوں کے ساون میں اسے بھگونے لگا تھا، جس کی پہلی بار دیکھتے ہی دل کی دھڑکن نے رفتار پکڑی تھی، اس کے ساتھ کی تنہا کی تھی، اس نے بہت کرب سے آنکھیں میچ لیں، جیسے کچھ یاد کرنا نہ چاہتی ہو، مگر بادلوں پر اختیار کب ممکن ہے، اندھیرے سے لپکتے ساکت درخت اسے اپنی زندگی کی طرح منغوار اداس لگ رہے تھے، عجیب زندگی کی بھی اس کی، خوشیاں تھیں تو وہ بھی بے حساب، اب غم تھے تو وہ بھی لامحدود۔

”انا!“

جانے وہ کتنی دیر ان تکلیف دہ خیالوں اور
تصوراتی دنیا میں کھولی رہتی جب ارم کی آواز نے
اسے حال کے تکلیف دہ باب میں لانا، اس نے
پٹ سے آنکھیں کھولیں اور آنکھیں رگڑنی سیدی
ہو کر بیٹھ گئی۔

”اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو بیٹا؟“
انہوں نے بہت محبت سے اس کے بال سیٹھے۔

”کچھ نہیں، بس پاپا کا ویٹ کر رہی تھی۔“
اس نے خود کو مشکف ہونے سے بچایا، مگر اولاد
اپنی ماں سے چھپانا بھی چاہے تو بھی کچھ نہیں چھپا
سکتی، اس کا فرار ارم خود سمجھ چکی تھیں۔

”کیوں خود کو اتنی تکلیف دے رہی ہو انا؟“
چھوڑ دو فضول کی ضد، مان جاؤ بیٹا، اپنے لئے نا
سہی اپنے والدین کے لئے۔ ارم اس کے
سامنے والی چیئر کھینچ کر بیٹھ گئیں اور ایک بار
پھر اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”میں کوئی ضد نہیں کر رہی ماما، مجھے جو ٹھیک
لگ رہا ہے میں وہی کر رہی ہوں۔“ اس نے
بہت کھورپن سے کہا اور رخ پھیر گئی۔

”میں شہوار بھائی سے بات کرتی ہوں وہ
تمہیں خود آ کر لے جائیں گے۔“ انہوں نے
ایک بار پھر کوشش کی۔

”میری ذات، میرا وجود ایک ناسور ہے
جسے ”ابصار ہاؤس“ کے مینیوں کو سوپ کر آپ
اپنے گٹے سے اتار کر ان کے گٹے میں ڈال دینا
چاہی ہیں، تو اس عذاب کو جڑ سے ختم کیوں نہیں
کرتیں ماما، اسے وہاں پہنچائیں جو اس کی جگہ
ہے، تاکہ سب آسودہ اور مطمئن رہ سکیں۔“ اس
نے بے رحمی سے خود پر تبصرہ کیا، ارم نے بہت
بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔

”خدا تو تمہیں ورثے میں ملی ہے ایک تمہارا
باپ ہے جو اپنی منوانے کے در پے ہے،
دوسرے تمہارے تایا ہیں جو اپنے موقف سے
ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تیری تم ہو اپنے

دودھیال کی کاربن کاپی، مجال ہے جو میری بات
اس لڑکی کی عقل میں سمائے۔“ ان کی آواز میں
کوئی رنج تھا، اس سارے مسئلے سے شاید وہ محنتیں
لگتی تھیں۔

”مما کیا برائی ہے غیب میں، آپ شہوار
انکل سے کہیں وہ طلاق کے پیچڑ بنوائیں، میں
غیب سے شادی کروں گی۔“ اس نے گویا خود پر
قیامت ڈھائی، یہ الفاظ اس کے اندر سے ہر
احساس کو بالکھڑا کر لے گئے تھے۔

”ہوش میں تو ہوتم، میں اور تمہارے بابا ایسا
کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے، تم نے یہ کیسے مان
لیا ہے کہ تمہاری ہر ضد کی طرح ہم یہ فضول ضد
بھی مان میں گے۔“ ارم کے بے طرح غصہ آیا
تھا۔

”حد کرتی ہو انا، ایک ماں سے کہہ رہی ہو
کہ اپنی بیٹی کو دوزخ کی آگ میں ڈھکیں دو اور
کس غیب کی بات کر رہی ہو تم وہ جو.....“ دکھ
سے جملہ وہ مکمل نہیں کر پائی تھیں بہت تاسف
سے ارم نے انابت رقیم کے پھر لیے چہرے کو
دیکھا۔

”ماں نہیں ہو نا تم، اس لئے ماں کی اذیت
نہیں سمجھ سکتی، کیسے بھیج دو تمہیں ان بھیڑیوں کے
درمیان، پھولوں سے بھی زیادہ نزاکت سے بالا
ہے تمہیں، کس طرح اس کال کوٹھڑی کے سپرد کر
دون، جہاں سانس لینے کے لئے بھی اجازت
درکار ہے، عمر بھر کی اذیت اپنی بیٹی کے نصیب
میں اپنے ہاتھوں سے تحریر کروں، یہ مجھ سے نہیں
ہو گا۔“ ارم کی آواز رندہ لگی تھی، انابت رقیم خالی
خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی، اس کے
سیاٹ چہرے کو دیکھ کر ارم کا دل جیسے کسی نے چل
کر رکھ دیا، اپنی قسمت کے دھاگوں میں ابھی یہ
انیس سالہ لڑکی انہیں یکدم ہی بہت بڑی اور مجھ
دار لگنے لگی تھی۔

”تو پھر دعا مانگیں ماما، انابت مر جائے،

انابت کو اس پل پل کی موت سے دائمی نجات مل
جائے۔“ آنکھوں پر گلے پہرے ایک دم ٹوٹے
تھے، آنسوؤں نے بڑی تیزی سے چلہ بنائی تھی،
شدت گریہ سے وہ سرخ پڑنے لگی تھی، ارم نے
ٹڑپ کر اسے بازوؤں میں بھرا تھا، انابت رقیم
اور شدت سے بلکنے لگی تھی۔

☆☆☆

چوہدری رقیم حاشر اور چوہدری کریم حاشر
دونوں بھائی تھے اور جاگیر دارانہ طرز زندگی سے
تعلق رکھتے تھے، خاندانی روایات کی پاسداری
اور ہر دور میں ان کو زندہ جاوید رکھنا ان کا اولین
فریضہ تھا، یہی وجہ تھی کہ ٹیکنالوجی اور سائنس کی
ترقی کے باوجود ان کی حویلی میں وہی قدیم رسم و
رواج بڑی تیزی سے ترویج پا رہے تھے، بیٹوں کو
برادری سے باہر بیاہنے کا رواج ان میں نہ تھا،
ان کے نزدیک عورت کا وجود محض ایک خدمت
گزار داسی کا سا تھا، آزادی اور حقوق نسواں جیسے
الفاظ ان کی زندگی سے حذف تھے، جس کی
بنیادی وجہ کردوڑوں کی جائیداد تھی، بیٹیاں باہر
بیاہنے سے انہیں اس جائیداد سے ہاتھ دھونے
پڑتے جو انہیں کسی طور قبول نہ تھا لہذا بیٹیاں
خاندان میں رکھی جاتیں، چاہے ان کا کوئی جوڑ ہو
یا نہ ہو، چاہے وہ بیماری عمر کنواری ہی رہ جائیں۔

چوہدری رقیم حاشر، چوہدری کریم حاشر
سے چودہ برس چھوٹے تھے، چھوٹی عمر میں ہی
ان کی ذمہ داری چوہدری کریم حاشر کے کندھوں
پر آ گئی، خود چوہدری کریم حاشر کو کم عمر میں ہی
معاملات سنبھالنے پڑے چنانچہ وہ تعلیم جاری نہ
رکھ سکے، تاہم انہوں نے چوہدری رقیم حاشر کو
اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے امریکہ بھیج دیا، وہاں
انہوں نے ارم سے شادی کر لی، چوہدری کریم
حاشر بہت سچ پاپا ہوئے، مگر پھر خاموشی اختیار کر
گئے، لیکن انابت رقیم کی پیدائش پر انہیں خدشات
گھیرنے لگے، چنانچہ انہوں نے حکم جاری کیا کہ

واپسی کے لئے رخت سفر باندھیں لیکن چوہدری
رقیم حاشر نے سہولت سے انکار کر دیا، تاہم انہوں
نے انابت رقیم کی نسبت بروقت طے کر دی اور
چوہدری رقیم حاشر نے انہیں تحفظ کا بھرپور یقین
دلایا۔

جس کا مقصد محض وقتی طور پر ان کے
مطالبے کو دبانا تھا مگر جب انابت بلوغت کی عمر کو
پہنچ چکی تھی تو چوہدری کریم حاشر کا اصرار باڑھنے
لگا تھا ان کا کوئی بہانہ کارگر ثابت نہ ہوا اور انہیں
پاکستان واپس آنا ہی پڑا، چوہدری کریم حاشر،
انابت رقیم کی شادی غیب حاشر سے کرنا چاہتے
تھے جو انہیں کاہنہ تھا اور ایسی ہی سفاک اور بے
حس سوچ کا حامل تھا، جوان کا بڑا بیٹا تھا اور لگ
بھگ چالیس برس کا تھا، جبکہ اس کے متبادل کے
طور پر عاشق کو پیش کیا گیا۔

جو محض چھ برس کا تھا اور ان کی دوسری بیوی
کا اکلوتا بیٹا تھا، اپنے ماحول سے فرار پا کر وہ سوچ
رہے تھے کہ انہوں نے سچ پاپا ہے وہ سب کچھ
بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں، مگر وہ تو اب بھی
چوہدری کریم حاشر کی گرفت میں تھے قدیم، جان
لیوا، روایات کی بیڑیوں میں جکڑے تھے، چنانچہ
امریکہ سے واپسی پر انہوں نے انابت رقیم کو
”ابصار ہاؤس“ بھیج دیا، شہوار ابصار اور رقیم
حاشر بہترین دوست تھے پاکستان میں ان کے
تعلقات بہت سے لوگوں سے تھے مگر شہوار ابصار
کا شمار ان کے بہترین اور پر اعتماد دوستوں میں
ہوتا تھا، چنانچہ انابت رقیم کو وہاں بھیج کر وہ خود
ارم کے ساتھ گاؤں روانہ ہو گئے جہاں چوہدری
کریم ان کے منتظر تھے تاکہ وہ متوقع صورتحال
سنبھال سکیں۔

☆☆☆

”کنزئی پلینز مار ایک کپ کافی ملے گی۔“
دھب سے صوفے پر گررتے ہوئے اس نے کہا،
کنزئی جو کتابوں میں منہ دیئے بیٹھی تھی ایک لمحہ

کے لئے برآمد کیا اور پھر سے اپنے کام میں مشغول ہوئی، انابت ریم کا پارہ یکدم ہائی ہوا تھا۔

”جلو میرے ساتھ کچن میں، میں خود بنا لوں گی، لیکن تم میرے پاس کھڑی رہنا، پلیر ان بورنگ بس کو بند کرو، ترس گئی ہوں تمہاری آواز سننے کے لئے۔“ اس کے سامنے بکھری کتابوں کو زبردستی سمیٹتے ہوئے اس نے گویا التجاء کی، کنزئی کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے چل رہی ہوں لیکن پلیر اب رونے مت بیٹھ جانا۔“ اس نے سنجیدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے گویا مذاق اڑایا۔

”اڑالو مذاق میرا، کیا بارش سے تم لوگ نکلتے ہو شام تک واپس آتے ہو، اکیلے بڑے بڑے میں بور ہو جاتی ہوں، واپس آتی ہو تو بھی گنگناہٹوں میں منہ دے کر بیٹھ جاتی ہو، کیا کرو گی اتنا بڑھ کر، کرنا وہی چولہا برتن ہی ہے۔“ اب وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

”کیا یار! انا کام کر رہی ہے، یا اللہ ہمارے کچن کی خیر کرنا۔“ میرب نے بڑے غلط وقت پر انٹری دی تھی۔

”تم کب آئے؟ اور کچن کی خیر کیوں مانگ رہے ہو، میں تمہیں بدسلوکی لگتی ہوں، پھو ہڑ کہنے کی کوشش کر رہے ہو مجھے؟“ تیکھے تیور لئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی، پہلے ہی اس کا موڈ آف تھا۔

”کیا مطلب کہ میں کہنے کی کوشش کر رہا ہوں، تم ہوا نا۔“ میرب نے گویا جلتی پرتیل کا کام کیا۔

”جب کر جاؤ، بہت پٹو کے میرے ہاتھوں۔“ اس نے دھمکی دی، وہ محاذ آرائی میں مصروف ہو چکی تھی، کنزئی مسکراتے ہوئے خود کا بنائے لگی تھی۔

”انا الزانی چھوڑو اور میرے لئے بھی ایک

کپ کافی بنا دو۔“ اسے تپا کر وہ صلح کی کوششیں کر رہا تھا۔

”زہر نہ ملا دوں کافی میں۔“ وہ جل کر بولی۔

”زہر نہ بھی ملاؤ، تمہارے ہاتھ سے بنی کافی کا ذائقہ ہی زہر جیسا ہوگا، میں تو پیٹے ہی اللہ میاں کو پیارا ہو جاؤں گا۔“

یہ درست تھا کہ انابت ریم امور خانہ داری کے معاملات میں انارڈی تھی مگر وہ قبول نہیں کرتی تھی اپنی اس کمزوری کو، لیکن میرب اسے ہر دم چھیڑتا رہتا تھا اور ہر روز اس کی جنگ معمول کا حصہ تھی۔

اب بھی اس کے متوقع رد عمل سے پہلے ہی وہ کچن سے نکل چکا تھا جبکہ انابت ریم لکڑی کا ہلکا سا چٹخا اٹھا کر اس کے پیچھے لگی تھی۔

”آج تو میں تمہیں سیدھا کر دوں گی، بھڑ جاؤ ذرا۔“ اس نے با آواز بلند جنگ کا اعلان کیا، پورے لاؤنج میں وہ انابت ریم کے چکر لگوار ہا تھا، اچانک وہ دروازے سے باہر نکلا تھا انابت ریم بھی اس کے پیچھے نکلنے لگی تھی تب ہی شاید وہ اس کی راہ میں حائل ہوا تھا، وہ بری طرح کمرانی تھی، اس کا سر شاید دروازے میں لگا تھا، ایک لمحے کے لئے تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا، دروازہ خاصا مضبوط تھا، انابت ریم کو تو کم از کم ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔

”یہ کھرے کوئی پبلک پلس نہیں جہاں آپ اندھا دھند واک کر رہی ہیں۔“ کرخت مردانہ آواز اس کی سماعت سے ہوئی ہوئی شعور تک پہنچی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے، نور آہی سامنے کا منظر صاف ہوا تھا، جسے وہ اب تک دروازہ سمجھ رہی تھی وہ ایک مضبوط اور بھرپور جاذبیت کے حامل نوجوان کا سینہ تھا، جس نے اس کے دماغ کی جویں تک ہلا دیں تھیں، اس نے ہڑا بڑا کر اس شخصیت کے عقب میں دیکھا، جہاں میرب

موڈب سا کھڑا تھا، اس کے دیکھنے پر نور آدانتوں کی نمائش کرنا اس نے ضروری سمجھا۔

”وہ..... میں.....“ اس سے کچھ بن نہ پڑا تو زبان دانتوں تلے دبا کر خاموش ہو گئی۔

ایٹش گئے تھری چپس میں لمبوس خطرناک حد تک برکشش اور جاذب نظر نوجوان نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی، اس کی نگاہوں میں واضح ناپسندیدگی کے تاثرات ابھرے تھے۔

”اب اینٹو بن کر راستے میں کیوں کھڑی ہیں، ہمیں یہاں سے مجھے اندر آنے دیں۔“ اسے وہیں براجمان دیکھ کر اس نے بیزاری سے کہا تو انابت ریم کو احساس ہوا کہ وہ ابھی تک دہلیز پر کھڑی ہے بلیک جینز کے ساتھ سیلیولس گھٹنوں سے ذرا اوپر تک آتی شرٹ زیب تن کیے دوپٹے سے بے نیاز یہ لڑکی اسے ایک آنکھ نہیں مانتی تھی، وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹی تھی، وہ بہت تیزی سے اس کے پہلو سے نکل گیا، اس کے بھاری بوٹوں کی دھمک میں اسے اپنا دل اگلتا محسوس ہو رہا تھا۔

”سوری انا! مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اذن بھائی آ جا میں گے اور آتے ہی تمہاری ان سے ملاقات اس چوٹیشن میں ہو گی۔“ میرب خفت زدہ سا اس کے کان کے پاس سرگوشی کر رہا تھا۔

”اٹس اوکے۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

”انا..... کافی بن گئی ہے لے لو آ کر۔“

کنزئی نے اسے آواز دی۔

”نہیں اب میرا موڈ نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، کنزئی نے حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

”کیوں چھیڑتے ہو اسے، دیکھا برا مان گئی۔“ کنزئی نے میرب کی کھچائی کی۔

”وہ میری وجہ سے نہیں، اذن بھائی کی وجہ سے ڈسٹرب ہے ایسا۔“ میرب نے اسے تمام

صورت حال سے آگاہ کیا۔

”آگئے اذن بھائی، اچھا میں اسے دیکھتی ہوں، تم کھنک کو اکیزی سے لے آؤ۔“ کنزئی نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا نکل گیا۔

☆☆☆

انابت ریم کی پاکستان واپسی کو چودہری کریم حاشر سے فی الوقت مخفی رکھا گیا تھا، وہ گزشتہ دو ہفتوں سے ابصار ہاؤس میں مقیم تھی یہ ابصار ہاؤس کے مکینوں کا بے لوث پیار اور چاہت ہی تھی اور کچھ اس کی طبیعت کی بولڈ نیس جو وہ بہت جلدان کے ساتھ ایڈجسٹ کر گئی تھی۔

شہوار ابصار اور ریحان ابصار دونوں نے مل کر ابصار ہاؤس کا آستانہ سجایا تھا۔

ریحان ابصار کی ازدواجی زندگی صبا کے سنگ گزر رہی تھی ریحان اور صبا کا آئین کنزئی، کھنک اور میرب نے مہم کیا تھا جبکہ شہوار ابصار اور در ابصار کے خاندان کو نوپان اور اذن ابصار نے مکمل کیا۔

میرب اور کھنک دونوں ایف ایس سی کے فائنل ایئر میں تھے، کنزئی اپلائیڈ فزکس میں ماسٹرز کر رہی تھی اور فائنل ایئر میں تھی، اذن ابصار اور نوپان ابصار جرنلزم کے بعد اپنا ذاتی رسالہ نکال رہے تھے۔

اذن ابصار گزشتہ دو ہفتوں سے کراچی گئے ہوئے تھے کیونکہ این کا میگزین بین تھا، اس کی اشاعت پر پابندی تھی لہذا وہ انابت ریم سے نہیں مل سکا تھا تاہم گھر لوٹتے ہوئے سب سے پہلے اس کا سامنا انابت ریم سے ہو چکا تھا، وجہ اس کا مغربیت کے لبادہ میں پینا وجود اور حد سے زیادہ بولڈ نیس اذن ابصار چار سال لندن جیسے آزاد خیال شہر میں گزار کر آیا تھا، جدت کے نام پر عربانیت کے کھلے عام مناظر کی نمائش نے اس کی آنکھوں کو جلا نا شروع کر دیا تھا، اسے مغربی طرز زندگی سے کچھ پر خاش نہ تھی لیکن مشرقی

لڑکیوں پر خوب غصہ آتا تھا چو فیشن کے نام پر
دھڑا دھڑ مغربی انداز کو اپنا رہی تھیں۔
انابت ریم کے طور طریقے بھی اسے کچھ
خاص پسند نہیں آئے تھے لیکن وہ خاموشی اختیار کر
گیا تو شخص اس وجہ سے کہ وہ چند دن تک ان کے
ہاں مہمان تھی۔

☆☆☆

”کہاں جا رہے ہو تم؟“ ساڑھے گیارہ
بجے کے قریب نویان ابصار کو پورچ کی طرف
بڑھتا دیکھ کر اذن ابصار نے ٹیکھے انداز میں
دریافت کیا۔

”وہ یار!..... انا نے کچھ کھایا نہیں تو، اصل
میں اس کا موڈ نہیں۔“ نویان نے وضاحت دی۔
”تو؟“ اس کی پٹائی شکن آلود ہوئی۔
”تو اسے آسکریم کھانی ہے وہی لینے جا رہا
ہوں۔“ نویان، اذن ابصار سے ڈیڑھ برس بڑا
تھا، لیکن دونوں بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ
بہترین دوست بھی تھے، نویان اور اذن نے ایک
دوسرے کے مابین بھی عمروں کا فرق آنے نہیں
دیا تھا۔

”عجیب لڑکی ہے یار! اتنی رات کو آسکریم
کی کیا تک ہتی ہے، آسکریم سے پیٹ بھرتا ہے
کیا؟“ اس نے جل کر تبصرہ کیا آسکریم بیک ملازم
کے ہاتھ اندر بھجوا دیا اور گیٹ کے طرف قدم بڑھا
دیئے، جس کا مطلب تھا کہ وہ بھی نویان کے
ساتھ جا رہا ہے۔

”یار مہمان ہے، مہمان نوازی تو کرنی ہی
پڑے گی۔“ نویان نے ہلکا پھلکا انداز اپنایا، مقصد
اس کا موڈ بحال کرنا تھا۔

”اور وہ اسودہ رضا کے کیس کا کیا بنا۔“
نویان نے ایک سیاسی نام لیا، جس پر ادارہ لکھنے
اور رپورٹ کرنے کے بعد ان کے میگزین کی
اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔
”کچھ نہیں یار! میں نے بھی اسے بھیجی ملی بنا

کر ہی دم لیا۔“ اب کے وہ مسکرایا، گویا وہ اپنی فتح
پر خوش تھا۔

”یار! ان لوگوں سے پکا لینا ٹھیک نہیں اور
ہم تو فیملی والے ہیں، ذرا کانٹ چھانٹ کر لکھا
کر قلم کو قلم کی طرح استعمال کیا کر جھجھر کی طرح
نہیں کہ جو پڑھے بس کٹ کر گر جائے۔“ نویان
نے اسے ہمیشہ کی طرح خبردار کرنا چاہا۔

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو..... تم بتاؤ تمہارا
انابت کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے
اچانک موضوع بدلا۔

”کیا مطلب؟“ ٹیکھے چتون تھے۔
”رائے لے رہا ہوں تمہاری۔“ نویان نے
مطلع کیا۔
”ٹھیک ہے، مطلب؟ کچھ سمجھ نہیں آیا؟“
وہ جانے پر مصر ہوا۔

”یار ایک مہمان کی حد تک ٹھیک ہے، لیکن
اگر تم پرستی پوچھ رہے ہو تو میری رائے ایسی
لڑکیوں کے بارے میں جانتے ہو۔“ اس کا
اشارہ انابت ریم کے آزاد پرور ماحول کی طرف
تھا۔

”اچھا تو امریکہ میں تربیت پانے والی لڑکی
سے تم عیاں پنپنے کی امید رکھو تو؟ فضول سوچ
ہے۔“ اس کی بات کا مطلب جان کر نویان نے
طنز کیا۔

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“
”تو پھر کیا کہا ہے؟“

”تمہیں کیا تکلف ہے انابت کے بارے
میں میری رائے لے لے گی۔“ وہ اچھا خاصا چڑ گیا۔
”تبی بے باگ ہے وہ، تمہیں بھی سب پتہ
ہے۔“ اذن ابصار کہنا نہیں چاہتا تھا مگر نویان نے
کہنوا کر ہی دم لیا۔

”یار میں نے پہلے بھی کہا ہے امریکہ کی
پیداوار ہے تو اتنی بے باکی کی امید تو ہمیں رکھنی
ہی چاہیے۔“ اس نے انابت ریم کا دفاع کرنا

چاہا، جو اس کے نفاست پسند بھائی کو قطعاً پسند
نہیں آتی تھی۔

”تم اس کا دفاع کیوں کر رہے ہو؟“ اس
نے ٹیکھے پن سے پوچھا۔
”یار وہ بہت فرینڈلی ہے۔“ نویان پھر گویا
ہوا۔

”تم اس کے بارے میں مجھ سے بحث
مت کرو، تم سب لوگ تو پتہ نہیں کیوں اس
چھانک بھری لڑکی کے جادو تلے کم ہو، ہر چیز
سے بے خبر ہو گئے ہو، چند دن تک اس لڑکی کو
برداشت کرنا پڑے گا اس کے بعد تو اسے یہاں
سے جانا ہے۔“ اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔

”اور آگے ساری عمر کے لئے بے پڑ گئی
تو؟“ مطلوبہ آسکریم کی پیکنگ کا آرڈر دیتے
ہوئے اس نے شرارت سے کہا۔

”کنزلی کو بتاؤں گا کہ تمہارے ارادے
نیک نہیں ہیں۔“ اذن ابصار نے اس کی بات
میں اسے ہی پکڑا۔

”ارے نا کر یار، میں نکاح شدہ بچہ ہوں
اور دیے بھی وہ مجھے ٹھنک کی طرح ہی پیاری لگتی
ہے۔“ اس نے فوراً اپنا قانونی رشتہ واضح کیا،
کنزلی اور نویان کا دو سال قبل نکاح ہو چکا تھا اور
کنزلی کے فاسل سمسٹر کے بعد باقاعدہ رخصتی اور
ولیمہ کی تقریب ہونا قرار پائی تھی۔

”اور میں تمہیں شتر بے مہار لگتا ہوں، حیا
کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں
چاہتا۔“ اس نے اپنی منگیتر کا نام لیا، کوئی باضابطہ
اعلان تو نہیں تھا لیکن دونوں گھرانے کچھ ایسا ہی
ارادہ رکھتے تھے جیسا ان کی خالہ زاد کزن تھی، لہذا
اپنی اپنی جگہ وہ ماسٹرمیک اپ کر چکے تھے۔

”یہ تو کوئی توجیح نہیں پھر بھی اگر ایسا کچھ ہو
جاتا ہے تو؟“ اذن ابصار نے غصے سے مٹھیاں
پھینچیں اس کا مذاق اسے قدرے ناگوار گزرا
تھا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھنک ہے، تم کیوں فضول
میں ”انابت نامہ“ کھول کر بیٹھ گئے ہو؟ تم مجھے
اس سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی سے منسوب کر رہے
ہو، جس میں میسرز نام کی کوئی چیز نہیں جو ابھی
بچپن سے ہی باہر نہیں آئی، وہ میری طبیعت سے
ایک فیصد بھی نہیں ملتی، اسے دیکھتے ہی میرا خون
رگوں میں ابلنے لگتا ہے، ایک لمحہ کے لئے میں
اسے لمبی خوشی برداشت نہیں کر سکتا کجا کہ ساری
عمر.....“

”جس کے ساتھ اس کی شادی ہوگی وہ یقیناً
کوئی انارٹل انسان ہی ہوگا۔“ اس کی مذاق میں
کبھی کبھی بات اذن ابصار کو تلوؤں لگی اور سر پر
بجھی۔

”اچھا چھوڑ یار، جسٹ ریلیکس، میں تو
محض مذاق کر رہا تھا اور دیے بھی حالات سنھلتے
ہی ریم انگل اسے واپس بلا لیں گے۔“ نویان
ابصار نے اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہا، وہ
آسکریم پیار سے باہر نکل رہے تھے۔

”اچھا رحمان آفندی سے انٹرویو کی ڈیٹ
فاسل ہوئی۔“ اس نے اس کی توجہ آسکریم کے امور
کی جانب مبذول کر دوائی۔

”ہاں یار، ڈیٹ اور ٹائم دونوں مل گئے
ہیں۔“ انابت ریم کو اپنے ذہن سے جھٹکتے ہوئے
اس نے نویان ابصار کو نصیلاً آگاہ کرتے ہوئے
کہا۔

☆☆☆

”مجھے لاگ ڈرائیو پر جانا ہے۔“
وہ اذن ابصار کے سامنے کھڑی یوں
فرمائش کر رہی تھیں جسے دونوں برسوں کے رفیق
ہوں، ڈھیلا ڈھالا کاشن کا ٹراؤزر رادر اسکن ٹائٹ
کی شرٹ پہنے وہ اسے زہر سے بھی زیادہ بری لگی
تھی، گزشتہ ڈھائی ماہ میں یہ دن کی پہلی روبرو
گفتگو تھی، اس کے عقب میں ردا بھی کھڑی
تھیں۔

”یہ کون سا وقت ہے اس فضول فرمائش کا۔“ اذن البصار نے اس کی توجہ وقت کے بہتے دھارے کی طرف مبذول کروائی، بارہ بج رہے تھے وہ صرف ردا کی وجہ سے محل سے کام لے رہا تھا وگرنہ وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا، مگر اس کے چہرے کے بھڑکیلے تاثرات انابت رقیم کو سب کچھ باور کروا رہے تھے۔

”انا بیٹا آپ اپنے روم میں چلو، میں اس سے بات کرنی ہوں۔“ اس کے موڈ کے زیر اثر ردا نے جلدی سے کہہ کر اسے رخصت کیا، تو وہ اثبات میں سر ہلانی واپس ہو گئی۔

”یہ کوئی وقت نہیں ایسے چونچلوں کا، میں اسے کہیں نہیں لے جا رہا۔“ اس کے نکتے ہی اس نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے تضحیک کر کہا۔

”لے جاؤ اذن! اس نے تمہارے پایا سے پریشانی ہے۔“ ردا نے حدوت آمیز لہجے میں کہا تو اذن البصار کو تو جیسے پتنگے لگ گئے۔

سوچا۔

”سیدھے منہ بات تک نہیں کی کبھی تم نے، باقی بچے بھی اگیزامز میں مصروف ہیں، سارا دن ہم اسے بہلاتے رہتے ہیں، خوب ہی کمپنی دے رہو تم بہن بھائی مل کر اسے۔“ انہیں اذن کے ساتھ ساتھ بانی سب پر بھی غصہ آیا تھا۔

”انہیں سے مہمان لگتی ہے وہ آپ کو؟“ اس نے چڑ کر کہا۔

”مجھے مت سمجھاؤ تم، لے جا رہے ہو یا نہیں، نوان بھی آؤٹ آف سٹی ہے ورنہ اسے ہی کہہ دیتی۔“ اس کی تیوریوں کو نظر انداز کرتی وہ درستی سے بولیں۔

”لے جا رہا ہوں اس کو، لیکن اسے کہہ دیں کوئی ڈھنگ کا لباس پہن لے، ایسے اوٹ پٹانگ حلیے میں، اس میں کہیں نہیں لے کر جاؤں گا۔“ اس نے صاف لفظوں میں اپنا مطالبہ بتایا اور پیچ کرنے کے لئے واش روم میں گھس گیا۔

ردا نے فوراً اس کی بات مان لی، غنیمت تھا کہ وہ مان گیا تھا، کچھ ہی دیر بدوہ کف موڑتا ہوا پورچ تک آیا تھا جہاں انابت رقیم پہلے سے ہی موجود تھی، جینز کے ساتھ لاگ شرٹ پہنے، بڑا سا دوپٹہ اوڑھے وہ کافی حد تک معقول لگ رہی تھی، دوپٹہ آدھا کندھے پر جھول رہا تھا اور آدھا زمین کی زینت بنا ہوا تھا، اذن البصار کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نجانے کیوں اس کی دھڑکن کی رفتار بڑھ گئی تھی، اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتی وہ بظاہر بہت پر اعتماد نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سیدھے منہ بات تک نہیں کی کبھی تم نے، باقی بچے بھی اگیزامز میں مصروف ہیں، سارا دن ہم اسے بہلاتے رہتے ہیں، خوب ہی کمپنی دے رہو تم بہن بھائی مل کر اسے۔“ انہیں اذن کے ساتھ ساتھ بانی سب پر بھی غصہ آیا تھا۔

”انہیں سے مہمان لگتی ہے وہ آپ کو؟“ اس نے چڑ کر کہا۔

”مجھے مت سمجھاؤ تم، لے جا رہے ہو یا نہیں، نوان بھی آؤٹ آف سٹی ہے ورنہ اسے ہی کہہ دیتی۔“ اس کی تیوریوں کو نظر انداز کرتی وہ درستی سے بولیں۔

”لے جا رہا ہوں اس کو، لیکن اسے کہہ دیں کوئی ڈھنگ کا لباس پہن لے، ایسے اوٹ پٹانگ حلیے میں، اس میں کہیں نہیں لے کر جاؤں گا۔“ اس نے صاف لفظوں میں اپنا مطالبہ بتایا اور پیچ کرنے کے لئے واش روم میں گھس گیا۔

ردا نے فوراً اس کی بات مان لی، غنیمت تھا کہ وہ مان گیا تھا، کچھ ہی دیر بدوہ کف موڑتا ہوا پورچ تک آیا تھا جہاں انابت رقیم پہلے سے ہی موجود تھی، جینز کے ساتھ لاگ شرٹ پہنے، بڑا سا دوپٹہ اوڑھے وہ کافی حد تک معقول لگ رہی تھی، دوپٹہ آدھا کندھے پر جھول رہا تھا اور آدھا زمین کی زینت بنا ہوا تھا، اذن البصار کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نجانے کیوں اس کی دھڑکن کی رفتار بڑھ گئی تھی، اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتی وہ بظاہر بہت پر اعتماد نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”بہت بری بات ہے، مہمانوں کی مہمان نوازی خندہ پیشانی سے کرتی چاہیے۔“ اس نے لگا تھا اس کے چہرے سے ہنسا کر شرارتی انداز میں کہا۔

”اب تم مجھے ضابطے اور طور طریقے سیکھاؤ گی۔“ وہ جل کر بولا۔

”اتنی رات کو اس فضول حرکت کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ اذن البصار کا اشارہ لاگ ڈرائیو پر آنے کی طرف تھا، لہجے میں ہلکی سی پیش بہت لہایاں تھی۔

”جس ویسے ہی نیند نہیں آرہی تھی اور ویسے ہی میرا دل کر رہا تھا ہار کھونٹے کو۔“ اس نے بہت سادگی سے کہا، بڑی بڑی شفاف شہید رنگ ہلکی آنکھیں اذن البصار کے چہرے پر جمی تھیں۔

”آپ مجھے بددعا دے رہے ہیں؟“ اس نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا، اذن البصار نے بہت غور سے پہلو میں بیٹھی لڑکی کو دیکھا، وہ بے حد سفید لڑکی مسکرا رہی تھی اس کے گلابی ہونٹ بڑے دلکش انداز میں پھیلے تھے اور مسکراتے ہوئے اس رخسار پر گہرا ہوتا پھنور اسے کوئی بری بنا رہا تھا، سوڈیم لائٹ میں اس کی گوری رنگت اس مدہم روشنی کو شکست دے رہی تھی، اذن البصار کے غصے پر یکدم ہی جیسے اوس بڑی تھی، اس نے سختی سے لب بچ کر خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

وہ کافی دیر تک اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا تھا لیکن اس کی مکمل خاموشی سے اسے بالآخر رخ موڑ کر اسے دیکھنا ہی پڑا، وہ سر جھکائے بے آواز رو رہی تھی۔

اذن البصار کو کچھ نہیں آیا کہ اس نے انابت رقیم سے ایسی کیا سخت بات کہہ دی جو وہ یوں رو رہی تھی، اذن البصار نے گاڑی کی اسپید آہستہ کی اور قدرے کنارے پر جا کر بریک لگا دی۔

بریک لگتے ہی وہ گاڑی سے باہر نکل گئی، اس کے آنسوؤں میں روانی آئی تھی، اذن البصار بھی کوفت زدہ سا اس کے پیچھے آتا تھا۔

”اگر تمہیں فاسٹ ڈرائیونگ سے ڈر لگتا ہے تو تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا۔“ اذن البصار یہی قیاس کر پایا تھا کہ شاید تیز رفتار گاڑی دوڑانے کی وجہ سے خوف زدہ ہے۔

”نہیں مجھے فاسٹ ڈرائیونگ سے ڈر نہیں لگتا۔“ اس کی غلط فہمی دور کرنا اس نے بھی ضروری سمجھا تھا، اس کی آواز اس روئے کی وجہ سے ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

”تو پھر۔“ اذن البصار، سارے معاملے سے اکتانے لگا تھا۔

”وہ..... مجھے..... مام اور ڈیڈ یاد آرہے ہیں۔“ انابت رقیم نے ہچکچاتے ہوئے اسے بتایا، اذن البصار کی آنکھیں حیرت سے پھلی تھیں۔

”وہ میں گھر میں روتی تو اٹھ، آنٹی کنزنی وغیرہ پریشان ہو جاتے، اس وجہ سے میں نے.....“ اس کے غصے کے پیش نظر اس نے فوراً وضاحت دی اور اذن البصار کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا تھا کہ ابھی وہ کتنی بچی ہے۔

”اور اب یوں میں پریشان نہ ہوتا؟“ اذن البصار نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”نہیں آپ پریشان نہیں ہوئے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”تو پھر کیا ہوتا؟“ اذن البصار نے بڑے اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھے، اس کے جوابات کا کافی دلچسپی کے حامل تھے۔

”آپ غصہ کرتے، جیسے اب کر رہے ہیں۔“ اس نے صاف گوئی کی حد کر دی، بہت بیزاری اور کوفت کے باوجود اس کا موڈ خوشگوار ہونے لگا تھا۔

”ویسے تم بچے میں منہ چھپا کر بھی تو رو سکتی تھیں ایسی مظلومیت کے دور میں اکثر لڑکیاں بچے کو ہی سیراب کرتی ہیں۔“ ڈیش بورڈ سے نشوونکال کر اسے تھماتے ہوئے اذن البصار نے قیمتی مشورے سے نوازا۔

”نہیں مجھے بچے میں رونائیں آتا۔“ ناک رگڑتے ہوئے اس نے کہا۔

”اچھا اب چلیں یا کوئی کوٹہ باقی ہے رونے کا؟“

”چلیں میں تو بس.....“ وہ جھل سی ہو گئی، واپسی کا پورا راستہ وہ خاموش رہے تھے مگر اذن البصار اب پہلے کی طرح سلگ نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

تین بجے خود بخود اس کی آنکھ کھل گئی تھی، کمرے کی لائٹ آن تھی وہ ایک ہی جست میں اٹھ کر بیٹھ گئی، دو تین چھینٹے چہرے پر مارنے کے بعد وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی، کنزنی اسے لابی میں مل گئی، اس نے چاروں طرف نماز

کے اسٹائل میں دوپٹہ لپیٹا ہوا تھا۔

”تم اٹھ کھیں، میں تمہیں ہی بلانے جا رہی تھی۔“ اس دیکھتے ہی اس نے خیر مقدمی مسکراہٹ سے نوازا۔

”ہاں ہار، میں تو ایک ایک منٹ گن گن کر سحری کے ٹائم کا انتظار کرتی ہوں، اتنے سارے لوگ، نوک جھونک اور مسکراہٹیں دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پوری سچائی سے اعتراف کیا۔

رمضان المبارک کا مقدس مہینہ شروع ہو چکا تھا، اسے صبح منوں میں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس گھر میں برکتوں کا نزول شروع ہو چکا ہے، اسے اس گھر کے ہر فرد میں عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی نجانے کیوں اسے البصار پاؤس اور اس کے مکینوں سے بہت انسیت ہو چکی تھی۔

”کیوں کہ تم خود بہت اچھی ہو، اس لئے تمہیں ہم بھی اچھے لگتے ہیں۔“ کنزنی نے اسے کسی چھوٹے بچے کی طرح پچکارا، تو وہ ہلکھلائی۔

”تم بچن میں چلو میں اذن بھائی کو اٹھانے کی کوشش کرتی ہوں۔“ اس نے انابت ریم سے کہا، اس نے محسوس کیا تھا کہ اذن البصار سحری کے بغیر ہی روزہ رکھنے کا عادی تھا، آج چوتھا روزہ تھا اور گزشتہ تین روز میں ایک بار بھی اس نے اذن البصار کو سحری کے لئے آتے نہیں دیکھا تھا۔

”جیسے تم اٹھاؤ گی ویسے تو کھنک بھی نہیں اٹھے گی، اتنی آہستہ تو آواز ہے تمہاری اور اذن البصار کیا خاک اٹھیں گے۔“ اس نے خفیف سا طنز کیا۔

”تو کیا کروں ڈھول بجاؤں کانوں کے پاس۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”آج میں مسٹر اذن کو اٹھاؤں گی اور دیکھنا زندگی بھر یاد رکھیں گے۔“ اس نے ارادہ باندھا۔

”کیا کریں گی آپ محترمہ؟“ اذن البصار کے کمرے کے قریب جا کر وہ روک گئیں تھیں۔

”تم بس دیکھتی جاؤ۔“ اس نے آنکھ دبا کر مٹی خیزی سے کہا۔

”نتیجہ کی ذمہ دار تم خود ہو گی، تمہیں نہیں پتہ، اذن بھائی بہت غصے والے ہیں۔“ اس نے انابت ریم کو مطلع کیا۔

”ڈونٹ وری، بس یا آج میں تمہیں بتاتی ہوں کہ پانی محض فرنج کی زینت بنانے کے لئے نہیں ہوتا بوقت ضرورت اسے استعمال میں بھی لایا جانا چاہیے۔“ وہ ٹھنڈے پانی کا جگ بھر لائی تھی۔

”تم کیا کرنے لگی ہو انا؟“ کنزنی جسے اب تک مذاق سمجھ رہی تھی اب سچ سچ خوف زدہ ہو گئی۔

”میں آپ کے اذن بھائی کو سحری خیزی کی عادت ڈلوانے لگی ہوں۔“ انابت ریم نے بہت معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”انا پلزز۔“

”یا رتم جاؤ نا، جو ہو گا میرے ساتھ ہو گا، ویسے تم پریشان مت ہو، انشا اللہ دس منٹ میں اذن البصار بچن میں ہوں گے۔“ اس کا ارادہ جیسے مصمم تھا۔

کنزنی کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے وہ اذن البصار کے کمرے میں دے پاؤں داخل ہو گئی، سر تا پیر کھل تانے، اسے سی فل کیے وہ مزے سے محو استراحت تھا، وہ جی کھڑا کر کے آتو گئی مگر دل کانپ رہا تھا چند لمحوں کے بعد دم سادھے کھڑی رہی، اس کے ہاتھوں میں پکیا ہٹ پیدا ہوئی تھی مگر پھر اس نے تمام جھجک پس پشت ڈال کر تیزی سے مکمل کھینچا اور ٹھنڈے پانی کا پورا جگ اس کے چہرے پر انڈیل دیا۔

اذن البصار ہڑبڑا کر اٹھا تھا، اس پر جیسے کسی نے سوتے ہوئے بارش کر دی تھی اس کی حسیات کی تیزی سے بیدار ہوئی تھیں مگر اس کے اٹھنے سے قبل ہی انابت ریم کمرے کی دہلیز پار کر چکی

تھی، اسے اس غیر معمولی حرکت پر جی بھر کر غصہ آیا تھا، ایک سرد نگاہ اپنے بچکے بستر اور چلیے پر ڈالتا وہ سلگتا ہوا دشاں روم میں گھس گیا کس اب سونے کا کوئی فائدہ نہ تھا، کچھ دیر بعد اسے بچن میں داخل ہوتے دیکھ کر تمام جملہ افراد حیران رہ گئے تھے، گزشتہ کئی برس سے اس کی یہی عادت تھی وہ بغیر سحری کیسے روزہ کی نیت باندھ لیتا، انابت ریم نے بہت فالتحانہ نگاہوں سے کنزنی کی طرف دیکھا، اس نے اپنے قول کے مطابق کر دکھایا تھا، اذن البصار واقعی دس منٹ میں پہنچا تھا۔

”اذن کیا لو گے بیٹا؟“ ردا نے ڈانگ پیچ پر براجمان ہوتے دیکھ کر خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”کچھ نہیں ماما، بس آپ کو تو پتہ ہے اتنی علی اصح مجھ سے کچھ نہیں کھایا جاتا۔“ اس نے اپنی عادت بیان کی۔

”اودہ میں تو لگا ہمارے بیٹے کی عادت بدل گئی ہے تو برخوردار آج آپ بیدار کیسے ہو گئے؟“ براٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے شہوار البصار نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”وہ..... بس بابا..... سب جاگ رہے تھے تو میں بھی اٹھ گیا۔“ اس نے اصل بات بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

انابت ریم نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا، اب وہ اسکن آرام دہ شلوار سوٹ میں بلبوس تھا، کف کہنیوں تک مڑے ہوئے تھے، بھرے بال اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ انہیں سنوارنے کی کوشش نہیں کی گئی، محض انگلیاں چلا کر کام چلایا گیا ہے، کھڑے کھڑے سے مخروہ نقوش کچھ اور دلچسپ لگ رہے تھے اور چہرے پر چھائی سنجیدگی اس کو مزید باوقار ثابت کر رہی تھی، انابت ریم نے ایک ہارٹ بیٹ بے ساختہ مس کی۔

”چلو اب اٹھ ہی گئے ہو تو ایک گلاس دودھ

ہی پی لو۔“ صبا نے پیار سے کہا۔

”یہ کون تھا؟“ عاشری نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا، وہ تمام جملہ افراد کا جائزہ لے رہا تھا، شہوار ابصار اور ریحان ابصار سحر کی بعد بچن سے نکل چکے تھے، میرب اور کھنک کو صابر دوستی مزید کھیلنے پر آمادہ کر رہی تھیں، کنزنی برتن سمیٹ رہی تھی، اس نے گہری نگاہوں سے انابت رقیم کا جائزہ لیا، اس کی نگاہوں کی پیش اور توجہ محسوس کر کے وہ بے ساختہ مضطرب ہوئی تھی، جب پکڑنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ ہوئی تھی جو اذن ابصار کی عقابانی نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی، اسے اپنے مشاہدے کا جواب مل چکا تھا، وہ اپنے گھر والوں کے طور طریقوں سے بخوبی واقف تھا، کھنک، میرب یا کنزنی میں سے کوئی یہ حرکت نہیں کر سکتا تھا، یہ یقیناً انابت رقیم کی شرارت تھی جس پر مہر اس کے خوب زدہ انداز نے ثبت کی تھی، انابت رقیم کا سانس سینے میں ہی انگ گیا تھا، وہ دودھ کا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا اور دل ہی دل میں اس کی کلاس لینے کا ارادہ باندھتا وہ بچن کی دلہیز پار گیا، اس کے نکلنے ہی انابت رقیم کی رکی سانسیں بحال ہوئی تھیں۔

☆☆☆

اذن ابصار بہت تیزی سے لاؤنج میں داخل ہوا، اسے ردانے کسی ضروری کام کے سلسلے میں بلوایا تھا، مگر اندر کے منظر نے اسے ایک بل کے لئے شدید خفت کا شکار کر دیا تھا۔ انابت رقیم ایک لڑکی کی گود میں سر رکھ کر لیٹی تھی، دو لڑکیاں فلور کشن پر بیٹھی چپس سے بھرپور انصاف کرنے میں مصروف تھیں، جبکہ ایک صوفے پر آدھی ترچھی لیٹی تھی، اذن ابصار جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے میزھیاں پھلانگتا اوپر چلا گیا۔ بلیک ٹوئیں میں ملبوس اذن ابصار ان پر قاتلانہ وار کرتے ہوئے جا چکا تھا۔

نے فوراً بچ اگلا۔

”یہ کوئی بڑی بات نہیں انا، یہ سب لڑکیوں کو امپریس کرنے کے لڑکوں کے فارمولے ہیں۔“ رزل نے شان بے نیازی سے کہا۔ ”اکڑ دکھا کر پہلے خود کو لا پرواہ شو کرتے ہیں، بعد میں دم چھلانے لگتے ہوئے ہوتے ہیں۔“ رزل نے اپنی ماہر اندرائے پیش کی۔ ”ویسے انا یا رجنی تم خوبصورت ہو، موصوف دل ہی دل خواہش تو ضرور رکھتے ہوئے بس اقرار سے ڈرتے ہیں۔“ رولبی نے لقمہ دیا۔ ”نہیں مجھے ایسا نہیں لگتا۔“ انابت رقیم نے فوراً تردید بیان جاری رکھا۔

”ٹھیک ہے پھر تو میرا چانس لگ سکتا ہے۔“ عاشری نے قدرے تر سے ہوئے لہجے میں وہ ٹیٹوں ہی مسکرا دیں۔

”نہیں ہیں وہ ایسے، تو انہیں اپنا بنا لو انا میڈم، ان پر راستہ تنگ کر دو، انہیں چاروں شانے چت کر دو۔“ رولبی نے مشورے سے نوازا۔

”نہیں یہ مناسب نہیں۔“ وہ ہچکچائی۔ ”کم آن وہ یقیناً تمہارے ہی مسئلے کے انتظار میں ہیں ادھر تو چلک دکھاؤ ادھر موصوف آپ کے قدموں میں ڈھیر ہوں گے۔“ رزل نے چٹکیوں میں بات اڑائی۔

”یار جتنے وہ خوبصورت ہیں، فی الحال تو میرا دل ان کے قدموں میں ڈھیر ہونے کو چیل رہا ہے۔“ عاشری کی رگ محبت پھر پھڑکی اٹھی۔

”یار اذن ابصار تو تمہارے ہوئے، چلو ہم نے قربانی دے دی اپنا پیار تمہارے حوالے کر کے۔“ عاشری نے معصوم سی شکل بنا کر لہجے میں پیچاری ممو کر کہا۔

”کیا ان کا کوئی اور بھائی ہے؟“ اس کے لہجے میں بڑی شریر سی آس تھی۔ ”ہاں ہیں۔“ انابت نے بھی اسی کے انداز

میں کہا۔

”واہ پھر تو کیا ہو گیا۔“ عاشری نے خوشی سے لوٹ لوٹ ہونے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ نکاح شدہ ہیں۔“ انابت رقیم نے اس کے ارمانوں پر اوس گرائی، اس کا لگتا چہرہ دیکھ کر وہ ٹیٹوں بے ساختہ ٹھٹھکیاں تھیں کچھ ہی دیر بعد عاشری کی ہنسی کی گونج بھی ان کے قہقہوں میں شامل تھی۔

☆☆☆

سورج کی کرنیں الوداع کہتی ہوئی دیواروں سے ڈھل رہی تھیں جب اذن ابصار آفس سے لوٹا تھا، ردا اور صبا نے سختی سے انہیں افطاری سے قبل لوٹ آنے کی تنبیہ کی تھی لہذا وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے، اذن ابصار فریش ہونے کی غرض سے اپنے کمرے میں آیا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر بیڈ کے وسط میں پڑے ایک بے حد خوبصورت بو کے اور اس کے نیچے رکھے کارڈ پر پڑی، اس نے فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کارڈ اٹھا، اس پر سنہری رنگ سے ”فارمائی لو“ کے الفاظ درج تھے، اس نے اندر سے کھول کر تحریر پر نظر دوڑائی تو غصے کی شدید لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی، انابت رقیم نے اپنی محبت کا اظہار بہت رومانوی انداز میں کیا تھا اور آخر میں درج یہ الفاظ۔

”صرف اور صرف آپ کی انابت رقیم۔“ اذن ابصار کے غصے کو ہوا دینے کے لئے کافی تھے، قدرے تے ہوئے انداز میں اس نے لب پیچھے اور کارڈ واپس بیڈ پر اچھال دیا، اسے انابت رقیم سے اس قدر نگھایا اور بے باک حرکت کی امید نہ تھی۔

وہ پہلے بھی اس کی حرکت نظمی انداز کر گیا تھا مگر اب ضبط مجال تھا، اس کا خون جج معنوں میں رگوں میں اگلنے لگا تھا، اس کا دل چاہا تھا ایک دفعہ

زبردست طریقے سے انابت رقیم کی طبیعت صاف کر دے، وہ بہت تپا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکلا، اس کی شاید قسمت خراب تھی چودہ اسے سیزھیاں پھلانگی راستے میں ہی مل گئی تھی، اذن البصار نے بہت اشتعال سے اس کا بازو دو بوجھا اور تقریباً گھیسٹے ہوئے اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

وہ اس اچانک افتاد کے لئے تیار نہ تھی لہذا احتجاج بھی نہ کر پائی، ردی کی ایک شدید لہر اس کے وجود کے آریا رہی ہوئی تھی، جس مضبوطی سے اذن البصار نے اس کا بازو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا، اسے لگا تھا جیسے ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں، انابت رقیم کو اس نے ایک جھٹکے سے چھوڑا تھا، وہ بہت مشکل سے تو اذن برقرار رکھ پائی تھی۔

”اس گھٹیا حرکت کا مقصد؟“ کڑے طور لیتے وہ اس پر برس پڑا۔

”آپ کو نہیں پتہ؟“ اس نے معصومیت کی حد کر دی۔

”کمال ہیں آپ مس انابت رقیم، اتنی گھٹیا حرکت کرنے باوجود کوئی ندامت نہیں آپ کو اپنے کے پر۔“ اس کے اطمینان پر اذن البصار نے سلگ کر طنز کا وار کیا۔

”اس میں برائی ہی کیا ہے؟ اگر میں آپ کو پسند کرتی ہوں تو اس کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں۔“ انابت رقیم نے گویا اذن البصار کو سمجھانا چاہا، اس کے تاثرات یکدم سختی اختیار کر گئے تھے، ایک تند و ہمزہ نظر اس کے بے باک سراپے پر ڈال کر وہ خود ساختہ پچھتاہٹیاں گھٹنوں سے ڈرائیجے تک آتا ٹراؤزر اور اسکن ٹائٹ شرٹ ہیں ڈیپ گلے کے ساتھ وہ کوئی ماڈل ہی لگی تھی، اس کے دل میں نفرت کی جڑیں مزید گہری ہوئی تھیں۔

”جہاں سے تم آئی ہو وہاں ان باتوں کو معمولی گردانا جاتا ہوگا مگر یہاں یہ سب بہت

محبوب سمجھا جاتا ہے۔“ اس نے دبے دبے مگر مرتش لہجے میں کہا۔

”جہاں سے میں آئی وہاں بھی انسان بچے ہیں، بار بار یہ طعنہ دے کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟“ اسے ناگوار گزرا تھا اس کا گزشتہ حوالہ دینا۔

”میں کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا تمہارا وجود ہی تمہارے پس منظر کا ثبوت ہے۔“ اس نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا، وہ تڑپ کر اس کے سامنے آئی تھی۔

”جیسی آپ کی پر سائلی ہے آپ کو یہ ٹیپکل مردوں والی سوچ بالکل سوٹ نہیں کرتی، آپ کو تو بہت براڈ مائنڈ ہونا چاہیے۔“ اس نے اپنا خیال پیش کیا، وہ اسے تنگ نظر کہہ رہی تھی اس کا پارہ ہائی ہونے لگا تھا، وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

”تم خود کیا ہو، اپنی حدود و قیود سے واقف ہو، جو مجھ پر رائے دہی کر رہی ہو۔“ وہ تنگ کر بولا۔

”غصہ کس بات پر ہے آپ کو، آئی نوکہ پسند تو آپ بھی مجھے کرتے ہیں۔“ اس نے ردی کی قیاس آرائی من و عن اذن البصار تک پہنچائی، اس کا جی چاہا تھا اس لڑکی کو دھنک کر رکھ دے۔

”کچھ شرم لحاظ ہے تم میں یا نہیں، کس حق سے تم یہ سب کہہ رہی ہو، کیا عید و پیال باندھے ہیں میں نے تم سے جو تم خوش بھی کا شکار ہو رہی ہو، دلچسپی تو میں نے پہلے بھی تم میں نہیں لی اور اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ اس نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھ کر کھری کھری منائیں۔

”آپ یوں بھڑک رہے ہیں جیسے نجانے میں نے کیا گناہ کبیرہ کر دیا ہے، ایک اظہار محبت ہی تو کیا ہے اور ویسے بھی رائے دہی حق تو عورت کو اسلام نے بھی دیا ہے۔“ اسے تین اس نے بہت سمجھداری کا کام کیا تھا، وہ چڑ کر بولی، اب تو

اپنی تذلیل وہ بہت برداشت سے سن رہی تھی، وہ مڑی اور تیزی سے اس کے پہلو سے نکل جانا چاہا۔

اذن البصار نے اسی تیزی سے دونوں شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا تھا۔

”میں تم سے کوئی تلخ بات کہنا نہیں چاہتا تھا مگر تمہیں عزت راس نہیں آتی، اسلام نے رائے دہی حق دیا ہے نامحرم مرد سے کھلے عام عشق و معاشقے کا نہیں اپنی نادر معلومات میں اضافہ کر لو، پہلے بھی تمہاری نامعقول حرکات محض میزبان بن کر برداشت کی ہیں، اب تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو بہت بری طرح پیش آؤں گا۔“ اس کی آنکھیں تپش برسا رہی تھیں وہ نجانے کیوں جلنے لگی تھی۔

”اور مجھ سے محبت کر کے تم نے کوئی معرکہ سرانجام نہیں دیا یہ اعجاز صرف مرد کو حاصل ہے کہ وہ اپنی محبت سے عورت کو سنو اور دے تاکہ عورت کو حاصل ہے کہ کھلے عام منادی کرتی پھرے، اپنی مغربی اور پست سوچ کو مجھ پر لاگو کرنے کی کوشش مت کرنا، یہ حسن کے مظاہرے کسی اور کو دکھا کر متاثر کرنا، اگر تم دنیا کی آخری لڑکی بھی ہوتی تو اذن البصار پھر بھی تمہیں منتخب نہیں کرے گا۔“ آج دیتے مدھم لہجے میں کھولتے ہوئے اس نے اسے پردے دھکیلا، وہ اجنبیت سے بھر پور لہجے میں غرایا، وہ بے توازن ہو کر بید پر گری تھی، شولڈر کٹ سیاہ بال چہرے پر بکھر کر گویا چاند کو بادلوں کی اوٹ میں لے گئے۔

اذن البصار نے اسے آئینہ دکھانے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔

”اٹھاؤ یہ سب اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ مزید بھڑکا، انابت رقیم کی زبان تالو سے جھٹ کر وہ ٹوٹی، رہانت کے احساس سے پلکیں پھینکنے کو بے تاب تھیں تو گلابی چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اس

نے آہستگی سے بکھرے بالی پیچھے کیے آنکھیں بدستور جھکی تھیں، لرزنی پلکیں آنسوؤں کے سیلاب کو روک نہیں پائی تھیں۔

یہ سچ تھا کہ اس حرکت میں اس کی مرضی رتی برابر بھی شامل نہ تھی، یہ سب ردی، اہل اور عاشی کا پلان تھا، کارڈ تنگ عاشی نے لکھا تھا وہ تو محض ایک کردار کے طور پر پیش کر دی گئی، اذن البصار کے تلخ رویے اور تنگ آمیز الفاظ پر اس کا جی چاہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سا جائے اذن البصار کی نظروں میں انابت رقیم کا گراف کچھ اور نیچے گرا تھا۔

ایک سرد نگاہ اس کے بڑمردہ وجود پر ڈالتا وہ وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا جبکہ انابت رقیم اپنے بے جان ہوتے قدموں کو دھکیلتی دروازے کی طرف بڑھ گئی، ان تینوں کی بات مان کر اس نے بہت بڑی غلطی کی تھی، اس کا احساس اسے گزرے چند لمحوں نے گردا دیا تھا۔

صد شکر کہ سب لوگ افطاری کی تیاریوں میں مگن تھے کسی کو بھی ممکنہ کاروائی کا اندازہ نہ ہو سکا تھا، اپنے کمرے میں آکر وہ پھوٹ پھوٹ کر ردی۔

☆☆☆

”آپ کو ایک دفعہ اذن سے تو بات کرنی چاہیے تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے؟“ ردانے جھجکتے ہوئے شہوار البصار سے کہا، تو انہوں نے بے ساختہ اپنے ردیو بیٹھے اذن البصار کو دیکھا، جس کے چہرے پر ابھرن تھی۔

”مجھے نہیں لگتا کہ میرے بیٹے کو میرے فیصلے سے اختلاف ہوگا۔“ ان کے لہجے میں مان تھا۔

”جی پایا، آپ کی کسی بات کی مخالفت کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے بات کے پس منظر جانے بغیر انہیں یقین دلایا تو شہوار

البصار کا سہروں خون بڑھ گیا۔

”دیکھا ردا! یہ شہوار البصار کا خون ہے، جس میں ادب اور وفا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔“ ان کا سینہ فخر سے تن گیا اور اذن البصار خوش تھا کہ وہ ان کا فخر تھا۔

”اب اسے بتا بھی دیں کہ بات کیا ہے۔“ ردا نے قدرے پر اسرار انداز میں کہا، اذن البصار چونک اٹھا۔

”صبح رقیم کا فون آیا تھا۔“ انہوں نے بات کا آغاز کیا، وہ خاموشی سے ان کی اگلی بات کا انتظار کر رہا تھا۔

”جوان کا ماحول ہے تم بہتر سمجھو، آئے دن ایسے وڈیوں اور جاگیر داروں سے تمہارا واسطہ پڑتا ہے۔“ انہوں نے تمہید باندھی، وہ اب بھی چپ تھا۔

”چودہری کریم حاشر کے علم میں آچکا ہے کہ انابت پاکستان ہے وہ اسے واپس حویلی بلانا چاہتے ہیں۔“

”تو اس میں غلط کیا ہے پایا، آخر تو اسے یہاں سے جانا ہی تھا، پراہم کیا ہے۔“ اس نے لب کشائی کی۔

”پراہم یہ ہے کہ وہاں وہ اس کی شادی کر دیں گے۔“ ان کی آواز مدہم تھی، اذن البصار نے الجھ کر شہوار البصار کو دیکھا۔

”پراہم یہ ہے کہ حویلی جانے کی صورت میں اس کی شادی ایسے شخص سے کر دی جائے گی جو اس سے بائیں برس بڑا ہے جو چار بچوں کا باپ ہے، دوسری آپشن ایک چھ سال کا بچہ ہے۔“ ان کے لہجے میں گہرا دکھ تھا، تفصیلات جان کر اسے خود بھی صدمہ پہنچا تھا مگر ایسے بہت سے کمیز سے واقف تھا۔

”تو ان سب باتوں کا ہمارے ساتھ کیا تعلق؟“ بالآخر شہوار البصار اسے مطلوبہ موضوع

تک لے ہی آئے تھے۔

”بیٹے رقیم چاہتا ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی تم سے کر دی جائے، وہ اپنی بیٹی کو اس علم سے بچانا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش کچھ غلط بھی نہیں ہر باپ کو حق ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کو محفوظ کر سکے، رقیم نے مجھ سے مدد مانگی تو میں انکار نہیں کر سکا اور اگر اقرار کیا تو صرف اس لئے کہ مجھے تم پر اعتماد تھا، میرے فیصلے تمہاری فرمانبرداری کی وجہ سے ہیں اذن اور تم نے ثابت کیا ہے کہ میرا تم پر مان غلط نہیں۔“ ان کے لہجے میں انہوئی خوشی تھی اب انکار کی گنجائش کہاں تھی، تمام معاملات تو طے تھے۔

”پاپا ہم اس کی شادی کسی اور جگہ بھی تو کر سکتے ہیں۔“ بہت سوچ کر اس نے کہا، وہ مانتا تھا کہ انابت رقیم کے ساتھ غلط ہو رہا ہے مگر وہ خود قربانی دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

”تو تم انکار کر رہے ہو؟“ ان کے لہجے میں اشتعال در آیا تھا، اذن البصار نے بے ساختہ مدد طلب لگا ہوں سے مال کو دیکھا۔

”اذن ٹھیک کہہ رہا ہے ہم کسی اچھی فیملی میں اس کا رشتہ کر سکتے ہیں، پھر میں ثانیہ کو کیا جواب دوں گی، حیا کو ہمیشہ میں نے اپنی بہو کے روپ میں دیکھا ہے۔“ ردا نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔

”کمال کرتی ہیں ردا آپ بھی، اس نے ہم سے مدد مانگی ہے اور میں اسے دوسرا در دکھا دیتا ہوں، چلیں ایک لمحے کے لئے میں آپ کی بات مان لیتا ہوں تو اتنی جلدی اچھی فیملی اور لڑکا میں کہاں سے تلاش کروں اگر وہ مل بھی جاتے ہیں تو اتنی جلدی نکاح یا شادی کی کیا توجہ پیش کروں گا اور حالات جاننے کے بعد انہوں نے انا کو سپورٹ کرنے سے انکار کر دیا تو اسے واپس وہیں جانا پڑے گا، اس سارے مسئلے کو طول دینے

کا پھر فائدہ؟“ انہوں نے تفصیل سے جواب دے کر ردا کو قائل کرنا چاہا۔

”لیکن میں ہی کیوں پاپا؟“ وہ جھنجھلایا۔

”تو کیا نوبان ہوگا، جو نکاح شدہ ہے یا میرب ہوگا جو اس سے ڈیڑھ دو سال چھوٹا ہے۔“ شہوار البصار نے تنکھے انداز میں پوچھا، دم لب چل کر رہ گیا، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنی اہمیت کیسے بیان کرے، اپنے حق میں کیسے لڑے، اتنا بڑا کالم نگار اور کثیر تعداد میں شائع ہونے والے ماہنامے کے ایڈیٹر کے پاس اپنے محاذ پر لڑنے کے لئے زور دلائل تھے نہ الفاظ، شہوار البصار کے وہ ہمیشہ قریب رہا تھا، وہ ان سے اپنی بات بہت مان و محبت سے منوالیا کرتا تھا، اب ان کے فیصلے کو رد کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا، عجیب کیفیت تھی، وہ بری طرح الجھا تھا، کوئی راہ فرار نہ تھی، انابت رقیم تو وبال جان بن گئی تھی۔

”تو پھر میں اس خاموشی کا کیا مطلب سمجھوں؟“ اب کی بار ان کا یقین ڈولنے لگا تھا، اذن البصار تڑپ اٹھا تھا۔

”آپ نے اگر کوئی وعدہ کیا ہے تو میں اسے ضرور پورا کروں گا۔“

”میں آپ کو بھی ناراض نہیں کر سکتا پاپا؟“

نجانے یہ الفاظ کیسے اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے، اس نے اپنے دل کی ہر خواہش دفن کر دی، اپنے والدین کی بقاء کے لئے ان کے مان کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی تمناؤں سے دستبردار ہو گیا اور ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا جس کا ذکر تک اسے پسند نہیں تھا۔

”آتم پراڈ آف یو مائی سن (مجھے تم پر فخر ہے میرے بیٹے)۔“ شہوار البصار نے اسے بہت بر جوش انداز میں سینے سے لگایا، ان کی آواز سے

محبت کی خوشیوں کی نوید نے اس کی ہمت بندھائی تھی، ان کے مان اور وقار کو قائم رکھنے کے لئے

اس نے خود اپنی ذات داؤ پر لگائی تھی۔

”ایکسکوز می پاپا! مجھے کچھ کام ہے۔“ ان سے الگ ہوتے اس نے تیزی سے کہا، ردا نے اس کے فرار کی بخوبی محسوس کیا تھا، زیرہ زیرہ ہوتے جذبات کو چھپاتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

انابت رقیم صوفے پر پاؤں رکھ کر آلتی پالتی مار کر کانی ایزی ہو کر بیٹھی تھی، تھکاوٹ کا احساس جیسے روم روم میں اتر آیا تھا، اس نے آنکھیں موند کر سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا، دن بھر مشیننگ کرنے کے بعد، اب ہلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، وہ یونہی نجانے کتنی دیر بیٹھی رہی جب کتنی نے اسے رقیم حاشر کے فون کی اطلاع دی، انابت رقیم نے تیر کی طرح کمرے کا رخ کیا۔

”ہیلو پاپا! کیسے ہیں آپ؟ اتنے دنوں بعد کال کی ہے، میں کتنا ادا اس ہو گئی ہوں کچھ پتہ ہے آپ کو اور ممہا کہاں ہیں؟ وہ کیسی ہیں؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے، اس کے لب دلچسپ سے عجیب بے گلی ظاہر ہو رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں، میرا بچہ کیسا ہے اور پاپا سے اتنے سارے سوال ایک ساتھ۔“ دوسری طرف رقیم حاشر کی شہد کی طرح مٹھی آواز نے بہت تیزی سے اس کی آنکھوں میں نمکین پانی جمع کیا تھا۔

”آپ کی ممہا بھی ٹھیک ہیں اور میرے ساتھ ہیں، اچھا میرا بچہ ادا اس کیوں ہے، کیا شہوار انکل اور ان کی فیملی آپ کو پسند نہیں آتی، آپ بور ہو رہی ہو؟“ ان کے لہجے سے بے تابانی چھلک رہی ہیں۔

”نوپا پاپا ایسی کوئی بات نہیں، انکل اور ان کی پوری فیملی بہت ناس ہے، مجھے وقت گزرنے کا

احساس ہی نہیں رہتا۔“ اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے پوری سچائی سے اعتراف کیا۔

”جی پایا۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔

”بیٹا میری بات غور سے سنو۔“ ان کی آواز محتاط لگ رہی تھی، اس نے چونک کر ریسور دیکھا۔

”کل آپ کا اذن کے ساتھ نکاح ہے، میں آنے کی بھرپور کوشش کروں گا، لیکن اگر میں نہ آسکا تو آپ پریشان مت ہونا، آپ کے اکل کو میں نے سب باتیں سمجھا دیں ہیں، آپ ان کی باتیں مان لینا اور انہیں شک مت کرنا۔“ وہ ششدر سی بیٹھی رہ گئی، اس کا پورا وجود ایک لمحے میں گھوم گیا تھا۔

”لیکن پایا..... اتنی اچانک..... مطلب آپ کے بغیر۔“ وہ بے ربطی بولی، اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ کیا کہے۔

”انا میں جو کچھ کر رہا ہوں بیٹا آپ کی خوشی کی خاطر کر رہا ہوں، پایا بھی اپنی انا کے لئے برا سوچ سکتے ہیں۔“ وہ خاموش رہی کیونکہ وہ جانتی تھی یہ سوال نہیں تھا۔

”یہ لو اپنی ممانعت سے بات کرو۔“ انہوں نے ریسور ارم کو گھمایا، ارم نے بس اسے دو چار بدایت جاری کی تھیں جو اس نے خالی لذتی سے سنیں۔

”کل ممانعت پایا اپنی انا سے ملیں گے، انشا اللہ اپنا بہت سارا خیال رکھنا اللہ حافظ۔“ بہ عجلت کہہ کر انہوں نے کال ڈسکنک کر دی، ریسور رکھ کر وہ مڑی تو اپنی پشت پر اذن البصار کو دیکھ کر اس کا دل بچانے کیوں اچھل کر جیسے طلق میں آگیا تھا اور جن نظروں سے اس نے انابت رقیم کو دیکھا اسے لگا وہ ریت بن کر بکھر جائے گی

دوسرے ہی لمحے وہ بہت تیزی سے اس کی سائیڈ سے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆
”اف انا..... اب تمہیں بھابھی کہنا پڑے گا۔“ میرب کو جیسے غش آگیا۔

”ادب کرو، عمر میں تو پہلے ہی میں تم سے بڑی ہوں اب رتبے میں بھی ہونے والی ہوں۔“ اندرونی اضطراب پر پاؤں پاتے ہوئے اس نے بدقت تمام مسکرا کر کہا۔

”وہی تم نے میرے ساتھ بے وفائی کی ہے۔“ اس نے مصنوعی مسکیت چہرے پر طاری کی۔

”کیا بے وفائی کی ہے میں نے؟“ اس نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

”میرے معصوم دل کا خون کیا ہے، میرے ارمانوں کو اپنی بے وفائی تلے چلا ہے۔“ ایک جذب سے کہتے ہوئے اس نے انابت رقیم کو آنکھ ماری۔

”اف کتنے بد لحاظ اور بد تمیز ہو تم میرب، شرم نہیں آتی اپنی عمر سے بڑی لڑکی پر لاکن مار رہے ہو۔“ اس نے تپ کر کہا۔

”ادو، ڈیڑھ دو سال کوئی ایج میب نہیں ہوتا، اب تم ایسی بھی دادی اماں نہیں ہو۔“ وہ اپنے موقف پر قائم تھا۔

”تم آج سچ کچھ مجھ سے مار کھاؤ گے۔“ انابت رقیم کو صبح معنوں میں غصہ آیا تھا۔

”او نہہہ ہلو مت انا دیکھو مہندی کا ڈائزین خراب ہو جائے گا۔“ کنزئی جو اس کے پیروں اور ہاتھوں پر مہندی لگا رہی تھی، نے فوراً خبردار کہا، تو وہ دانت کچکچاتی واپس سیدھی ہوئی۔

”سوری یار، اب تو تم رتبے میں بڑی ہونے والی ہو اس لئے لاسٹ ٹائم مذاق کر رہا ہوں، ورنہ تم مجھے کھنک کی طرح ہی عزیز ہو، بے

شک تھوڑا سا میں تم سے چھوٹا ہوں لیکن تم نے وہ محاورے نہیں سنا کہ بھائی ہمیشہ بڑے ہی ہوتے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے پیلو میں آ بیٹھا تو انابت رقیم کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

”میرا کوئی بھائی نہیں ہے میرب، لیکن اگر ہوتا تو بالکل تمہارے جیسے ہوتا۔“ اتنے خوبصورت رشتے قدرت نے بن مانگے اس کی جموئی میں ڈالے تھے ایک دم ہی وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگی تھی۔

”چاند نظر آگیا۔“ چاند نظر آگیا۔“ کھنک چلاتی ہوئی ہو چھت سے نیچے آئی۔

”کل عید ہے پایا۔“ اس نے اطلاع دی۔

”ایسا چلیں تاہم چاند دیکھتے ہیں۔“

”ہاں چلو، بس یہ تھوڑی سی مہندی مکمل کر لوں۔“ کنزئی نے کہا۔

”میرب تم چلو نا، ایسا بعد میں آ جائیں گی۔“ اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

”اف، کھنک میرے نہ دیکھنے سے عید کینسل تھوڑا ہی ہو جائے گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بات کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔

”لو نہ ہو گیا فاسل سچ، اب میں بھی جا رہی ہوں چاند دیکھنے۔“ بچی ہوئی مہندی ٹیبل پر رکھ کر کنزئی نے کہا۔

”مجھے بھی چاند دیکھنا ہے۔“ انابت رقیم نے خواہش ظاہر کی۔

”خبردار جو تم یہاں سے ایک انچ بھی ہلی، ساری مہندی اور میری دو گھنٹے کی محنت ضائع ہو جائے گی۔“ کنزئی نے آنکھیں دکھائیں۔

”ہاں ایک حل ہے۔“

”کیا؟“ انابت رقیم نے بے تابی سے پوچھا۔

”اگر اذن بھائی راضی ہو جائیں تو وہ تمہیں اٹھا کر چاند دکھا سکتے ہیں۔“ اس نے آنکھ دبا کر

شرارت سے کہا تو اتنے اچانک حملے پر وہ خفت سے سرخ پڑنے لگی۔

”شرم کرو، ابھی نویان بھائی کو بتائی ہو کہ آپ کی بیوی اتنی بھولی نہیں ہیں جتنی آپ سمجھتے ہیں۔“ اس نے پیچھے ہٹتے دھمکی دی۔

”ہائے ہمارے ایسے نصیب کہاں۔“ وہ مصنوعی درد سے بلبلاتی تو انابت رقیم بے ساختہ کھلکھلائی تھی۔

☆☆☆

شہوار البصار چاہتے تھے کہ اذن البصار کے ویسے کی تقریب کے ساتھ ہی نویان البصار کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں لیکن ان دونوں نے ہی اس بات سے انکار کر دیا، بقول کنزئی وہ اپنے بھائی اور دوست کی شادی انجوائے کرنا چاہتی تھی جو دلہن بننے کی صورت میں بھی نہ کر پائی۔

لہذا چونکہ اگلے دن عید تھی لہذا اس دن اذن البصار اور انابت رقیم کا نکاح ہونے طے پایا، اگلے دن بہت جلدی اور افراتفری کے باوجود ردا نے اس کے لئے ڈھیروں ڈھیر شایگ کر ڈالی، تمام قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کو شہوار البصار مدعو کر چکے تھے۔

مرد حضرات عید نماز سے فارغ ہو کر آئے تو کنزئی اور کھنک نے انہیں گھیر لیا۔

”عیدی نکالیں اذن بھائی۔“ کنزئی نے ہتھیلی پھیلائی۔

”یار میں اپنا وائلٹ گھر ہی بھول گیا تھا میں لے کر آتا ہوں۔“ اس نے اسے تنگ کرنا چاہا۔

”کوئی بہانہ نہیں چلے گا، جلدی سے دیں یہ ہمارا حق ہے۔“ کھنک نے چپک کر کہا۔

”اب دے بھی دیں اذن بھائی۔“ اسے پاکٹ ٹولتے دیکھ کر کنزئی بھنجلائی۔

”تم میرے پیچھے کیوں پڑی ہو، جاؤ اپنے

شوہر نامدار سے ساری عیدیاں وصول کرو۔“
کنزئی جو بہت شوق سے کھڑی تھی اتنے غیر متوقع جملے پر شیشا کر رہ گئی۔

”اوہ..... ہم تو ہر حساب بے باقی کرنے پر تیار ہیں محترمہ مائیں تو سہی۔“ نویان البصار نے نجانے کہاں سے سر نکال کر جملہ پھینکا تھا، کنزئی نے وہاں سے ہٹ جانے میں ہی عافیت بھی۔

”کو کہاں جا رہی ہو، میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ اذن البصار نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا۔

”یہ لو تو تمہارے لئے اور یہ میری گڑیا کھنک کے لئے۔“ اس نے چند ہرے ہرے نوٹ اسے اور کھنک کو تھمائے، کھنک خوشی سے نعرے لگاتی ہوئے باہر نکل گئی۔

”یہ ہیں جناب اپنی امانت سنبھالیں، ہم تو چلے۔“ کنزئی کو عین نویان کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے اس نے گویا بھائی اور دوست ہونے کا فرض نبھایا۔

”ابھی وقت نہیں آیا اذن بھائی، امانتیں اتنی آسانی سے نہیں مل جاتیں۔“ بہت پھرتی سے وہ لاؤنج سے باہر نکلی تھی لیکن جاتے ہوئے جواب دینا نہیں بھولی تھی، اس نے شرارت سے نویان کی طرف وکڑی کا نشان بنایا جو مصنوعی ٹھکی سے اسے کھور رہا تھا۔

”کالی شارپ ہو گئی ہے یار۔“ اس نے تبصرہ کیا۔

”اب ہر کوئی تمہاری طرح گھماڑی تھوڑی رہتا ہے۔“ اذن البصار نے جواب پر مزاح انداز میں کہا تو نویان کا قبضہ لاؤنج میں گونج اٹھا۔

☆☆☆

یونیٹیشن نے اسے البصار ہاؤس آکر تیار کیا تھا، میروں لہنگا جس پر ڈل گولڈن کام ہوا تھا اس کے متناسب سراپے پر خوب بیچ رہا تھا، ہمرنگ جیولری پہنے اور میک اپ سے چمکتے چہرے کے

ساتھ اس پر نظریں ٹھہر نہیں رہی تھیں، ردانے بے ساختہ کالا ٹیکر اس کے کان کے پیچھے لگایا۔

قبول وایجاب کا مرحلہ طے پایا، مبارک سلامت کا شور اٹھا اور وہ چند لمحوں میں انابت رقیم سے انابت اذن البصار بن گئی، اس کا دل نجانے کیوں بھرنے لگا تھا، ارم اور رقیم حاشر کی کمی دل میں سوئیاں چھوٹنے لگی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد اسے اذن البصار کے پہلو میں لا کر بیٹھا دیا گیا، موتیا ٹکر کے راجستھانی شلو اور سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح سحر طاری کر رہا تھا، اس کے اتنے قریب بیٹھنے پر انابت رقیم کا دل جیسے سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب تھا، دھڑکنوں نے الگ شور مچایا تھا، پللیں لرز لرز کر بے حال تھیں تو پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی، اس کے پہلو میں بیٹھی وہ کسی سلطنت کی شہزادی لگ رہی تھی، لوگ ان کی جوڑی کو آئینڈیل پیل قرار دے رہے تھے، کتنی ہی توصیفی لگائیں اور توصیفی جملے اس نے سنے تھے۔

ہر ایک نے ان کو سراہا تھا، لیکن اذن البصار نے ایک نگاہ بھول کر بھی اس پر ڈالنا گوارا نہیں کیا تھا، دیکھ لیتا تو شاید اپنا ہر اختلاف بھلا دیتا، میرب اور نویان کے کمرے کھٹا کھٹ اس خوبصورت منظر کو قید کرنے میں مصروف تھے۔

رات گئے تک رسم و رواج کا سلسلہ جاری رہا، اذن کو امیر جنسی میں آفس جانا پڑا تھا وہ تو پہلے ہی جان چھڑا رہا تھا یوں یہ بہانہ کام آگیا اور وہ کسی کی سنے بغیر آفس چلا گیا، رات کے آخری پہر کہیں اسے کمر سیدھی کرنے کا موقع ملا، وہ فریش ہو کر بڑی فرصت سے بیڈ پر آکر لیٹ گئی، کمر اور اعصاب نجانے کیوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے، کئی گھنٹوں سے وہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی تھی، اس نے خالی خالی نظروں سے اپنے مہندی رچے ہاتھوں کو دیکھا، بہت ہی خوبصورت

رنگ آیا تھا، اس کے سفید ہاتھوں نے حنائی رنگ اختیار کر کے اس کو عجیب سا حسن عطا کر دیا تھا۔
آنسوؤں کے گرم گرم قطرے جنہیں وہ صبح سے پیچھے دھکیل رہی تھی اب رخسار بھگونے لگے۔
یہ کیسی شادی ہے پایا، آپ کے اور ماما کے بغیر۔“ اس کے اندر ہی اندر درد کا شدید احساس بھگونے لے رہا تھا۔

”ایک بوجھ کی طرح اتار پھینکا مجھے، کیسے التجاء کی ہوگی آپ نے انکل سے؟ کہ وہ مجھے اپنا لیس، میرا بیٹا ہونا کس قدر ذلت کا باعث بنا آپ کے لئے۔“ وہ بے آواز رو رہی تھی، اپنا وجود کاٹنے کی طرح چھ رہا تھا، وہ رہ کر یہ احساس اسے مارے ڈال رہا تھا کہ وہ زبردستی ان کے سر پر مسلط کی گئی ہے، کرب اور اذیت کے کوڑے اس کی روح پھلتی کر رہے تھے، اس کے آنسوؤں نے شدت اختیار کی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن ویسے کی تقریب تھی، ردانے اس کے لئے نارنجی پیٹواڑ خریدی تھی، جسے پہن کر وہ کوئی باری ڈول لگ رہی تھی، عین ویسے کی تقریب کے وقت ارم اور رقیم حاشر آئے تھے۔
انابت رقیم اپنی پوزیشن کی پرواہ کیے بغیر ان سے لپٹ گئی، اتنے دنوں کا غبار ایک لمحے میں آتش فشاں کی طرح نکلا تھا، وہ اتار دوئی تھی کہ رداد صبا سمیت خود ارم اور رقیم حاشر سے اسے چپ کر وانا مشکل ہو گیا۔

رات کے تقریباً ایک بجے اسے روایت کے مطابق اذن البصار کے کمرے میں پہنچا دیا گیا، موتیے اور گلاب سے آراستہ پورا کمرہ رات کے فسوں اور دلفریبی میں گھویا عجیب سا سماں باندھا گیا، اس نے پرسکون ہو کر ٹائلیں بیڈ پر پھیلائیں اسے اذن البصار سے کسی جذباتی رویے کی امید نہیں تھی، جبکہ اول روز سے ہی وہ اسے

متاثر کرنے میں ناکام رہی تھی، ایک طرف یاسیت تھی تو دوسری طرف عجیب سی سرشاری تھی، جیسا تھا اب وہ اس کا تھا، جسے چپکے چپکے دل کے من مندر میں چھپا کر رکھا وہ اسے بن مائیکل مل گیا وہ اس کی محبت کی ڈور میں بندھتی جا رہی تھی، نجانے نکاح کے دو بولوں کی کشش تھی یا اس کی دل کی خواہش کہ جذبات خود بخود لے بدلتے جا رہے تھے۔

”میں سارے اختلافات مٹا دوں گی، اپنی وفا سے میں آپ کی ہر غلط فہمی دور کر دوں گی، کہتے ہیں پیار سچا ہو اور لگن پختہ ہو تو جیت پیار کی ہی ہوتی ہے، میرا پیار بھی سچا ہے، میں اپنی وفا اور محبت سے آپ کو بخیر کر لوں گی۔“ اس کا معصوم دل عہد باندھ رہا تھا، اذن البصار کے دل میں بھرے زہر کے زہریلے پن کی شدت جانے بغیر۔

☆☆☆

”اذن جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اب تم خود کو ایڈجسٹ کر لو حالات کے مطابق۔“ نویان نے رسانیٹ سے کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔
”کتنا مشکل ہوتا ہے کسی ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنا جسے آپ سب سے زیادہ نا پسند کرتے ہوں، تم نہیں جانتے۔“ اس نے غصے سے رخ پھیرا۔
”یار! تمہیں کیوں اتنی نفرت ہے اس سے؟“

”تمہیں نہیں معلوم؟“ اذن البصار کی طنز میں گھلی آواز نویان کے کانوں سے ٹکرانی۔
”تم اسے پہنچ کر سکتے ہو۔“ انابت رقیم قدرے بے باک واقع ہوئی تھی رہی سہی کسر امریکن طرز زندگی نے پوری کر دی تھی۔
”مجھے کسی کو نہیں بدلنا۔“ وہ ضدی پن سے گویا ہوا۔

”ہم خود ہی تو ترقی، ترقی کا شور مچاتے ہیں، اب جب ہمارے ملک کی عورتیں آگے بڑھ رہی ہیں تو بھی ہمیں ہی اعتراض ہے۔“ نویان نے اسے دوسرے پہلو سے سمجھانا چاہا۔

”میں نے حقوق نسواں یا ان کے ترقی کے کردار سے کب انکار کیا ہے، ٹیکنالوجی ہے، سائنس ہے، آرٹ ہے اس طرف تو کوئی ترقی کرتا نہیں، البتہ فیشن کو ضرور سب دھڑا دھڑا اپناتے کر رہے ہیں، ہم چادر کے اندر رہ کر بھی ترقی کر سکتے ہیں نویان۔“ اس نے اتنے غصے میں کہا کہ نویان کو خاموش ہونا پڑا۔

”اگر میں یہ سب نظر انداز کر بھی دوں تو اس کی عمر، محض اٹھارہ برس، کم از کم آٹھ سال بڑا ہوں میں اس سے۔“ اس نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔

”اتنا ایج ڈفرنس تو چلتا ہے اذن۔“ اس نے اعتراض رد کیا۔

”تبی بچکانہ حرکتیں کرتی ہے وہ، گیارہ بجے آئسکریم، بارہ بجے لائک ڈرائیو بلی کے بچوں سے کھیلتا۔“

اذن البصار نے اس کے شاندار کارنامے گنوائے جو اس کے علم میں تھے دو تین وہ حذف کر گیا تھا جن کی وجہ سے وہ زیادہ بدگمان ہوا تھا۔

”یہ اس کی عمر کا تقاضا ہے یار، جیسے جیسے وقت گزرے گا وہ سمجھ دار ہو جائے گی۔“

”تب تک میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وقت گزرنے کا انتظار کروں۔“ اس نے گل کر کہا۔

”اتنی نفرت کی وجہ تو بتا۔“ اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”جو گوناویں ہیں وہ کم ہیں۔“ وہ بھنا کر بولا۔

”تم کنزٹی سے محبت کرتے ہو؟“ انداز ٹیکھا تھا۔

”آف کورس کرتا ہوں۔“ نویان نے

شرارتی انداز میں جواب دیا۔

”کوئی وجہ؟“ انداز سنجیدہ تھا۔

”محبت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔“ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر جواب دیا۔

”تو پھر نفرت کی بھی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔“ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”جاد اب آرام کرو، ٹائم کافی نکل گیا ہے۔“ نویان نے بات لپٹی کہ اندر انابت رفیم اس کے انتظار میں بیٹھی تھی، وہ چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو نویان نے بھی اپنی راہ لی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو سوا چار ہو رہے تھے، فجر کی اذان کی صدا میں چاروں طرف سے بلند ہونے لگیں کمرے کی لائٹ جل رہی تھی، انابت رفیم اس کے آنے تک سوچلی تھی، تاریکی رنگ کے پشوار میں وہ بلب کی طرح جبک معا رہی تھی، لپ اسٹک سے بجے یا قوت کے دانوں جیسے شکرنی ہونٹ نرمی سے بند تھے، بڑی بڑی پلکیں آنکھوں پر سایہ بنا رکھیں تھیں، بے خبری میں سوئی انابت رفیم کسی کو بھی بے بس کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی، اذن البصار ٹرائس کی سی کیفیت میں بیڈ کے قریب آیا اور اس کے سامنے کنارے پر ٹک گیا، انابت رفیم کو دیکھ کر اس کے چشم تصور میں حیا اتر آئی، گو کہ انابت رفیم اس سے کہیں زیادہ حسین و جمیل تھی مگر حیا کے چہرے کا تقدس، اس کی جھکی پلکیں، اس کی جھجک، اس کا وقار، اس کی شخصیت کا ضمیر اور ایسی چیزیں تھیں جن کا اذن البصار خواہش مند تھا، دوسری طرف انابت رفیم بھی، ضدی، منہ پھٹ، لالابیلا چونچال طبیعت کی مالک، ابھی تک بچپن کے کناروں میں قید۔

اس نے ایک باوقار جیون ساھی کی تمنا کی تھی مگر سارے خواب چکنا چور ہو گئے، ایک دم وہ اس کے سحر سے نکلا تھا، سارا فسون کہیں غائب ہو

گیا تھا، وہ تیزی سے بیڈ سے اٹھا، ایک آنکشتی نگاہ اس کے پر بہار سراپے پر ڈالتا وہ واش روم میں گھس گیا۔

☆☆☆

صبح جب انابت رفیم کی آنکھ کھلی تو سورج کی شعاعیں چھین چھین کر گھاس و پھوس سے صبح ہونے کا پیغام دے رہی تھیں وہ آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھ بیٹھی، قدموں کی چاپ اور نفرتی قہقہوں نے شہادت دی کہ تمام لوگ بیدار ہو چکے ہیں، اس نے اضطرابی انداز میں اذن البصار کی تلاش میں کمرے کے چاروں اطراف نگاہیں دوڑائیں مگر وہ کہیں نہیں تھا، صوفے پر پڑا اس کا بلیک قمیڑ پیس گواہی دے رہا تھا کہ وہ رات کو آیا تھا، اس کے دل میں کوئی بے چینی سرایت کرنے لگی، چند لمحوں پہ یونہی خالی پن سے بیٹھی رہی، پھر چیخ کرنے کی غرض سے واش روم میں گھس گئی، سی گرین ٹر کا خوبصورت ساسوٹ پہلے سے وہاں لٹکا ہوا تھا، نہا کر وہ خود کو کافی تازہ دم محسوس کر رہی تھی، دوپٹہ کندھے پر لٹکاتے ہوئے اس نے بال خشک کیے اور پھر آئینے کے سامنے بیٹھ گئی، ہلکے ہلکے گیلے بال اس کے چہرے کے اطراف میں بکھرے تھے اور رات کے میک اپ کے اثرات چہرے پر کہیں کہیں باقی تھے بہر حال وہ سادگی میں بھی دانش کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔

وہ بالوں کو برش سے سنوارنے میں مگن تھی جب بالی سی چرچراہٹ سے دروازہ کھل گیا، اندر آنے والا اذن البصار تھا۔

وہ خاموشی سے آکر بیڈ پر بیٹھ گیا، کچھ اس طرح کہ آئینے میں انابت رفیم کو اس کا عکس نظر آ رہا تھا، بدلے ہوئے رشتے کو محسوس کر کے وہ نجائے کیوں گھبرانے لگی تھی۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ سرد

لہجے میں کہتا وہ اس کی سانسیں منجمد کر گیا تھا۔ وہ رخ موڑ کر اس کی طرف ہوئی، اب وہ عین اس کے سامنے تھی، اس نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھا کر دیکھ تو اسے اپنی طرف ہی متوجہ پایا، آنکھوں کے گرد پڑے ہلکے سے حلقے اور آنکھوں کی سرخی اس کے رت جگے کی داستان سنا رہے تھے، وہ بلیک اور آف وائٹ کنٹراسٹ کے پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا، اس نے دوسرے ہی لمحے نظروں کو جھکا دیا۔

”یہ شادی کن حالات میں ہوئی تم بخوبی سمجھتی ہو، میرے نزدیک تمہارے کیا خیالات۔“ تم ان سے بھی آگاہ ہوا درجہ لحاظ میں تمہیں بھی وہ مقام نہیں دے پاؤں گا جو تمہارا حق ہے، لیکن میں تمہیں قانونی تحفظ ضرور فراہم کروں گا، ہو سکتا ہے آگے چل کے مجھے اس رشتے میں کوئی کشش محسوس ہو لیکن فی الحال میرے لیے یہ ایک اضافی بوجھ ہے اور کچھ نہیں، میں چاہتا ہوں اگر تمہارے دماغ میں کچھ اس نئے تعلق کی وجہ سے امیدیں وابستہ ہیں تو تم مائنڈ میک اپ کر لو۔“ اجنبیت سے بھرپور لہجے میں وہ کہتا اس کے سارے خواب نوح کر لے گیا، اسے یقین تھا کہ اذن البصار اسے بے مراد نگاہی دامن ہی رکھے گا مگر انجانے کیوں درد کا احساس نیا تھا۔

اس کی نگاہوں نے بے ساختہ اٹھ کر اذن البصار کے برقعے تاثرات جانچے تھے، اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اس نے آنسو روکے کیے چاہے، وہ اس کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی مگر پھر بھی موتیوں نے راہ بنائی تھی۔

”اور پلیز اب بے کار میں رونا دھونا شروع مت کر دینا مجھے آنسوؤں سے بہت چڑھتی ہے اور تمہارے آنسو تو مجھے بالکل بھی متاثر نہیں کر پائیں گے۔“ اس کی بے زاری اپنے عروج پر تھی اور کسی کی نہ سننے والی انابت رفیم چپ چاپ اس

کی سن رہی تھی، اسے لگا تھا جیسے عمر بھر کی قید کا سودا ہوا ہے، درد کے دائرے نے وسعت پکڑی تھی، اس کے چہرے پر تبدیلی کا موسم آیا تھا، مگر اذن البصار کے پاس فرصت کہاں تھی اس گرتی پڑتی لڑکی کو سنبھالنے کی، بہت کوشش کے باوجود اس کے آنسو ٹھہر نہیں رہے تھے، وہ کل سہاگن ہوئی تھی اور اسے لگا تھا آج ہی اس کی تیج لٹ گئی ہو، اذن البصار اپنی بات مکمل کر کے رکھیں تھا، اپنے الفاظ کے سنگسار میں اسے لہولہا ہونے کے لئے تنہا چھوڑ گیا تھا۔

☆☆☆

یونہی شب و روز بے بسی اور کرب میں کٹنے لگے تھے، وہ اس کی دسترس میں ہونے کے باوجود اس سے میلوں فاصلے پر تھا، ارم اور رقیم حاشر اکثر انابت سے ملنے آتے رہتے، اس کی مسکراہٹ انہیں مطمئن کرنے کو کافی تھی، سب لوگ حقیقت سے بے خبر اذن البصار کے دھوکے میں جی رہے تھے، وہ اپنے پایا سے کیا عہد نبھا رہا تھا محض اپنا نام انابت رقیم کے ساتھ جوڑ کے زندگی یونہی چل رہی تھی کہ۔

اکلی صبح ایک اور ہنگامہ آرائی لیتے نمودار ہوئی، چوہدری کریم حاشر اپنے ساتھیوں سمیت البصار باؤس آدھمکے اور انابت رقیم کا مطالبہ کیا، البصار نیکی کا ملک کے بڑے ناموں میں سے ایک نام تھا، دوسرا وہ انابت رقیم پر قانونی حق رکھتے تھے لہذا چوہدری کریم حاشر کو خالی ہاتھ واپس جانا پڑا، چونکہ وہ نکاح سے لاعلم تھے، مگر ان کے غضب و غضب سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ خاموش نہیں رہیں گے، دوسری طرف ارم اور رقیم حاشر پر قہر کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، چوہدری کریم حاشر کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اور پھر وہ ہو گیا جس کا اذن البصار کو گمان

بھی نہیں گزرا تھا شہوار البصار کی گاڑی سروس کے لئے ورک شاپ گئی تھی، بے مجبوری انہیں اذن کی گاڑی استعمال کرنی پڑی اور کچھ ہی دیر بعد ان کی گاڑی پر قاتلانہ حملہ ہونے کی اطلاع ملی، دو گولیوں نے ان کے پیٹ کو نشانہ بنایا تھا جبکہ ایک گولی ٹانگ کو چھو کر نکل گئی، فوری طبی امداد کے لئے انہیں ہسپتال پہنچا دیا گیا، البصار باؤس کے مینوں کو یہ خبر سایہ دار حجر سے نکال کر چلائی دھوپ میں لے آئی، وہ آگے پیچھے گاڑیوں میں بہ غلت ہسپتال روانہ ہوئے تھے، اپنی بھگدڑ میں انہیں انابت رقیم کا بھی خیال نہ رہا، جو اوپر سکرے میں اذن البصار کے کپڑے پر پیس کر رہی تھی، نیچے لاؤنج سے موصول ہوئی آہ و بکا اور واہلا سن کر اس نے استری کا بلگ نکالا اور تیزی سے نیچے چلی آئی، مگر اس کے پہنچنے تک لاؤنج پر سکوت طاری ہو چکا تھا۔

”سب لوگ کہاں گئے ٹمبندے؟“ اس نے ملازمہ سے دریافت کیا اور پریشان حال ملازمہ سے جو اطلاع اسے سننے کو ملی وہ اس کے اوسان خطا کرنے کو کافی تھی، وہ ڈمگمگاتے ہوئے وہاں ڈھے سی گئی۔

”یہ سب کیا ہو گیا، آخر اور کتنے امتحان باقی تھے۔“ اس کا ننھا سادل سینے میں ہی چل کر رہ گیا۔

”اے میرے خالق پایا کو زندگی بخش دے اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں یہ دکھ ساری زندگی برداشت نہیں کر پاؤں گی میرا وجود تو ان کے احسانات کے زیر بار ہے میں ان کے احسانوں کا بوجھ برداشت کر سکتی ہوں مگر ان کے طنز و تشیع رویے کا بوجھ مجھ پر نہیں سہہ پاؤں گی۔“

اس کا وجود مٹی کے ڈھیر کی طرح ساکت تھا، لب خاموش تھے تو آنکھیں پتھر، لیکن دل دھڑک رہا تھا عجیب کرلا نہیں چا رہی تھیں، شہوار

البصار کی زندگی کے طویل ہونے کی دعائیں بھی مانگ رہا تھا، نجانے کتنے پہر وہ لاؤنج میں تنہا ساکت وصامت بیٹھی رہی۔

☆☆☆

”خدا پر بھروسہ رکھیں بھابھی! شہوار بھائی کو اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا۔“ آنسو بہائی ردا کو صبا نے سسلی دی۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ ان کے ہستے آنسوؤں نے اس دعا کے بچ ہو جانے کی دہائی دی، شہوار البصار کا فوری طور پر آپریشن کر کے گولیاں نکال دی گئیں تھیں لیکن ابھی تک وہ بے ہوش تھے اور ڈاکٹرز کے مطابق جب تک وہ ہوش میں نہیں آتے خطرہ برابر موجود تھا، انہیں آپریشن کے بعد آئی سی یوشفٹ کر دیا گیا تھا آئی سی یو کے باہر موجود تمام نفوس ان کی زندگی کے لئے دعا گو تھے ہونٹوں پر دعا کے الفاظ پھسل رہے تھے تو آنکھیں اشکبار تھیں۔

”یہ کیا ہو گیا یونان! پایا کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟“ اذن البصار بہت ضبط کے باوجود یونان کے سامنے ضبط ہار گیا تھا، یونان کا حال بھی تو کچھ مختلف نہ تھا لیکن اذن البصار، شہوار البصار سے بہت محبت کرتا تھا، بچپن سے لے کر آج تک وہ ان کا لاڈلا بیٹا رہا تھا، انہیں تکلیف میں دیکھ کر وہ جیسے خود درد سے مبتلا رہا تھا۔

”ہمت کرو اذن! تم پایا کا مان ہو، ان کا نفر ان کی ہمت ہو، تو ایسے ہی بہو کرو گے تو کیسے چلے گا، ماما کو ہمارے حوصلے کی ضرورت ہے، میرب کھٹک، کنزئی، چاچو، چاچی سب ہمارے ہمت و حوصلے سے امیدیں وابستہ کیے ہیں، ہمیں ان کا زور بازو بڑھانا ہے اذن۔“ وہ رسائیت سے اسے سمجھا رہا تھا لیکن یونان کی آنکھوں کا گھبراؤ کرنی سرخی اس کی گریہ و زاری کا ثبوت تھیں۔

”اس گاڑی میں، میں کیوں نہیں تھا یونان،

میں نے پایا کو کیوں جانے دیا خود چلا جاتا، ان کے حصے کے غم اپنے سینے میں ڈن کر لیتا، خود اپنی ذات پر یہ گولیاں سہہ جاتا۔“ اس کا دل جیسے ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا، وہ حال سے بے حال ہو رہا تھا۔

”ایسی باتیں مت کرو اذن، پایا کی صحت بانی کے لئے دعا کرو، قدرت کے امور میں ہمیں عمل دخل کا کوئی حق نہیں۔“ نوبان نے اسے محبت سے ڈنچا۔

”یہ سب انابت رقیم کے باعث ہے یونان، اس کے حصول کے لئے چوہدری کریم حاشر نے میری گاڑی پر حملہ کر دیا مگر وہاں میری بجائے پایا اس کی سفاک سوچ کا نشانہ بن گئے۔“ وہ ٹیکدم طیش میں آیا تھا۔

”تم کیوں اس معصوم کو اس سب کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہو؟“ نوبان جھنجھلایا۔

”تو پھر ہماری ان جائیدادوں سے کیا کوئی ذاتی خلش ہے، یہ سب اس کی وجہ سے ہے، میں اسے اپنے گھر میں رہنے ہی نہیں دوں گا میں اس کی خاطر اپنا آشیانہ اجڑنے نہیں دوں گا۔“ پہلی بار وہ ایسے لوگوں سے خوف زدہ ہوا تھا انہوں کی زندگی کیسے انسان کو کمزور بناتی ہے اس کا اندازہ اذن البصار کو اسی پل ہوا تھا۔

”بزدل مت بنو اذن! ہم ان کی بات کا منہ توڑ جواب دیں گے، ہم انہیں بے نقاب کر دیں گے ان کی سفاک سوچ کھلے عام ظاہر کر دیں گے۔“ نوبان نے نئی راہ دکھائی۔

”ہاں میں بزدل ہوں یونان، اپنے پایا کو موت کے قریب کھڑا دیکھ کر میں بزدل ہو گیا ہوں، اگر انابت رقیم کو بسانے کی قیمت میری زندگی ہوتی تو میں بخوشی یہ قیمت ادا کر دیتا، مگر اپنے پایا کو کھو کر میں یہ عہد نہیں نبھا سکتا، انابت رقیم کے تحفظ کے بدلے میں اتنا بھاری تاوان ادا

نہیں کر سکتا۔“ وہ چیخ اٹھا تھا اس کے اعصاب
تھکنے لگے تھے، شہوار البصار اس کی کمزوری تھے اس
کا خاندان اس کی کمزوری تھا اور وہ بری طرح
تڑپ رہا تھا۔

”اگر پاپا کو کچھ ہو گیا تو میں بھی نہیں جی
سکوں گا۔“ وہ بے بسی کی انتہا پر تھا۔
”مائی کی باتیں مت کرو اذن، پاپا ہمیشہ
ہمارے ساتھ رہیں گے۔“ نوایان البصار نے
اسے مستحکم آواز میں یقین دلایا۔

☆☆☆

تقریباً بارہ بجے صبا کو انابت رقیم کا خیال آیا
تھا کہ وہ البصار ہاؤس میں تنہا تھی، اپنی انفرادی
میں وہ اس کی موجودگی بالکل فراموش کر گئے تھے،
صبا چاہتی تھی کہ کنزئی، میرب اور کھنک کچھ
دیر کے لئے گھر چلے جائیں مگر وہ بس سے مس نہ
ہوئے، لہذا انہوں نے اذن البصار کو انابت کے
پاس جانے کو کہا۔

”میں بابا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“ وہ
ٹپیلے پن سے بولا۔

”سمجھا کرو اذن وہ تمہاری بیوی ہے، اس
کے حقوق کا خیال تمہیں ہی رکھنا ہے، وہ نہ جانے
کب سے گھر میں آئیں گی ہے تھوڑی دیر کے لئے
اس کے پاس چلے جاؤ کچھ ہی دیر میں، میں کنزئی
اور نوایان کو بھیج دوں گی پھر تم دونوں آ جاؤ۔“

انابت رقیم کے ذکر پر اس کے ہیکھے چتون
مزید تن گئے اور دل میں بدگمانی کے بادل مزید
گہرے ہوئے تھے، صبانے بہت مشکل سے سمجھا
بجھا کر اسے گھر روانہ کیا ورنہ وہ تو ایک لمحے کے
لئے بھی آئی سی یو کے دروازے سے ہٹنے کو تیار
نہیں تھا۔

☆☆☆

جب وہ البصار ہاؤس پہنچا تو انابت رقیم
دائیں بائیں لاونچ میں مسلسل چکر کاٹ رہی تھی،

اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور سستا ہوا چہرہ اس
کے مسلسل جاگنے اور رونے کی گواہی دے رہا تھا،
اسے دیکھتے ہی اذن البصار کا دل چاہا تھا کہ لمحہ کی
تاخیر کے بغیر فساد کی اس جڑ کو گھر کی دہلیز سے
نکال باہر کرے۔

اذن البصار پر نظر پڑتے ہی وہ دیوانہ وار
اس کی طرف لپکی۔

”پاپا کیسے ہیں اب؟“ ارم اور شہوار البصار
کے بہت اصرار پر اس نے انہیں اذن ہی کی
طرح مئی، پاپا کہنا شروع کر دیا تھا۔

”آپ نے مجھے کچھ بتایا بھی نہیں کب سے
آپ کو کال کر رہی ہوں آپ نے میری کال بھی
ریسوبھی نہیں کی معلوم ہے میں کتنا پریشان ہو رہی
ہوں مجھے ساتھ بھی نہیں لے کر گئے۔“ اس کی
موجودگی کو فراموش کیے وہ یوں تیزی سے
سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا جیسے اس کے علاوہ دوسرا
کوئی نفس موجود نہ ہو، وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے
تیز تیز بولتی ہوئی بوختی جا رہی تھی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے؟ پاپا
کیسے ہیں اب؟“ اس کی مسلسل خاموشی سے جھلا
کر اس نے تن کر اس کے سامنے آکر پوچھا۔

”کیا بتاؤں تمہیں، بولو یہ کہ تمہاری وجہ سے
پاپا زندگی اور موت کے مابین جھول رہے ہیں وہ
مجھ سے بات نہیں کر رہے انابت ان کی آنکھیں
بند ہیں تو سانسیں مدھم مدھم وہ اپنے بیٹے، بیوی، اپنے
بھائی کسی کے احساس کو محسوس نہیں کر رہے وہ
ہماری پکار نہیں سن رہے۔“ اس نے ایک لمحے
میں ضبط کھویا تھا، وہ شیر کی طرح دھاڑا تھا،
انابت رقیم اس کا اضطراب سمجھنے کے باوجود ڈر سی
گئی وہ مڑ ہاتھوں پر گرا کر کنپٹیاں مسلنے لگا تھا۔

”پاپا ٹھیک ہو جائیں گے، مجھے اپنی دعاؤں
پر یقین ہے۔“ اس نے اذن البصار کو تسلی دینے
کے لئے اپنا خرطی ہاتھ اس کے شانے پر رکھا

ہے اس نے زور دار جھٹکے سے پیچھے کیا، انابت
ریم گرتے گرتے پئی۔

”تمہاری تسلی و تسنی کے الفاظ میرے لئے
کوئی اہمیت نہیں رکھتے، میرے پاپا کو اس حال
تک پہنچانے والی تم ہو، اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں
تمہیں بھی معاف نہیں کروں گا۔“ وہ اس کے
کان کے پاس ہنسنے لگا، انابت رقیم سہم سی گئی، اس
کی نگاہوں سے چھٹکتی بے گانگی اسے ڈر رہی تھی۔
”میں پاپا کی زندگی کے لئے دعا کروں گی،
چاہے آپ کو ضرورت ہو یا نہ ہو۔“ انابت رقیم کی
پلکیں جھپکنے لگی تھیں اذن البصار کا اجنبی رویہ اسکی
برداشت سے باہر تھا۔

”کیوں کرو گی تم دعا؟“ اسے جیسے
اختلاف ہوا، وہ ایک دم آگے بڑھا اور انابت
رقیم ایک قدم پیچھے۔

”میں ان سے محبت کرتی ہوں جیسی میں
اپنے پاپا سے کرتی ہوں۔“

”محبت تو تم مجھ سے بھی کرتی تھیں، کچھ
عرصہ پہلے تم مجھ سے محبت کی دعویٰ کرتی تھیں۔“ وہ
زہر خند کچھ میں بولا، وہ دھیرے دھیرے آگے
بڑھ رہا تھا اور انابت رقیم ہولے ہولے پیچھے،
اچانک اس کے قدم ٹھم گئے تھے اس کے عقب
میں دیوار نے رکاوٹ ڈال دی تھی وہ پوری طرح
دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی، مگر اذن البصار کے
قدموں کی پیش قدمی جاری تھی، فاصلہ کم ہونے
لگا تھا، قدموں کی دوری سمٹنے لگی تھی، اس نے اگلی
آنے والی ساعت دیکھنے سے قبل ہی آنکھیں
موند لیں۔

”بولو۔“ اس کی بازگشت پر اسرار سنائے
میں ابھری تو اس نے نگاہیں داکیں۔

”میں تو اب بھی آپ سے محبت کی دعویٰ دار
ہوں۔“ اس نے بے بسی سے اعتراف کیا، اذن
البصار استہزائیہ ہنسا۔

”کیسی محبت؟“ اس کی تیز نگاہیں انابت
رقیم کے وجود پر بھی تھیں جو ہولے ہولے تھرتھرا
رہا تھا، اس کی نگاہوں کے شعلے انابت رقیم کو جلا
کر خاکستر کر دینا چاہتے تھے، نجائے کیوں اذن
البصار آج اسے بہت اجنبی لگ رہا تھا، رات کی
پراسراریت اور اذن البصار کے بدلے اطوار،
دونوں مل کر اس کے حواس محل کر رہے تھے۔

”میں آپ کی خوشی چاہتی ہوں اور کوئی
تشریح نہیں ہے محبت کی میرے پاس۔“ اس کی
آواز سرگوشیوں میں ڈھلنے لگی تھی۔

”میری خوشی؟“ اس نے سوالیہ انداز اپنایا
اور اپنے مابین ایک قدم کا فاصلہ بھی ختم کر دیا،
اس نے دونوں ہاتھ دائیں بائیں دیوار پر اس
کے شانوں کے اوپر یوں جمائے کہ اس کے ہاتھ،
انابت رقیم کے کانوں کی لوڈ نہیں چھونے لگے
تھے، ان کے درمیان دو انچ کا فاصلہ تھا، جو وہ
دانتہ جھوٹ گیا اس کے سانسوں کی گرمی انابت
رقیم کو اپنے چہرے پر بڑی واضح محسوس ہوئی تھی،
اس کی بے پناہ قربت پر وہ موم کی طرح پکھلنے لگی
تھی، اسے اپنا وجود نجائے کیوں جلتا محسوس ہوا
تھا۔

”میری خوشی اسی میں ہے کہ تم ہماری زندگی
سے کہیں دور چلی جاؤ، اذن البصار کے دل و دماغ
میں کسی انابت رقیم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔“ اس
کا کمبیر آواز میں کہا گیا اگلا مطالبہ اس کی روح
قبض کرنے کو کافی تھا، ایک لمحے میں وہ اس کی
شخصیت کے سحر اور قربت کے احساس سے آزاد
ہوئی تھی، بہت بے یقین نگاہوں سے اس نے
اذن البصار کو دیکھا تھا جس کی آنکھوں کی جوت
میں نفرت کی لپک تھی، چہرے کے تاثرات میں
نا پسندیدگی کی چھاپ بھی اور دیوار پر جتے ہاتھوں
میں اسے ختم کر دینے کی سختی تھی۔

”ایسا ظلم مت کریں، میں آپ سے دور

نہیں رہ سکتی۔“ نگاہیں نیچی رکھتے ہوئے اس نے گویا فریاد کی، آنسوؤں نے آنکھیں دھندلا دی تھیں۔

”بس کرو انابت، یہ جھوٹے آنسوؤں اور دعوے کسی اور کو دکھانا۔“ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا تھا، انابت رقیم کے آس پاس اس شخص کے احساس سے جلتی آگ بھیجی تھی، اس نے سراٹھا کر دیکھا وہ دور جا چکا تھا، ابھی نہیں وہ تو ہمیشہ سے ہی اس سے دور تھا، اس کی دسترس سے دور، ناقابل رسائی۔

”اگر میں یہاں سے چلی جاؤں تو آپ میرے جذباتوں کی بایزگی اور سچائی پر ایمان نہ آئیں گے۔“ وہ ایک بار پھر قسمت آزمایا ہی تھی نگاہوں میں امید دیاس کے دیے جل رہے تھے، بہتے آنسوؤں سمیت وہ اس کے سامنے تھی اذن البصار اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا، اس کی متورم آنکھیں اور تھکے تھکے ٹھٹھال وجود کو بہت غور سے دیکھا۔

”ٹھیک ہے اگر آپ کا یہی تقاضا ہے تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی مجھے آپ کی خوشی کے لئے جدائی کا یہ سودا منظور ہے۔“ تکلیف آنسوؤں کے درمیان یہ الفاظ کیسے اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے یہ صرف انابت رقیم جانتی تھی، دھڑکنوں میں عجیب اشتعال برپا تھا تو دل میں ایک لاشعوری پکڑ دھکڑ چلی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا اس کا موبائل بیل کرنے لگا تھا۔

”ہاں بولونویان..... کیا..... تم سچ کہہ رہے ہو، پاپا کو ہوش آگیا، میں آ رہا ہوں، میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ وہ خوشی سے لبریز لہجے میں بولا، وہ جیسے اک پل میں ہر شے بھول بیٹھا تھا، اس کے ہر انداز سے بے پناہ خوشی چھلک رہی تھی، اسے جیسے مفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی، وہ

بہت پر جوش انداز میں باہر نکل گیا، وہ ایک بار پھر اسے فراموش کر گیا تھا، اب کی بار اسے انابت رقیم کی دلہیز پر واپس نہیں آنا تھا، وہ اسے داغی الوداع کہہ گیا تھا، اس کا اندازہ انابت رقیم اپنے اندر کر لاتے ہیں کون کر ہوا تھا، وہ شکست خوردہ سی کارپٹ پر بیٹھتی چلی گئی۔

☆☆☆

چند دنوں بعد شہوار البصار کے ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا، ارم اور رقیم حاشر بلا ناغانہ ان کی مزاج پرسی کے لئے آتے تھے، جس دن شہوار البصار گھر آئے اسی دن اس نے رقیم حاشر کے ساتھ گھر جانے کا عندیہ بنا دیا۔

اتنے غیر متوقع فیصلے پر تمام چھلہ افراہم ارجاز تھے، حالات کی پیچیدگی وہ بخوبی جانتی تھی، وہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے سب کو یہ بتا دیا کہ وہ سبھی واپس نہ آنے کے لئے جارہی ہے تو کسی نہ کسی طرح تاویل، دلیل یا دہائی ضرور اس کے قدم روک لے گی۔

”اس گھر کو تمہاری ضرورت ہے۔“ ردا نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے روکنا چاہا، ان حالات میں انابت کا جانا انہیں بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ”میں جلدی واپس آ جاؤں گی ماما.....“ پلہیز مجھے اجازت دے دیں۔“ اس کا رخ اس شہوار البصار کی طرف تھا، انہوں نے شفقت اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”جانے دیں ردا، انا بیٹی جلد ہی لوٹ آئیں گی، آپ میری وجہ سے ہچکچا رہی ہیں تو خیال چھوڑ دیں، اس گھر میں بہت سے لوگ ہر میری دیکھ بھال کے لئے، اب تو ویسے بھی میں بھلا چکا ہو گیا ہوں۔“ ان کے الفاظ پر انابت رقیم کو اپنا آپ جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اندام کے بوجھ تلے اس کا وجود جھٹکا جا رہا تھا۔ ”پاپا آپ کو میرے ارادوں کی کیا خبر

آپ کے بیٹے سے کیا وعدہ بھی مجھے پورا کرنا ہے۔“

اسے اذن البصار کی الفت میں اپنا گھر اور رشتے سب سے دستبردار ہونا پڑ رہا تھا، فردا فردا سب سے مل کر وہ اذن البصار کے سامنے جا کھڑی ہوئی جو رقیم حاشر سے بغل گیر ہو چکا تھا، آخری بار وہ اس کا نقش نقش چرا لینا چاہتی تھی اس نے بہت لاچار اور تشنہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر پل بھر میں لڑکھڑاتے قدموں اور کر لاتے دل کی دہائیاں دہانی اذن البصار کے اشیانے کو الوداع کہہ گئی اور کچھ دن کا کہہ کر جانے والی انابت واپس کا راستہ بھول گئی، اس نے اذن البصار کے ساتھ رہنے سے معذوری ظاہر کر دی، اس کے مطالبے پر البصار ہاؤس کے ملین حق دق رہ گئے، مگر وہ طلاق لینے کے موقف پر بدستور قائم تھی۔

شہوار البصار اسے خود لینے گئے تھے مگر اس نے بہت کٹھور پن سے انکار کر دیا اور توہ تہی داماں لوٹ آئے۔

چوہدری کریم حاشر کو یہی گمان گزرا تھا کہ ان کے عیض و غضب سے ڈر کر چوہدری رقیم حاشر نے انابت رقیم کو واپس بلوایا ہے، مگر وہ اپنی بیٹی کے سامنے مجبور تھے، لہذا چوہدری کریم حاشر کزشتہ ایک برس سے طلاق پر زور دے رہے تھے مگر چوہدری رقیم حاشر ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے کہ شاید ان کی بیٹی کی ضد ٹوٹ جائے، ایک طرف چوہدری کریم حاشر کا صبر جواب دے گیا تھا تو دوسری طرف انابت رقیم اپنا فیصلہ بدلنے پر راضی نہیں تھی۔

☆☆☆

”طلاق یافتہ انابت بی بی نہ سہی، بیوہ تو ہم لے ہی جائیں گے۔“ چوہدری کریم حاشر کے بے حس الفاظ اس کے وجود سے جیسے ہر احساس

جھٹکنے لگے تھے، وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی، ایک بے بس کرتا خوف اسے اپنے حصار میں جکڑ رہا تھا، چوہدری کریم حاشر نے شخص دھمکی نہیں دی تھی اذن الفاظ اور ارادوں میں چٹانوں کی سی مضبوطی تھی انہوں نے کہا تھا تو وہ یہ سب کہ گزر رہے گے، جس کا عملی مظاہرہ وہ ایک سال قبل دیکھ چکی تھی۔

”کیوں لوگ چاہتے ہیں کہ آپ کا نام بھی میرے ساتھ نہ ہے۔“ اس کی محبت نے بہت دکھ سے آرزو کی تھی۔

”جب آپ کے بغیر رہنا ہی ہے تو نام سے کیا ہوتا ہے، آپ کی زندگی کے عوض مجھے یہ سودا بھی کرنا ہی پڑے گا اور آپ کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا، انابت رقیم آپ کے بغیر جیئے یا آپ کی یادوں کے بھنور میں ڈوب کر مر جائے آپ کی تو اول روز سے یہی خواہش رہی ہے۔“

وہ اس کی محبت اور چاہت کی شدت سے نا واقف تو نہ تھا، اس کی دیوانگی سے خوب باخبر تھا۔

تمہاری یاد کی خوشبو مجھے رونے نہیں دیتی کسی درد بھرے گیت کی صورت اداسی پھیل جاتی ہے۔

تمہاری یاد شام گم میں۔ آنسوؤں کے گلے لگ کر

پہروں بیٹھی رہتی ہے سانسوں میں جمی درد کی صورت

بوسیدہ ڈائری میں سجے اجنبی لفظ ادھوری رات کا پورا چاند

تیری یاد کے بستر پر تجھے سونے نہیں دیتا پلوں پہ سجے نوخیز خواب

بے سنے انتظار میں گم آنکھیں تیری ہی کونج میں رہتی ہیں

اڑتے بادلوں کے سینے میں بیٹکی ہوئی سوچیں

ہر طرف پھیلی ہوئی
اپنے ہی خول میں مٹی ہوئی
انتظار کی گرد میں لپٹی ہوئی
مدھم تصویریں
میں چاہوں بھی تو مجھے
کھوئے نہیں دیتی
صدیوں سے جاتے لے
چپکے سے کہتے ہیں میرے کان میں آکر
بدلتے موسموں میں
انتظار کی اس شدت سے
کوئی بے خبر تو نہیں

☆☆☆

”رقیم نے طلاق کے پیپر زبجوائے ہیں انا
خلع چاہتی ہے، وہ واپس آنے کے لئے تیار
نہیں۔“ شہوار ابصار نے قدرے بچھے ہوئے
لہجے میں اطلاع فراہم کی، اذن ابصار کا پانی کی
طرف بڑھتا ہاتھ ایک ساعت کے لئے ساکت
ہوا تھا، اس کی ضد سے وہ بے خبر تو نہ تھا، اسے
معلوم تھا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئے گا، اس نے
خود انابت رقیم کو اپنی زندگی سے بے دخل ہونے
کو کہا تھا اور اس کی چاہت کی سچائی اور جذبات
کی صداقت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ
اس کے ایک بار کہنے سے اپنی محبت کے پھولوں
کو اپنے ہی قدموں تلے مٹاتی، اپنے خوابوں کی
عمارت کو اپنے قدموں تلے چکاتی، اس کی زیست
کے اور اق سے اپنا ذکر مٹا گئی تھی۔

وہ خود ایسے ہی حالات کا متنی تھا، وہ چاہتا
تھا کہ انابت رقیم سے اس کا تعلق باقی نہ رہے تو
پھر در کس بات کی تھی، تو اپنی ہی خواہش پر عمل
درآمد کرنے میں اسے کیوں ایک سال کا عرصہ
بیت گیا، وہ چاہے کہ کبھی اسے اپنی زندگی سے خارج
نہیں کر پایا تھا، آخر وہ کس چیز سے بھاگ رہا
تھا۔

”اذن بیٹا، میں نے کچھ پوچھا ہے؟“
اسے گم سم دیکھ کر شہوار ابصار نے گویا یاد دہانی
کروائی۔

”جی پاپا، کیا کہا آپ نے؟“ اس نے
گڑبڑا کر دوبارہ پوچھا۔
”تم طلاق کے پیپر زبجوائے کر دوتا کہ میں
واپس بججوا سکوں۔“ اس کی کھوئی کھوئی کیفیت
بھانپ کر شہوار ابصار نے کھلے لفظوں میں بات
کی۔

”جی بابا میں کر دوں گا۔“

وہ بدقت تمام کہتا جلدی سے اپنی نشست
چھوڑ گیا، اس نے افطاری سے بھی ہاتھ کھینچ لیا
تھا، وہ گاڑی نکال کر بے مقصد سڑکوں پر کھوئے
لگا تھا، مگر اضطراب تھا کہ پھیلتا ہی جا رہا تھا دردتھا
کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، سب کچھ حسب منشاء تھا تو
میرے پھر یہ بے فکری کیوں؟ وہ خود سمجھنے سے قاصر
تھا، نجانے کتنی دیر وہ بے قرار سڑکیں ٹاپتا رہا،
تھک کر اس نے قدرے سنسان کنارے پر
گاڑی روک دی اور سیٹ سے سر نکال دیا۔

کچھ ہی دیر بعد سیٹ کی مخصوص نون بجنے لگی
تھی اس نے اکتا کر سیٹ نون دیکھا، نمبر غیر شناسا
تھا کسی مصلحت کے زیر اثر اس نے کال ریسیو کر
لی۔

”ہیلو۔“ وہ بیزار سی گویا ہوا، دوسری
طرف گہری خاموشی تھی، وہ اکتا کر کال ڈسکنکٹ
کرنے والا تھا جب اچانک اس کے دماغ میں
جھماکا سا ہوا، وہ حیران سا سیدھا ہوا، لمحوں میں
دل نے دوسری طرف انابت رقیم کے ہونے کی
گواہی دی۔

”انا پلیز انا بولو یہ تم ہونا۔“ وہ تصدیق کے
لئے مچل اٹھا، اس کی آنکھیں سرخی پائل ہو رہی
تھیں، ضبط کی طنابیں گویا چھوٹنے کو تھیں دوسری
طرف سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی صدا میں بلند

ہونے لگی تھیں۔

وہ بولنے کا قصد کر رہی تھی مگر آواز حلق میں
ہی دم توڑ گئی اذن ابصار کی آواز میں بے تابیاں
بڑھنے لگی تھیں، چند لمحے اسے پکارنے کے بعد وہ
خاموش ہو گیا تھا، وہ بہت غور سے اس کی ڈھنکی
ابھرتی سانسوں کے زیر و بم کو محسوس کرنے لگا تھا،
اس کی آواز کی شکل اختیار کرتی سسکیوں کو کسی رس
کی طرح کانوں میں اٹھیلنے لگا تھا، دل پر جیسے
سکون کا بادل منڈلانے لگا، ایک دم ہی اس کو
قرار آیا تھا، بے چینیوں کو راحت ملی تھی، وہ چپ
چاپ موبائل کان سے لگائے پورے ایک سال
بعد اپنی منکوحہ کے احساس کو محسوس کر رہا تھا۔

”پلیز مجھے طلاق دے دیں۔“ بچیوں کے
مابین اس نے بہت ہمت جمع کر کے کہا، اس کی
آواز نے اذن ابصار کے اطمینان میں ہلچل مچا
دی تھی، اس کے لہجے میں ایسا درد تھا اذن ابصار
ترپ کر رہ گیا، اس کا اندر تک چھلنی ہو گیا، اس
کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے کال کاٹ
دی، شاید یہ ضبط کی تاب نہ لے سکی اس میں۔

اذن ابصار کتنی ہی دیر خالی خالی نگاہوں
سے موبائل کی جگہ گالی اسکرین دیکھتا رہا، چو بات
اسے گزشتہ ایک برس میں سمجھ نہیں آئی تھی، وہ
بات انابت رقیم کی ایک سسکی سمجھا گئی تھی، تمام
ٹھٹھیاں سلجھ گئی تھیں راستے شفاف تھے، اذن
ابصار کو بس قدم بڑھانا تھے۔

کتنی عجیب بات تھی کہ حیا اس کے چشم
تصور، اس کی سوچ کے دائرے، ذہن کے
پردے دل کی دھڑکن میں کہیں بھی نہیں تھا، وہ
کہیں نہیں بھی پہلے نہ اب۔

☆☆☆

”تم نے سائن کر دیئے؟“ شہوار ابصار نے
اگلے جملہ ادا کیا۔

”نہیں۔“ اس نے کہا اور پلیٹ پر جھک

گیا۔

”میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔“ اس نے
پر سکون انداز میں اطلاع دی۔
”مگر آنا آنے کے لئے راضی نہیں۔“ شہوار
ابصار لہجے۔

”وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں، آپ بس کل جا
کر اپنی بہو کو لے آئیں۔“ اس نے ہلکے ہلکے
لہجے میں کہا جیسے سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہو۔
”اگر اس نے آنے سے دوبارہ انکار کر دیا
تو تمہارے پاپا کو مایوس لوٹنا پڑے گا۔“ شہوار
ابصار کے بجائے روانے کہا، ان کی آواز میں
پہلے بھر بے بول رہے تھے، خدشات بھی تھے اور
واہے بھی۔

”میں نے کہا نا مما..... انشا اللہ اب ایسا
نہیں ہو گا۔“ وہ بریقین انداز میں بولا۔

تین دن بعد جاندرات تھی اور پھر عید، اس
کے پاس دقت بہت کم تھا، اس نے فون کر کے
تمام صورت حال رقیم حاشر کو سمجھا دی تھی کہ
انابت رقیم کو ہر صورت شہوار ابصار کے ساتھ
رخصت کیا جائے۔

بانی چوہدری کریم حاشر کا وہ مکمل طور پر
ہندو بست کر چکا تھا قانونی طور پر بھی اور اپنے طور
پر بھی اور انابت شہوار ابصار کو ایک بار پھر اپنے گھر
دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی ان کے روبرو انکار کرنے
کی ہمت اس میں بانی نہ تھی وہ اگلے قدموں
واپس لوٹ آئی۔

”اپنے باپ کی عزت کی لاج رکھ لو انا
بیٹی۔“ رقیم حاشر کے یہ الفاظ اسے ندامت سے
چور کر گئے، وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی، اس کی
ذات کی بقاء کے لئے اس کو دکھ کی پر چھائیاں
سے بچانے کے لئے اس کے والدین نے کیا کیا
نہ کیا تھا بولے میں اس نے انہیں اذیت کے اور
کچھ بھی تو نہیں دیا تھا، مگر وہ یہ اذیت دینے پر بھی

مجبور تھی، اس کے باپ کو اس کی وجہ سے نجانے کس کس کے سامنے سر جھکانا پڑا تھا اور کن کن حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”میں ساری زندگی تمہاری ٹھوکروں میں گزارنے کو تیار ہوا ذن البصار مگر اس پل میں اپنے باپ کو نامراد نہیں سمجھ سکتی ایک دفعہ اپنے باپ کی بات مان کر تم نے مجھے اپنا یا تو آج اپنے باپا کی بات مان کر میں خود سے اور تم سے کیا عہد توڑ رہی ہوں۔“

”تمہارے نام کا تو مطلب ہی عاجزی ہے تو پھر یہ اگر کس لئے انابت بی بی، جاؤ خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دو کسی اچھے کی امید مت رکھنا۔“ اس نے بے حسی سے سوچا۔

”پاپا! میں آپ کی لاج ہوں تو میں آپ کی لاج ضرور رکھوں گی۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں واپس آری ہوں اذن البصار پہلے سے بھی زیادہ ذلت اور رسوائی سہنے کے لئے۔“

اس کا دل درد سے پھینچا جا رہا تھا، عجیب توڑ پھوڑ مچی تھی، گزرے زخم پھر تازہ ہونے لگے تھے، وہ تہوار البصار کے ساتھ البصار ہاؤس روانہ ہونے کو تھی جب چوہدری کریم حاشر کے زبردست ایکسٹنٹ نے ان کے حواس مائل کر دیئے، وہ سب اٹے قدموں ہسپتال پہنچے تھے، چوہدری کریم حاشر کی ریڑھ کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

عجیب لاچارگی اور بے بسی کی زندگی شروع ہونے والی تھی کریم حاشر، ارم اور انابت کی تڑپ دیکھ کر وہ نادم ہوئے جارہے تھے، خدا کی بے آواز لاٹھی کا مطلب انہیں سمجھ آنے لگا تھا۔

صدیوں سے جو سلوک انہوں نے اس معصوم مخلوق کے ساتھ روا رکھا، وہ بد دعاؤں کی صورت میں ان کے آس پاس گونجنے لگا تھا۔

احساس ایک ایسی دولت ہے جو اس سے سرفراز ہو جائے، وہ محبتوں کا پجاری بن جاتا ہے اور جس سے وہ خدا کے بزرگ و برتر چھن لے وہ تمام عمر تڑپتا ہے۔

چوہدری کریم حاشر بھی اپنی نا انصافی اور دکھ کی تقسیم بھانپ گئے تھے، انہوں نے ہاتھ پھیلا کر انابت رقیم سے معافی طلب کی، اپنے گلیے پر وہ پچھتاوا محسوس کر رہے تھے گو کہ اذن البصار تمام بندوبست کر چکا تھا مگر اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی، کہ خدا سب سے بڑا کار ساز ہے قدرت نے تمام گنجگ کھول دیئے تھے، راستوں کے ساتھ دل بھی صاف ہو چلے تھے اور جو کام قدرت الہی کرے وہ زیادہ بہتر اور حکمت سے بھرا ہوتا ہے انابت رقیم چاند رات کو البصار ہاؤس کے کینوں اور چوہدری کریم حاشر کے بہت اصرار پر ان کی دعاؤں اور رضا تلے رخصت ہو کر پورے ایک سال بعد اپنے حقیقی مسکن کو لوٹ آئی۔

چوہدری کریم حاشر اپنی زندگی میں اسے خوش باش دیکھنا چاہتے تھے بقول ان کے اسے خوش دیکھ کر وہ تجھیں کے کہ ان گناہوں کی کچھ حد تک تلافی ہوگئی ہے، وہ البصار ہاؤس آچکی تھی، جہاں ایک اور محاذ اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆
”دیکھو پچھلے سال بھی میں نے ہی تمہارے ہاتھوں پر مہندی لگائی تھی اور اس سال بھی میں ہی لگا رہی ہوں۔“ کنزئی نے اسے یاد دلایا تو وہ خوبصورت یاد تازہ بن کر اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

البصار ہاؤس میں اس کا بہت پر جوش استقبال کیا گیا تھا تمام افراد نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، جگمگاتے چہرے اس کی آمد پر خوشی کی مہر ثبت کر رہے تھے، سب لوگ اپنی اپنی جگہ مطمئن

تھے بے کل تھی محض انابت رقیم کی ذات جو کسی صورت اذن البصار کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اس کا دل اس کے سامنے کا سوچ کر اچھی سے گھبرانے لگا تھا۔

اگلا دن عید کا تھا، مسرتوں اور چاہتوں سے لبریز، خوشیوں اور راحتوں کی خوشبوؤں میں گندھا، سارا دن مصروفیت کی نذر ہو گیا، مہمانوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، وہ صبح سے کنزئی کے ساتھ کچن میں مصروف تھی، ادھر ادھر بے تکلف سی حکم چلائی، بھانگی پوڑنی وہ برسوں سے اسی گھر کی مین لگ رہی تھی، عشاء کی نماز کی ادائیگی کے لئے اپنے کمرے میں آئی تھی صد شکر کہ اذن البصار باہر اپنے دوستوں کے ساتھ مصروف تھا، اس نے جلدی جلدی نماز ادا کی اور ایک بار پھر کچن کا رخ کیا، یہی بہترین پناہ گاہ تھی۔

”تم میری شادی پر نہیں آئی نا۔“ کنزئی نے مصنوعی حلقی سے اسے ٹھوڑا۔

”تم رک جاتیں نا آخر تو میں نے آنا ہی تھا، لیکن تمہیں تو خود نویان بھائی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔“ اس نے بھی برابر جواب دیا تھا تو کنزئی شکوہ کر کے گھبرا گئی۔

”بہت منہ پھٹ ہوگئی ہوا، ابھی اذن البصار کو بھیجتی ہوں کہ سنبھالیں اپنی بیوی کو۔“ برتن کینٹ میں رکھتے ہوئے اس نے دھمکی دی تو انابت رقیم کے مسکراتے لب خود بخود سکڑ گئے۔

تاریکی بڑھتی جا رہی تھی وقت سرگتا جا رہا تھا، مگر وہ کمرے میں جانے کے احساس سے ہی گھبرا رہی تھی جہاں اذن البصار کی موجودگی یقینی تھی، کنزئی کو اس نے زبردستی کچن سے رخصت کیا اس وعدے کے ساتھ وہ بھی جلد ہی اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔

”ایک کب جائے کنزئی۔“ اذن البصار نے کچن میں جھانک کر کہا تو کنزئی کی جگہ انابت

رقیم کو یا کر خفیف سا ہو گیا۔

”چلو تم ہی لے آؤ۔“ حکم صادر کرتے ہوئے وہ چلتا بنا، میز حیاں چڑھتے ہوئے کنزئی اسے مل گئی۔

”کچھ خیال کرو کنزئی، نئی نویلی لہن کو صبح سے کام پر لگایا ہوا ہے۔“

”نئی نویلی نہیں ہے اذن بھائی، ایک سال برانی ہے، لیکن کیا کریں آپ کو تو ہر منٹ ہر لمحہ خترم نئی ہی لگیں گی۔“ اس نے معنی خیزی سے کہا تو اذن البصار مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا، اذن البصار کے حکم پر انابت رقیم کھس کر رہ گئی۔

”اتنی رات کو جانے کی کیا طلب۔“ اس نے تپ کر سوچا، تمام لوگ سونے کے لئے جا چکے تھے، ملازم اپنے کوارٹرز میں تھے، کوئی ذی نفس نہ تھا جس کے ہاتھ وہ چائے بھجوانی، جلتی کرہتی وہ خود ہی چائے بنا کر اوپر تک چلی آئی، مگر اندر جانے کے خیال سے ہی اسے جھرجھری سی آگئی، بہر حال بو جھل قدموں سے اس نے خود کو گھسیٹ کر اندر جانے پر آمادہ کیا۔

وہ فیرس پر رضا کی ٹھنڈک سے ٹوٹ گئی تھا، اس کی موجودگی کا احساس کر کے مڑا، اس نے خاموشی سے چائے پیش کر دی، اس نے ٹرے سے کب اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

”میرا میٹ خراب ہو گیا ہے یا تمہارے ہاتھوں میں ذائقہ آ گیا ہے۔“ اس کی آواز نے انابت رقیم کے واپسی کے لئے مڑتے قدم روک دیئے وہ کمرے میں آچکا تھا اور مصنوعی حیرت سے پوچھ رہا تھا، جواباً وہ لب پکیتی رہی۔

”چائے بہت اچھی بنی ہے۔“ وہ تعریف کر رہا تھا اس کا انداز دوستانہ نہیں تھا تو بھڑکیا بھی نہ تھا، اس نے چائے سائینڈ ٹیبل پر رکھی اور بھرپور انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوا، آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس سے انابت رقیم بھاگ رہی تھی، اسے

لگا تھا وہ بھی ذلیل کر کے اسے اس کمرے سے باہر نکال دے گا، مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے انابت رقیم کا پایاں ہاتھ تھام لیا، اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”اے کیا دیکھ رہی ہو، شرعی اور قانونی دونوں حق محفوظ رکھتا ہوں۔“ اس نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اوہ تو اذن البصار سمجھوتہ کرنے پر راضی ہو گئے ہیں، ایک بار پھر اپنے اور میرے خاندان کی خاطر۔“ ایک سوچ رخصت ہوئی تو فوراً دوسری نے جگہ بنائی۔

”میں آپ کو سمجھوتے پر مجبور نہیں کروں گی، آپ مجھے اب کی بار اضافی بوجھ مت سمجھیں۔“ اس نے دو نوک انداز میں کہا، نا چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز میں نمی ٹھل گئی۔

”تمہیں لگتا ہے کہ یہ سمجھوتہ ہے؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھا اور ایک قدم آگے بڑھایا، اذن البصار نے بہت اچانک اس کا ہاتھ چھوڑ دیا، اس نے خوف زدہ انداز میں اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ ”تو کیا واقعی ہی سمجھوتہ ہے؟“ وہ خود حیران تھی۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ مزید گویا ہوئی۔

”پیار بھی تو ہو سکتا ہے۔“ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں ہو سکتا ہے۔“ اس نے اتفاق کیا۔ ”لیکن میرے لئے انہیں حیاء کے لئے، انابت رقیم کی دیوار ہمیشہ آپ کے اور اس کے مابین تہی رہی ہے۔“ اس نے چلیں جھپک جھپک کر آنسو پیچھے دھکیلے، اذن البصار جی بھر کر بد مزہ ہوا تھا۔

”اور اگر میں کہوں کہ اس دل کے ہر کونے

پر حیا نہیں انابت، اذن البصار کی محبت کے دیئے روشن ہیں تو کیا تم میرے جذلوں کی صداقت پر ایمان لے آؤ گی۔“ بدھیم کسی روشنی میں وہ اس کے تاثرات دیکھ نہیں پائی تھیں لیکن اس کے لہجے کی شدت ضرور محسوس ہو گئی تھی، ایک بار اس نے اپنی چاہت کا یقین دلانا چاہا اور اذن البصار نے اسے دھتکار دیا تھا اور اب وہ اس سے اپنی یقین کا مطالبہ کر رہا تھا، وقت کا پیرہ اٹنی رفتار سے عوم رہا تھا۔

”ہاں انا، مجھے اقرار کر لینے دو یہ مجھے تم سے محبت ہے آج سے نہیں اس وقت سے جب پہلی بار تمہارا عکس میری آنکھوں میں جھلکایا، میں انکاری تھا تو محض اس وجہ سے کہ میں اپنے اور حیاء کے رشتے میں بے ایمانی نہیں چاہتا تھا میں اپنے اصولوں سے ہٹ کر کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا، میں ہر رشتے کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا تھا، باقی رشتوں کو انصاف کے ترازو میں تولتے تولتے میں خود اپنے ساتھ نا انصافی کر گیا تھا، اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی سے بے دخل کر کے تکلیف صرف تمہیں نہیں پہنچائی، میں نے خود پر بھی خوشیاں حرام کر لی تھیں، تم سے شادی اور پھر پایا پر ایک، یہ ایسے حالات تھے جب میں کمزور پڑنے لگا تھا، میں بہت ڈر گیا تھا انا، پایا کو کھونے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا، میں نے اپنا سارا خوف تمہارے وجود میں منتقل کر دیا، مگر یہ سچ ہے انابت اذن البصار کے بغیر، اذن البصار بھی ایک لمحہ کے لئے چین سے نہیں رہ سکا، اس کی راتیں بھی بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتے گزری ہیں، انا کی سسکیوں، اس کی بے پایاں محبت نے اس کا ہر دم پیچھا کیا تھا، وہ ایک لمحہ بھی اسے فراموش نہیں کر پایا، شاید خدا نے مجھے آزمائش میں ڈالا تھا تاکہ تمہارے محبت کی جڑیں میرے سینے میں مضبوط کی جگہ بنالیں، اگر انابت نے بل بل تڑپتے میں

گزارا ہے تو جی اذن البصار بھی نہیں رہا تھا۔“ وہ دھیرے دھیرے اپنی شکست تسلیم کر رہا تھا اور وہ دم سادھے اس کا اقرار اپنے دل میں اتار رہی تھی، اختلاف کی گنجائش کہاں تھی وہ خود اس کی محبتوں کے سحر میں جکڑی تھی۔

”مجھے جھوٹے بھلاؤے مت دیں، میں اب کوئی شے کا خواب نہیں سنا چاہتی، اب کے جو یہ خواب چکنا چور ہوئے تو میں سنبھل نہیں پاؤں گی، میں ان طوفانوں کی عادی ہو گئی ہوں، مجھے انہی پیچیدوں میں رہنے دیں، مجھے اپنی عارضی پناہوں کی عادت مت ڈالیں۔“ وہ ضبط کرتے کرتے سچ اٹھی تھی، اس نے انابت رقیم کے کندھے کے گرد اپنا بازو حائل کیا اس نے اپنے قریب کیا اور چلتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگائے اندر لے آیا اذن البصار نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا، اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی وہ بے آواز سسکتی رہی۔

”چلنا تو ہمیں ساتھ ہی ہے، لیکن میں زبردستی نہیں کروں گا، تم چاہو تو اپنا فیصلہ بدل سکتی ہو۔“ وہ رک کر مخاطب ہوا۔

”بولو انا، مجھے تمہاری ہر سزا منظور ہے تم مجھے انتظار کرنے کو کہو گی تو میں تمہارے لوٹنے کا منتظر رہوں گا جب تک تم چاہو میں تب تک تمہارا انتظار کروں گا۔“ وہ پوچھ رہا تھا اور وہ چپ چاپ بیٹے آنسوؤں سے اس ساحر کو دیکھ رہی تھی جسے دیکھتے ہی اس کا دل بغاوت کرنے لگتا تھا، پیار میں جزا سزا کہاں ہوتی ہے وہ اس سے محبت کرتی تھی، اس کی ہر دھڑکن وہ شخص کی ساز کی طرح سنائی دیتا تھا تو پھر سزا کیسے دیتی، اس نے بہت محبت سے اس کے رخساروں سے دو پانی کے موتی چٹن لئے۔

”کیا تمہیں اذن البصار سے محبت ہے۔“ وہ بہت گھبراتا سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ بھی بھلا پوچھنے والی بات ہے۔“ اس نے کلس کر سوچا۔

”کیا اب بھی میرے اقرار کی ضرورت ہے۔“ آنکھیں رگڑتے ہوئے وہ تکیے پن سے بولی۔

”شکر ہے تمہاری زبان تو کھلی درنہ میں تو سمجھا تھا کچ سزا سننے پیٹھ ٹٹی ہے۔“ اس نے لحوں میں رنگ بدلا۔

”پہلے تو بہت پٹر پٹر زبان چلتی تھی، محبت کے اظہار میں تمہیں ایک لمحہ نہیں لگتا تھا اب کیوں تالے پڑے ہیں زبان پر جب میرا دل اقرار سننے کو بے تاب ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرایا تو، وہ بے طرح شیشا گئی، اس کے شوخ انداز محسوس کر کے اس کے ارادے دم توڑنے لگے تھے۔

”آپ بہت برے ہیں۔“ اس نے مان بھرا شکوہ کیا۔

”جیسا بھی ہوں صرف تمہارا ہوں۔“ اسی نے جذبات سے پر لہجے میں کہا تو وہ جھینپ کر رخ موڑ گئی۔

”بھئی ویڈنگ اینی دوسری۔“ ایک رنگ پاکٹ سے نکال کر اس نے انابت رقیم کی انگلی کی زینت بنا کر کہا۔

”تمہیں یاد ہے اسی دن تم میرے لیے بڑی تھیں۔“ وہ مسلسل اسے چڑھا رہا تھا اور وہ سچ سچ چڑھ گئی۔

”اتنا ہی بڑا بوجھ ہوں تو واپس کیوں بلایا۔“ وہ برا مان گئی۔

”بس یار اب غلطی کی ہے تو بھگتتی بھی پڑے گی ہی نا۔“ وہ مسلسل اسے ستارہا تھا، وہ منہ پھلا کر ایک طرف ہو گئی۔

”اچھا سنو!“

”عید مبارک۔“ اس نے بازو سے پکڑ کر اسے سامنے کیا۔

”بس تم مجھ پر جگ بھر بھر کر پانی کے ستے
انڈیلنا۔“ انابت کے چہرے پر پھیلی الجھن اس
کے شریر جملے کے آخر میں غصے میں تبدیل ہوئی
تھی اور اذن البصار کا بے ساختہ قبضہ اسے زحمت
کرنے کو کافی تھا۔

”اذن..... آپ۔“ اس نے تنبیہی انداز
اپنایا مگر اذن البصار اس کا جملہ کاٹ گیا۔
”بدنیز لڑکی، کیا تمہیں پتہ نہیں مشرقی
لڑکیاں اسے شوہر کا نام نہیں لیتیں۔“

”تو پھر کیا کہہ کر بلاتی ہیں۔“ اس نے
بہت معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں ابھی تو ہمارے چنٹو بنو، ببلو، بلی
ٹائپ ننھے منے بھی نہیں کہ تم مجھے ان کے پایا کہہ
کر بلاؤ، چلو تم مجھے جان..... جانو وغیرہ کہہ لیا
کرو جیسے اکثر لوگ کہتے ہیں۔“ اس کی شرارت
بھری ہلکھلاہٹیں اس کے جذبات گدگدا رہی
تھیں، اس نے بازو سے پکڑ کر اسے خود میں سوبا
تھا وہ پہنچتی ہوئی اس کے حضار میں قید ہو گئی،
برسوں کی مسافت جیسے ختم ہوئی تھی، ایک سرشاری
رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

اب جب محبت کا یقین اس کے ہمراہ تھا تو
دیر کس بات کی تھی، اذن البصار کا ساتھ اس کی
زندگی کی سب سے قیمتی متاع تھی، وہ اسے دوسری
بار کھونے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتی تھی، اس نے
محبت کے مسافر کا ہاتھ تھام لیا تھا فرار بھی وہی تھا
اور پناہ گاہ بھی اسی کے پاس تھی، اس کے شریر
جملوں پر اس سے فرار ہو کر وہ اسی کے سینے میں
منہ چھپا گئی تھی، اس کے باوجود میں پناہ ڈھونڈ
رہی تھی، اذن البصار اسے بانہوں میں سمیٹے مطمئن
تھا تو انابت رفیق سرشار تھی، رات کے بھیگتے چاند
نے ان کے ساتھ کے دامن ہونے کی بے ساختہ
دعا مانگی تھی اور ستاروں نے آمین کہا تھا۔

☆☆☆

”آپ کو بھی۔“ اس کی چمکتی نگاہوں کو
خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ بولی۔
”چلو اب میری عیدی نکالو۔“
”میں..... میں کیا دوں؟“ وہ ہڑبوائی۔
”سب کچھ تمہارے پاس ہے اسی لئے تو تم
سے مانگ رہا ہوں۔“ دھمکی دیتے ہوئے وہ
آگے بڑھا اور ایک لمحے میں اس کا مخروطی ہاتھ
تھام لیا۔
”میں واپس آگئی ہوں کیا یہ کسی عیدی سے
کم ہے۔“ ہاتھ کو اس کی گرفت سے آزاد کروا کر
وہ اک ادا سے بولی۔
”اسی لئے تو تم سے مانگ رہا ہوں۔“ اس
کا ذومعنی انداز سے اس کے اعصاب چنٹنے لگے
تھے۔
”جو آپ نے میرے ساتھ کیا ہے، اس
کے بعد تو منہ دھو رکھیں کسی عیدی کی توقع نہ
رکھیں۔“ وہ بھی حساب بے باق کرنے میدان
میں نکل آئی۔
”اوہ ہو، شیرنی کے پنچے نکل آئے ہیں۔“
اس نے اسے مزید تکیا۔
”آپ مجھے لڑا کا کہنے کی کوشش کر رہے
ہیں۔“ وہ سب کچھ بھول بھال کر اس سے الجھنے
لگی، مگر اس کے جذبات میں مچلتے ارادے اور
بے لگام ہوتی نگاہیں اسے سینے پر مجبور کر گئیں،
اس کی چلتی زبان کو ایک دم بریک لگی تھی، وہ فرار
کی راہ تلاش کرنے لگی۔
”میں..... وہ۔“
”تم بس میرے پاس رہو۔“ مخمور سے
لہجے میں فرمائش آئی۔
”میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھو گا انا..... بس
تم.....“ وہ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی کافی
دیر بعد اس کی مسلسل خاموشی پر انابت نے نگاہیں
اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مسٹر پیلز جلدی سے آئیں میری امی جان کو پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے ان کا سانس اکھڑ رہا ہے۔“ مریم ابھی وارڈ کا راؤنڈ لگا کر آئی ہی تھی اور اس نے اکثری ہوئی کمر ذرا دیر کو کرسی سے نکلی تھی کہ بیڈ نمبر چار کی مریمضہ کی بیٹی حواس باختہ سی اس کے پاس آئی تھی، مریم نے اٹھتے ہوئے کلاک کی طرف نگاہ دالی تھی سواتین ہو رہے تھے ساری دنیا اپنے نرم گرم بستروں میں دہکی یقیناً خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی اور وہ اپنے جیسی سا مٹی نرس کی طرح تڑپتے سکتے مریمضہ کے آرام کی خاطر اپنا آرام بچ کر خدمت کو کمر بستہ تھی۔

”میں نے آپ سے کہا ہے تاکہ آپ گھبراہٹ مت، ان پر استھما کا شدید ایک ہوا تھا ٹریٹ منٹ ہم کر رہے ہیں انشا اللہ صبح تک یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس نے بیڈ نمبر چار کی مریمضہ کو چیک کر کے اس کی بیٹی کو لپیٹی دی تھی جو ماں کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو جاتی تھی۔

”مسٹر جب یہ اکھڑے اکھڑے سانس لیتی ہیں تب میری تو جان نکل جاتی ہے۔“ اس لڑکی نے کہا تھا۔

”یہ اب صبح تک سکون سے سوئیں گی۔“ مریم نے اسے سکون اور انجکشن لگا دیا تھا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو، میں تو اپنی ماں کی حالت دیکھ کر بہت گھبرا گئی ہوں، مجھے تو اپنے بچے بھی یاد نہیں ہیں شام سے جن کو اپنی ساس کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔“ مریم کا نرم رویہ دیکھ کر وہ لڑکی اپنے دل کا حال بیان کرنے لگی تھی۔

پریشانی حل کر دیا کرتی تھی۔

”کہاں جی! میرے دو بھائی بھی ہیں، مگر اس وقت وہ اپنی بیویوں کے ساتھ آرام کر رہے ہوں گے، ماں کی صحت سے زیادہ انہیں بیویوں کا آرام عزیز ہے، میں بھی شادی شدہ ہوں میرا گھر امی کے گھر کے قریب ہی ہے مجھے تو ملازمہ نے ان کی طبیعت کی خرابی کا بتایا تھا اور میں انہیں ہسپتال لے آئی، دونوں بھائیوں نے فون پر پوچھ لیا ہے کہ امی جان کا کیا حال ہے اب شاید وہ صبح باہر چل آئیں۔“ وہ لڑکی کی دکھ سے مریم کو بتانے لگی تھی۔

”جانے کیوں ہم لوگ بیٹیوں کی پیدائش پر روتے اور بیٹیوں کے ہونے پر بھی بکے چراغ جلاتے ہیں، بیٹے نہ ہوں تو ان کے لئے نہیں مانتے ہیں چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور انہیں خدا سے بلک بلک کر مانگتے ہیں اور پھر وہیں بیٹے ماں باپ کو جب ٹھوکر مارتے ہیں ان سے برا سلوک کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے، پھر بیٹیاں ہی ہوتی ہیں جو ماں باپ کے کام آتی ہیں۔“

”بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ، ہمارے معاشرے کا وہی المیہ ہے۔“ وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں اور اس کی امی غنودگی میں چلی گئی تھیں۔

”خوش قسمت ہیں آپ کہ ماں کی خدمت کر رہی ہیں، آخرت میں یہی عمل آپ کی فلاح کرے گا۔“ مریم نے اس لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا اور پھر اپنے کمرے میں آگئی تھی، یاں کے بارے میں سوچ کر آنکھیں بھر آئی تھیں۔

☆☆☆

”اوائے ہوئے بڑی ثور ہے، بلے بھی بلے بڑا خرہ ہے، خرہ کیوں نہ ہو حسن بھی تو کم نہیں ہے۔“ وہ رات کی ڈیوٹی بگھٹا کر تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی گھر کی طرف آرہی تھی

جب دو آوارہ لڑکے اس کے پیچھے لگ گئے تھے، پہلے تو وہ ان کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے چلتی رہی تھی ایسے لوگوں کو نہ چھٹھتا ہی، بہتر تھا، مگر جب ان کی شوخیاں جد سے بڑھ گئیں تو وہ غصے میں ان کی طرف مڑی تھی۔

”کیا تکلیف ہے، کیوں تنگ کر رہے ہو۔“

”ارے سرکار تنگ تو نہیں کر رہے، ہماری کیا مجال کہ ہم آپ کو تنگ کریں۔“ وہ خباثت سے مسکرائے تھے۔

”شرم نہیں آتی کسی کی بہن کو تنگ کرتے ہوئے۔“ وہ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تو کیونکہ اب اس کا حملہ شروع ہو گیا تھا اور اب ان کو واپس مڑ جانا تھا کیونکہ اسنے حملے میں سبھی اس کے جاننے والے تھے وہ کسی کو بھی آواز دے کر بلا سکتی تھی۔

”اس معاشرے میں تو عورت کی کوئی عزت ہے ہی نہیں۔“ وہ دنیا کی نظروں سے خود کو بچاتے ہوئے جلدی سے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔

”گھر کیسا بھی ہو مگر کیسا تحفظ کا احساس دیتا ہے، گھر کی بنیادیں کمزور بھی ہوں ریت پر دیواریں بھی کھڑی ہوں تب بھی گھر دنیا کے سرد و گرم سے بچا لیتا ہے۔“ اکثر باہر سے آتے ہوئے اسے اپنے گھر کو دیکھ کر ایسا ہی احساس ہوتا تھا بے شک اب اپنے ہی گھر میں اس کی حیثیت پہلے جیسی نہیں رہی تھی مگر نام کا ہی سہی گھر تو تھا نا، ساری سوچیں ذہن سے جھٹک کر وہ تیزی سے

بچن کی طرف بڑھی تھی آج بھوک بھی زوروں کی لگ رہی تھی، ساری راستہ ہسپتال کے لیے لے لے کر آمدوں میں چلتے چلتے ٹانگیں مل ہو جاتی تھیں اور صبح تک چائے کی پی کر آنتیں بھی جواب دے جاتی تھیں، آدمی روٹی اور ایک کنوری میں تھوڑا سا سالن پڑا تھا اس نے فرن میں دیکھا آٹا بھی نہیں تھا، اس نے خاموشی سے وہ آدمی روٹی ہی کھائی اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑی، یہ

ایک دو گھنٹے ہی سونا نصیب میں ہوتا تھا باقی سارا دن گھر کے کام ہی ختم نہیں ہوتے تھے اس وقت بچوں کو اسکول اور ان کے ابو کو آفس بھیج کر سہلی بیگم خود سو رہی ہوتی تھیں اس لئے اسے بھی چند گھنٹا سکون کی مل جاتی تھیں۔

”مہارانی صاحبہ! اٹھ چکو اب، دوپہر بھی ڈھلنے والی ہے اور ادھر نیندیں ہی پوری نہیں ہو رہی ہیں۔“ گیارہ بجے سہلی بیگم کی آنکھ کھلی تھی اور مریم کو سوتے دیکھ کر ان سے کہاں کچھ برداشت ہوتا تھا۔

”جی بھابھی اٹھ رہی ہوں۔“ جب سے راجدھانی سہلی بیگم نے سنبھالی تھی تب سے اس نے تابعداری اور فرمانبرداری کو ہی دہلیز بنا لیا تھا، یہ ایک طرح سے اس کی مجبوری بھی تھی نہ بنائی تو وہ اسے اپنی راجدھانی سے نکال باہر کر میں اس پر جان چھڑکنے والے بھائی صاحب والدین کے گزر جانے کے بعد یوں بھی اب سہلی بیگم کی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے لگے تھے۔

”دوپہر کے لئے کیا بنانا ہے بھابھی۔“ وہ منہ ہاتھ دھو کر بچن کی طرف آگئی تھی، ایک ڈیوٹی ہسپتال کی تھی اور دوسری گھر کی تھی جس کی انچارج سہلی بیگم تھیں، دونوں میں کوتاہی کا کوئی امکان نہیں تھا، اس لئے وہ جس طرح ہسپتال میں چاک و چوبند اور مستعد رہتی تھی اس طرح گھر میں بھی پوری تہذیب سے اپنے کام سرانجام دیتی تھی۔

”کر لے منگوائے ہیں وہی ریکا لو اور ہاں ساتھ کیری کی چٹنی لازمی بنانا۔“ وہ کپڑے اٹھا کر واش روم کی طرف نہایا جانے لگی تھیں اسے روک کر حکم صادر کرنے لگی تھیں، جان لیوا گرمی میں سہلی بیگم کو یوں ہی وقت طلب اور دقت طلب کام کروانے میں مزہ آیا کرتا تھا، وہ حکم کی غلام تھی سر جھکا کر کر لے چھینے لگی تھی۔

”اماں آج پھر کرلیے، مجھے نہیں کھانی یہ کڑی بد مزہ سبزی۔“ وہ اسکول سے لوٹی تھی بھوک زوروں کی لگ رہی تھی اس لئے کچن میں جا کر برتن پختے لگی تھی۔

”ارے صرف کرلیے نہیں ہیں قیمہ بھی تو ڈالا ہے۔“ اماں نے بلند آواز میں کہا تھا۔
”ہاں تو قیمہ بھی کڑوا کر دیا ہوگا، آپ کو بھی پتہ نہیں کیا شوق ہے آئے دن کرلیے پکا کر بیٹھ جاتی ہیں، مجھے بہت بھوک لگی ہے مجھے انداز فرانی کر کے دیں۔“

”ارے صبر تو کر، ایک ہی سانس میں سب کچھ گنوائے جا رہی ہے، یہ لے لے پڑ قیمہ میں نے جب کرلیوں میں ڈالنے کے لئے بھونٹا تھا تو تھوڑا سا تمہارے لئے الگ نکال لیا تھا مجھے پتہ تھا کہ تم کرلیوں کو دیکھ کر اسی طرح شور مچاؤ گی۔“ اماں کچن میں آئی تھیں اور ایک چھوٹی سی کنویری جو چھپا کر رکھی گئی تھی اس کے سامنے لا رہی تھی، بھنا ہوا قیمہ دیکھ کر اس کی بھوک اور چمک اٹھی تھی۔

”چلو اماں۔“ اس نے نعرہ لگایا تھا اور کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔
کرلیوں کی ساری کڑواہٹ اب اس کے اندر گھل گئی تھی ماں نہ رہی تھی تو سارے تازہ دم بھی جیسے بھول گئے تھے، وہ اب جب چاپ سب کچھ کھا رہی تھی، نا پسندیدہ کھانا بھی بچا ہوا اور ٹھنڈا ٹھار کھانا بھی۔

☆☆☆

”آج کی ہائٹ اور بریکنگ نیوز، ڈاکٹر منان نے سسٹر مشعل سے کورٹ میجرج کر لی ہے۔“ وہ شاف دووم میں بیٹھی ہوئی تھیں جب عینی نے آکر گویا دھماکہ کیا تھا۔
”کیا؟“ سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے تھے۔

”ارے اس میں اتنا جو کتنے کی کیا بات ہے جس طرح ڈاکٹر منان اور مشعل کا فیئر چل رہا تھا

اس کو مد نظر رکھتے ہوئے تو ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہی تھا۔“ رابعہ نے گویا یہ بات سن کر کان پر سے کبھی اڑائی تھی۔

”مگر یہ اچھا نہیں ہوا، پہلے ہی لوگ اس پروفیشن کو اچھا نہیں سمجھتے، اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، کوئی اچھا ہو یا برا سب کو ایک ہی چھڑی سے ہانکتے ہیں، مشعل کو اپنے پیسے کا نفدس پامال نہیں کرنا چاہئے تھا اور پھر ڈاکٹر منان کو دیکھو آجھے خاصے میچور ہیں۔“ مریم جسے بھابھی سمیت بہت سے دوسرے لوگوں سے بھی اپنے پیسے کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سننا پڑی تھیں وہ کہنے لگی تھی۔

”آج کل کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے کون سوچتا ہے بس ہر کوئی اپنا مفاد دیکھتا ہے، مشعل کو ڈاکٹر منان سے اچھا پروپوزل اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔“ تہینہ جس کی دوہمیش عمر زیادہ ہونے کے باوجود ابھی تک کنواری بیٹی ہوئی تھیں اس نے اپنی رائے دی تھی۔

”تو تہینہ اس کے لئے کیا ضروری ہے کہ کورٹ میجرج کا ہی راستہ اپنایا جائے، سیدھے سبھاؤ بھی شادی ہو سکتی ہے۔“ مریم نے پھر کہا تھا۔

”یار ان کے گھر والے نہ مانتے ہوں گے، ویسے بھی روٹی پھلکی شادی تو ہر کوئی کر لیتا ہے مگر رنگین ملاقاتوں، مہنگے تحفے تحائف کے تبادلوں اور خوبصورت یادوں کے ساتھ شادی کوئی کوئی کرتا ہے۔“ عینی جو حد سے زیادہ شوخ تھی، اس نے اپنی ہی سنائی تھی۔

”ڈیر مینی آج کل تو معاشرہ جس طرف جا رہا ہے وہاں اب ایسی ہی رنگین رنگین شادیاں ہو رہی ہیں۔“ مریم نے طنز سے کہا تھا اور اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی تھی آج سسٹر منان نے ڈاکٹر شہباز کے ساتھ اس کی ڈیوٹی آپریشن ٹیمز میں لگی ہوئی تھی اور سرجن صاحب ایک منٹ کی تاخیر بھی

برداشت نہیں کرتے تھے، وہ ٹائم دیکھتی ہوئی کھٹ کھٹ کرتی آپریشن ٹیمز کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”سلسلی، مریم کا رشتہ لائی ہوں، آخر جوان جہان مند کو کب تک گھر بٹھائے رکھو گی اتنا اچھا رشتہ مل رہا ہے لڑکا انجینئر ہے، انجینئر میں تو کہی ہوں اس مجھے کو انہیں گھر بلا لو، باقی کا کام اللہ کرنے والا ہے۔“ اماں رسولاً اس کی امی جان کی سبلی تھیں اور آج کل رشتے کروانے کا فریضہ انجام دیتی تھیں ان کے پاس ایک رشتہ تھا جو ہر لحاظ سے بہت اچھا تھا چھوٹا سا بڑھا لکھا بکھا ہوا گھر انہں تھا اور لڑکا بھی نہ صرف شکل و صورت کا اچھا تھا بلکہ انجینئر بھی تھا اس بار مریم کے لئے اس رشتے کو دیکھ کر ان کا دل لچلایا تھا کہ مریم کی شادی ادھر ہی ہو جائے، اماں رسولاً دوستانہ تھا کہ مریم کی ماں کی روح کو شانت کر دینا چاہتی تھیں، یہ ایک طرح سے نیکی بھی تھی، بن ماں باپ کی بچی کا گھر بس جانا انہیں، اس سے زیادہ کیا چاہیے تھا۔

”اماں تم کیا سمجھتی ہوں ہمیں اس کی فکر نہیں ہے، یہ تو بھاری سہل کی طرح ہمارے سینے پر دھری ہے مگر کیا کریں جو بھی رشتہ آتا ہے اس کے نرس ہونے کا سن کر بھاگ جاتا ہے، انجینئر کا سن کر سلسلی بیگم ویسے ہی جل کر راکھ ہو گئی تھیں، اماں رسولاً کو کیا جواب دیتی ہمیشہ کی طرح مریم کی ذات میں ہی گھڑے نکالنے لگی تھیں۔

”اے لو بہو تم نے بھی خوب کہی، مریم نرس ہے کوئی جن بھوت کو نہیں جوائے والوں کو چٹ جاتی ہے، باخو انو است نرس ہونا کوئی عیب تو نہیں، یہ بے چاریاں تو ایسے ایسے دھمی لوگوں کی مدد کرتی ہیں ان کے رستے زمنوں کو مرہم عطا کرتی ہیں جن کو اپنے بھی چھوڑ جاتے ہیں اپنا آرام کرج کر ان کو آرام دیتی ہیں پھر تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔“

ایساں رسولاً کو سلسلی بیگم کی بات نے آگ لگا دی تھی، کچن میں چائے بنائی مریم کا دل خوش ہو گیا تھا۔

”جا رہی ہوں، جب تمہارا اماں گھر رہو گا تب آؤں گی اس سے بات کرنے تمہیں تو اپنی بات سمجھانا مشکل ہی ہے۔“ وہ چادر سر پر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”خالہ چائے بن گئی ہے۔“ مریم جلدی سے کچن سے باہر نکلی تھی۔

”میری بچی تکلیف نہ کیا کرو، یہاں کون سا کھانے بنے آئی ہوں۔“ وہ مریم کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئی تھیں۔

”یونہی اس کے بھائی سے بات کروں گی، میں بھی دیکھتی ہوں کیسے اس کی شادی ہوتی ہے ایک انجینئر سے۔“ مریم خالہ کو دروازے پر چھوڑنے لگی تھی تب تک سلسلی بیگم کا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

”اب بند کر کے اسے اندر بھی آجاؤ، جانے دروازے پر کھڑے ہونے کا کیسا چمکا ہے جو پورا ہی نہیں ہوتا، تمہاری تاکا جھانکی کی یہ عادت تمہارے شریف بھائی کو ایک دن ضرور ذلیل کر دے گی۔“ خالہ رسولاً کا سارا غصہ اب مریم پر نکلنے والا تھا۔

”اماں رسولاً آئی تھیں، مریم کے لئے کوئی رشتہ لے کر، میں نے تو صاف منع کر دیا، جانے کیسے لوگ ہوں اور لڑکے کے بارے میں بھی جو انہوں نے بتایا مجھے عجیب ہی لگا، اب آپ ہی بتائیں مریم جیسی بچی ہے ہماری ذمہ داری ہے اب ہم کیسے اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں، یا اس کا ہاتھ کسی ایسے ویسے کے ہاتھ میں نہ دے دیں، اماں رسولاً صبریں رشتے کروانے والی، انہیں کسی کے اچھا یا برا ہونے سے کیا غرض، انہوں نے تو بس دونوں طرف سے مال پانی کھرا کرنا ہے۔“ اسی روز سسلی بیگم نے کمال ہوشیاری سے

شوہر کے دماغ میں بات ڈال دی تھی کہ جب اماں رسولوں وہ رشتہ لے کر دوبارہ آئیں تو یوسف صاحب ان کو جواب دے دیں۔
”تو تمہیں کس نے کہا ہے کہ ہم محض اماں رسولوں کے کہنے پر مریم کے لئے کوئی رشتہ قبول کر لیں گے، تمہیں مریم کے لئے جو بھی مناسب لگے تم وہی کرو، آخر مریم ہماری ذمہ داری ہے اماں رسولوں کی تو نہیں۔“ سلیکی کو شوہر سے اسی جواب کی توقع تھی اس نے اطمینان سے کھانے کے خالی برتن سمیٹے تھے اور بچن کی طرف چل پڑی تھی، ویسے بھی شوہر کے سامنے وہ دکھاوے کو تھوڑا بہت کام کر بھی بیٹھی تھی کہ یہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ سارا کام اس کی بہن ہی کرتی ہے۔

☆☆☆

”کیا بات ہے آج بہت پریشان ہو۔“ سسر تمہیں اپنی ڈیوٹی نمٹا کر آئی تو اسے ایشاف روم میں کم مسم بیٹھے دیکھ کر اس سے پوچھنے لگی تھی۔
”نہیں تو، میں کیوں پریشان ہونے لگی۔“ وہ مشکل سے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پا کر بولی تھی۔

”کوئی بات تو ہے تو تم چھپا رہی ہو، نہیں بتانا چاہتی تو تمہاری مرضی، ویسے جہاں تک میرا اندازہ ہے یقیناً بھابھی بیکم نے کوئی نئی کل افشانی کی ہوگی، ورنہ ہماری مریم اداس ہونے والوں میں سے نہیں ہے، بہت بہادر ہے۔“ تمہینہ اس کی پریشانی کا اندازہ کرتے کرتے صحیح مقام تک جا پہنچی تھی ویسے بھی اس کی چند قریبی کولیگز کو اس کے گھریلو حالات کا پتہ تھا اور یہ بھی کہ وہ ماں باپ کی وفات کے بعد بھابھی کے قسم و کرم پر ہے، بھابھی بھی ایسی جو اس پر زندگی تنگ کئے رکھتی ہے۔

”نہیں یار کچھ نہیں ہے بس طبیعت ٹھیک نہیں ہے، موسم بدل رہا ہے نا اسی کا اثر ہے۔“
”ہاں موسم تو بدل رہا ہے مگر تمہارے گھر کا

موسم بھی بدلے تب ہے نا۔“ تمہینہ اٹھ کر اپنے اور مریم کے لئے چائے بنانے لگی تھی، مریم نے ممنونیت سے اسے دیکھا تھا اس وقت چائے سے زیادہ کسی اور چیز کی طلب تھی بھی نہیں۔

بھابھی کا بیٹائی آ رہا تھا، بھابھی کل رات سے بہت خوش تھیں اور مریم اسی حساب سے پریشان، بھابھی کا یہ بھائی جاب کے سلسلے میں دوہی میں مقیم تھا اس لئے آج تک مریم کی اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی، مریم اب پریشان تھی کہ جانے وہ شخص کس فٹاش کا ہوتا ہے یقیناً بھابھی تو اپنے بھائی کو گھر میں کھلی چھٹی دے دیں گی اور ایسے میں مریم کے لئے مشکل ہوگی، آج صبح دس بجے تک اسے آ جانا تھا، ڈیوٹی آف کرنے کے بعد مریم کا گھر جانے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا، مگر اٹھا کر چل پڑی تھی۔

”مریم کپڑے بدل کر جلدی آؤ، کھانے میں دیر ہو رہی ہے۔“ وہ ابھی گھر میں داخل ہوئی تھی جب اس نے بھابھی کی آواز سنی تھی، آج خلاف توقع بھابھی بچن میں تھیں، مریم کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھو کر بچن میں چلی آئی تھی۔

”ادھر آؤ جلدی سے یہ سالن دیکھو، میں ذرا دو گھڑی سانس لے لوں، کب سے ایسی ہی لگی ہوئی ہوں اور ہاں سلا بھی ساتھ ساتھ بنا لیتا اور دوسرے چولہے پر پختی ابل رہی ہے چاول ڈال دینا، یہ کام کر کے پھر ٹیبل لگا دینا۔“ وہ لوگ فریج سے نکال کر کھڑے کھڑے غٹ غٹ پیتے ہوئے اسے کام بھی بتائے جا رہی تھیں، مریم ہر بات بھلا کر تیزی سے ہاتھ چلانے لگی تھی کہ ابھی بہت سا کام پانی تھا اور اسے بھی زوروں کی بھوک لگ رہی تھی، ٹیبل لگا کر اور اپنے لئے پڑے میں کھانے کے کردہ اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔
”پچھو پایا بلا رہے ہیں۔“ اس نے ابھی پہلا لقمہ توڑا تھا کہ مریم نے اسے بلانے چلی آئی

تھی۔
”کیوں؟ کوئی چیز چاہیے کیا۔“ باہر ڈائینگ ٹیبل پر برتن اٹھانے اور رکھنے کی آوازیں آنے لگی تھیں جس کا مطلب تھا کہ کھانا شروع ہو چکا ہے وہ پوچھنے لگی تھی۔

”نہیں، پایا کہہ رہے ہیں آپ باہر آ کر سب کے ساتھ کھانا کھائیں۔“ مریم نے اسے پیغام پہنچا کر چلی گئی تھی، بھیا کا حکم تھا چار اسے اٹھنا پڑا تھا، وہ اپنی ٹرے وہیں چھوڑ کر اٹھ گئی تھی، وہاں تو اسے بھیا کے کہنے پر بیٹھنا تھا کھانا تو اسے اپنے کمرے میں ہی آ کر کھانا تھا۔

احتشام الحق، بھابھی کا بھائی، جو دیکھنے میں بالکل ان سے مختلف تھا، اس نے بس سرسری نظر اس پر ڈالی تھی اور سلام کر کے چاول اپنی پلیٹ میں ڈال کر دانہ دانہ کھانے لگی تھی جبکہ وہ بھیا کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا اور اپنی باتوں سے وہ اتنا پتھور لگ رہا تھا کہ مریم کو حیرت سی ہونے لگی تھی کہ بھابھی کا یہ بھائی ایسی سوچ بھی رکھ سکتا ہے۔

”مریم گرین ٹی بنا کر لے آؤ، ہم ٹی وی لاؤنج میں جا رہے ہیں۔“ احتشام الحق اور بھیا پہلے اٹھ گئے تھے، بھابھی نے کھانا ختم کر کے اسے فوراً حکم دیا تھا، وہ گرین ٹی بنانے کے لئے اٹھ گئی تھی بعد میں اسے برتن بھی تو سمیٹنے تھے۔

☆☆☆

احتشام الحق کو آئے آج تیسرا روز تھا اور مریم کے سب بدترین خدشات ریت کی بھر بھری دیوار ثابت ہوئے تھے جیسا اس نے سوچا تھا اس بار بالکل بھی ویسا نہیں ہوا تھا، احتشام الحق اس کی سوچوں کے برعکس نکلا تھا، وہ بہت سلگم بھلی ہوئی اور صاف ستھری شخصیت کا مالک تھا، اس نے ایک بار بھی غلط نظر اٹھا کر مریم کو نہیں دیکھا تھا، وہ اپنی بہن کے کمرے یا پھر گیٹ روم تک ہی محدود رہتا تھا، مریم کی ساری پریشانی دور ہو گئی تھی، وہ

بہت پرسکون ہو کر اپنے معاملات زندگی سرانجام دینے لگی تھی۔

”مریم اگر تکلیف نہ ہو تو ایک کب چائے تو بنادیں۔“ وہ بچن میں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی، بھابھی ذرا دیر ہوئی پڑوس میں گئی تھیں، ویسے بھی آج کافی دنوں بعد وہ گھر سے نکلی تھیں، احتشام کی وجہ سے وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتی تھیں، مریم نے پیچھے مڑ کر دیکھا احتشام دروازے میں کھڑا تھا۔

”تکلیف کیسی، میں بنادیتی ہوں۔“ جب وہ اس کی عزت کرتا تھا تو مریم کا بھی حق بننا تھا کہ وہ اس کی عزت کرے وہ نرمی سے بولی تھی۔
”شکریہ۔“ وہ واپس مڑ گیا تھا۔

”یہ چائے۔“ وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھائی دی دیکھ رہا تھا جب مریم چائے اور ساتھ میں کباب لے کر اس کے پاس پہنچی تھی، اس نے ٹرے میز پر رکھ کر اسے مخاطب کیا تھا۔

”اگر نارغ ہیں تو کچھ دیر بیٹھ جائیں، میں تو اکیلے بیٹھے بیٹھے بور ہو گیا ہوں۔“ وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا تھا، مریم کچھ سوچ کر سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ کی جاب تو بہت ٹف ہے، پھر میں نے دیکھا ہے آپ تقریباً گھر کا سارا کام بھی کرتی ہیں، آپا کو تو آپ نے بہت ریلیکس کر رکھا ہے اسی لئے ان کا وزن اتنا بڑھ گیا ہے، کچھ کام انہیں بھی کرنے دیا کریں۔“

”گھر کا کام ہوتا ہی کتنا ہے۔“ وہ کہنا تو چاہ رہی تھی آپ کی آیا نے خود ہی سارا کام میری اکیلے جان پر مسلط کر رکھا ہے ورنہ مجھے کیا شوق ہے جانوروں کی طرح صبح سے رات گئے تک بچے رہنے کا، مگر وہ ایسا کہہ نہ سکی تھی، آخر بھائی تو انہی کا تھا ظاہری بات ہے اپنی آپا کی ہر طرف داری کرتا۔

”خیر ایسے تو نہ کہیں آپ، کام تو بہت ہوتا

ہے، میرے سامنے آپ صبح سے رات گئے تک لگی رہتی ہیں۔“ وہ اس کے دل کی بات جان گیا تھا یا شاید اپنی آنکھیں کچھ زیادہ ہی کھلی رکھتا تھا۔
 ”وہ تو عادت ہو گئی ہے۔“ وہ عاجزی سے بولی تھی تبھی داخلی دروازہ کھلا تھا اور بھابھی اندر داخل ہوئی تھیں، مریم کو احتشام کے پاس بیٹھے دیکھ کر تو انہیں ہر ایک گئے تھے وہ گویا اڑتی ہوئی فی دی لاؤنچ میں آگئی تھیں۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو، جاؤ کچن کا کام دیکھو۔“ انہوں نے سانس بھی بعد میں لیا تھا منظر سے مریم کو پہلے ہنایا تھا، مریم خالی کپ اور ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی تھی، اسے بھی احتشام کے پاس بیٹھنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔

”شامی کہیں کھوم پھر آتے، گھر میں کیوں گھسے پورے ہو رہے ہو۔“ اب انہوں نے لہجہ بدل کر بھابی کو مخاطب کیا تھا، انہیں تو گھر میں اس چلتی پھرتی قیامت سے خوف سا آنے لگا تھا، بلاشبہ مریم کا ملکوتی حسن اچھے اچھوں کے جھکے چھڑوا سکتا تھا اور احتشام تو ویسے بھی بہت حسن پرست تھا۔

”کہاں جاؤں، آپ کے شہر میں مجھے جانتا ہی کون ہے۔“

”ارے سعدیہ خالہ کی طرف ہو آتے، ویسے بھی کل انعام کا تون آیا تھا تمہیں پوچھ رہی تھی۔“

”میرا دل نہیں کرتا وہاں جانے کو، انعام کسی ڈرائے کی ہیر و من کی طرح سر پر ہی سوار رہتی ہے، مجھے اس فیشن کی ماری ہوئی کو دیکھ کر بہت کوفت ہوتی ہے آیا۔“

”لو بھئی شامی تمہاری بھی ہر بات اٹتی ہی ہوتی ہے، آج کل جو چل رہا ہے وہ بے چاری اسی کے مطابق تو رہتی ہے۔“ انہوں نے جلدی سے اپنی سگی خالہ زاد کی طرف داری کی تھی۔

”بس اپنی اپنی پسند کی بات ہے نا۔“

احتشام کے دل و دماغ میں سادگی میں بھی غضب ڈھائی مریم کا سراپا کھو تھا، آبا کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی سی بج اٹھی تھی حالانکہ احتشام نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا۔

”یہ آج کل نرسنگ کا شعبہ کیا گل کھلا رہے ہے، ساتھ والی پڑوسن مجھے بتا رہی تھی کہ اس کی ایک کزن بطور نرس کسی نجی اسپتال میں جاب کرنی گئی وہاں کے مالک کو پھنسا کر اس سے شادی کر بیٹھی جبکہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا، خدائی پناہ یہ لڑکیاں بھی نا ذرا اپنے کام کا لحاظ کرتی ہوں۔“ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے اور اپنی طرف سے احتشام کا دل مریم کی طرف سے کھنا کرنے کی کوشش کی تھی یہ جانے بغیر کہ انہوں نے نہایت ہی غلط بات نہایت غلط انداز میں احتشام کے سامنے پیش کی ہے۔

”ایسی لڑکیاں ہر شعبے میں اور ہر جگہ پائی جاتی ہیں، صرف نرسنگ کا شعبہ مخصوص نہیں ہے آبا، یہ تو بہت مقدس پیشہ ہے اور پھر جس طرح نرسیں دن رت مریضوں کی خدمت کرتی ہیں وہ تو قابل تحسین ہے۔“ احتشام نے رسان سے کہا تھا کچن میں کھڑی مریم کا دل بارغ باغ ہو گیا تھا جبکہ آبا منہ بنا کر وہاں سے جھٹ گئی تھیں، اگر احتشام کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ منہ توڑ جواب دیتیں۔

☆☆☆

ایسے لگتے جیسے آہنگ ٹوبہ نو کا کوئی دریچہ سا کھل گیا ہو جبر سمندر پہاڑ وادی..... ہوا کی پائل اداس تنہا سڑک، پھیلاں کی ریت، ساحل مکان..... ان کی چٹخیں، دریتے اور ان کے چھجے گلی کی جانب کو کھٹنے والی ہر ایک کھڑکی اور اس کے

شیشے!

ہر اک شے سے برستی بارش کی گفتگو کا حزا جدا ہے نیا بے الفاظ کا چناؤ، زبانی بندش، نوا جدا ہے

ہر اک سے باتیں الگ الگ ہیں ہر اک سے لہجہ جدا جدا ہے

آج کل رات عجیب خوبصورت رات کا لبادہ پہن کر آئی تھی، ریم جسم بارش کی آواز مریم کو اپنے کمرے کی کھڑکی پر کوئی ساز بجاتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، احتشام اتنی بھابھی کا بھائی تھا، اس کے لئے بھر منوعہ کی حیثیت رکھتا تھا، مگر پھر بھی اسے اچھا لگنے لگا تھا، وہ آج جس طرح اس کی حمایت میں بولا تھا اس بات نے تو مریم کے دل کی پتھریلی زمین کو ہموار کرنے میں ایک بل بھی نہیں لگایا تھا، مریم تو بن مول ہی ایسے خوبصورت جذبے کے آگے بک گئی تھی۔

”آج تو لوگوں کے بات بات پہ دانت لگ رہے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے وارڈ سے باہر نکلی تھی جب آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑی تھینہ نے نیکی کو کہنی مار کر کہا تھا اور اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ مریم سن سکتی تھی۔

”یارینی دنیا کیسی ہے نہ تو روتوں کو دیکھ سکتی ہے اور نہ ہنستے ہوؤں کو۔“ مریم نے بھی جواباً حملہ کرنا تھا۔

”تھیں جناب یہ دنیا ایسی ہے کہ اسے اپنے چاروں طرف سے دیکھ کر تشویش ہو جاتی ہے اور ہنسنے لگتا ہے ہوئے دیکھ کر تسلی ہوئی ہے خوشی ہوئی ہے۔“ تھینہ نے غلیظ سے کہا تھا۔

”تھیں اس خوشی کا حلق کسی اور بات سے تو لیں۔“ یعنی جیس ہوئی تھی۔

”ایسا ہی سمجھ لو۔“ مریم ان کو تذنیب میں ال کر تک بک کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی، جبکہ تھینہ اور یعنی اس کو پکڑنے اس کے پیچھے چلی گئیں۔

☆☆☆

”میری بات کان کھول کر سن لو، میرے سامنے کو اپنی ادا میں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، جو سوچ کر بیٹھ گئی ہو میں ایسا نہیں ہونے دوں

گی، اس لئے جتنا اس سے دور رہو اتنا ہی اچھا ہے۔“ وہ ذرا دیر کو کمرے میں سستانے کو لیٹی تھی جب بھابھی اس کے سر پر آ کر گرے لگی تھیں۔

”کک..... کیا مطلب ہے بھابھی آپ کا۔“ وہ ایسی نہیں تھی اس لئے بھابھی کے ایسے الزام پر تڑپ گئی تھی۔

”مطلب تو تمہیں اچھی طرح سمجھ آ گیا ہو گا، اتنی مصدوم نہیں ہو۔“ وہ خود کو مریم کے سامنے وضاحت دینے کا پابند نہیں سمجھتی تھیں اس لئے پھنکارتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھیں۔

”کیا احتشام نے بھابھی کو کچھ کہا ہے۔“ اس نے تو ابھی اپنے دل کی بدلی حالت کی خبر خود کو بھی اچھی طرح نہ ہونے دی تھی کہ بھابھی نے الزامات کی بوچھاڑ کر دی تھی، وہ سوچنے لگی تھی، مگر احتشام کے دل کی مجھے کیا خبر ہے، اس نے خود ہی اپنی سوچ کو جھکنا تھا۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔“ بھابھی بازار گئی تھیں، وہ اپنے کپڑے پر پس کر رہی تھی جب احتشام اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑا اس سے اجازت مانگ رہا تھا، بھابھی کی غیر موجودگی میں اب وہ اپنے کمرے سے کم ہی لگتی تھی، بدنام ہو جانے سے احتیاط اچھی چیز ہے۔

”آئیے، کچھ کام ہے کیا۔“ احتشام کو دیکھ کر شرٹ اس کے ہاتھ سے پھسل گئی تھی، وہ جلدی سے پوچھنے لگی تھی۔

”کام..... کام تو کوئی نہیں ہے، بس آپ سے باتیں کرنے کو دل کر رہا تھا۔“ وہ اس کے کمرے پر طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا تھا، آج پہلی دفعہ وہ اس کے کمرے کا دیدار کر رہا تھا۔

”لیکن میں تو فارغ نہیں ہوں، آپ ایسا کریں باہر چل کر بیٹھیں میں باہر آتی ہوں۔“ وہ اس کے کمرے میں کھڑا تھا، بھابھی اگر اچانک گھر آجائیں تو اس بات پر جی بھر کر ناراض تھا۔

ہوتیں اسی خیال سے مریم کے ہاتھ پاؤں کا پنے لگے تھے۔

”مریم میں کوئی جن تو نہیں ہوں جو تمہیں کھا جاؤں گا، تمہاری ہی طرح کا گوشت پوست کا انسان ہوں، پھر اتنا ڈر کیوں رہی ہو۔“ وہ اس کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر بولا تھا۔

”آپ..... آپ پلیز باہر چل کر بیٹھیں، بھابھی آجائیں گی تو انہیں برا لگے گا۔“ وہ فرصت سے کھڑا تھا اور مریم کو اس کی منت کرنا پڑ رہی تھی۔

”اوکے، باہر چلا جاتا ہوں، مگر تم اپنی حالت کو سنبھالو، لگتا ہے آپ نے کافی ڈرا دھما کر رکھا ہوا ہے۔“ وہ باہر جاتے جاتے اسے دیکھ کر شرارت سے کہہ گیا تھا، مریم بیڈ پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔

”تم کیا جانو تمہاری آیا کیا چیز ہیں۔“ مریم نے دل میں سوچا تھا اور اپنے آپ کو نائل کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

ساون رت اور اڑتی پروا تیرے نام دھوپ نگر سے ہے یہ تھکے تیرے نام سرخ گلاب کے سارے موسم تیرے لئے خوابوں کا ہر اک دریچہ تیرے نام چاند کی آنکھیں پھول کی خوشبو بہتی رات قربت کا ہر اک وسیلہ تیرے نام برف میں پھیلا شام کا دھندلا تیرے لئے ہر اک صبح کا پہلا اجالا تیرے نام ہستی ہوئی سی تیری آنکھیں میرے لئے بہتی جھیل میں پھول کنول کا تیرے نام تیری یاد کا بہتا دریا میرے لئے چاہت کا یہ تنہا جزیرہ تیرے نام دنیا بھر میں جتنے منظر اچھے ہیں ان کا حسن اور شور ہوا کا تیرے نام احتشام کی طرف سے محبت و چاہت اور

پسندیدگی کا بڑا واضح اظہار ہوا تھا مریم کو لگا تھا وہ ایک خواب دیکھ رہی ہے، ایسا خواب جو آنکھ کھلنے پر کسی پرانی عمارت کی طرح سمار ہو جائے گا، وہ اس شام سارا وقت آنکھیں بند کیے بستر پہ پڑی رہی تھی، ڈر تھا آنکھ کھلے گی اور حسین خواب ٹوٹ جائے گا، بھابھی تک یہ خبر پہنچی تھی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، وہ بچن میں بڑیتوں کو بیچ رہی تھیں مریم دھیت بنی لیٹی رہی تھی اور احتشام اس طبیعت کی خرابی کے پیچھے جو محکم کارفرما تھا اس سے بخوبی آگاہ تھا اس لئے مطمئن سا ادھر ادھر پھرتا رہا تھا۔

”احتشام صاحب یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔“ رات پر پھیلائے بیٹھی تھی، سب لوگ کھانا کھا کر چھت پر چلے گئے تھے، جہاں موسم کی تبدیلی کے پیش نظر سونے کے لئے بستر لگائے گئے تھے وہ صاف باکر بستر سے اٹھ کر بچن میں بھوک مٹانے چلی آئی تھی، مگر اسے کیا خبر تھی کہ احتشام کمرے سے نکل کر بچن کے دروازے پر آکھڑا ہوگا، اسے دیکھ کر جہاں دل نے دھڑکنوں کا انداز بدلا تھا وہیں وہ بے ساختہ بول گئی تھی، اشارہ دوپہر والے اظہار کی طرف تھا۔

”مریم آپ مجھے سب کی طرح شامی کیوں نہیں کہتیں، پورا نام کیوں لیتی ہیں۔“ سوال کچھ تھا جواب کچھ اور آیا تھا، شاید اسے یہ سوال فضول لگا تھا اس لئے سننے والے نے سرے سے ہی گول کر دیا تھا۔

”میں آپ سے کچھ اور کہہ رہی ہوں۔“ اس نے انا کا علم بلند کیا تھا۔

”بتائیے نا، احتشام کی بجائے شامی تمہارا بنائیت ہے۔“ وہ شرارت سے بولا تھا۔

”اور مجھے شامی کہنے سے اپنائیت کہ بجائے شامی کباب کی خوشبو آتی ہے۔“ وہ سمجھ گچھی کہ اس کا مدعا نہیں سنا جائے گا اس لئے لپٹے ہوئے کہہ کر جھپاک سے اپنے کمرے میں صر

گئی تھی، اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر زندگی کی ٹھنڈی زردہ کوٹھڑی میں تازہ ہوا کا کوئی روزن کھلنا چاہتا ہے تو اسے کھول دینا چاہیے۔

احتشام کی سیاحتوں میں قل قل کرتی ہنسی محفوظ ہو کر رہ گئی تھی، وہ اداس آنکھوں والی اس لڑکی کی ہنسی ہی تو سننا چاہتا تھا۔

”کیا بوا اس ہے یہ میں اپنے جیتے جی تو یہ نہیں ہونے دوں گی۔“ احتشام اب واپس جانا چاہتا تھا اور جانے سے پہلے اس نے آیا کے کانوں میں یہ بات ڈال دینا ضروری سمجھا تھا۔

”مگر کیوں آیا، اس میں آخر برائی ہی کیا ہے، مریم میں کس چیز کی کمی ہے۔“ وہ مریم کے لئے اپنا کیس لڑ رہا تھا اور آیا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ احتشام کا منہ کس طرح بند کر دیں، وہ اپنے لاڈلے بھائی کے منہ سے مریم کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھیں کجا کہ اس کو بھابھی کے روپ میں دیکھنا، کل تک جولوڑی ان کی دست نگر تھی جس کو وہ ایک چوٹی سے بھی زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں تھیں آج وہی لڑکی کس مقام سے کس حیثیت سے کھڑا ہونا چاہتی تھی انہیں تو آگ لگ گئی تھی۔

”شامی تم اس بات کو یہیں ختم کر دو، آئندہ اس کا نام مت لیتا، تمہارے لئے اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے اور ہاں اماں کا فون آیا تھا وہ تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔“ سسکی بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس ذات مریم کی وجہ سے یہ وقت بھی آئے گا کہ وہ اپنے بھائی کو اپنے گھر سے جانے کا کہہ دے گی، ایسا بے شک انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر کیا تھا مگر شامی کو اس چیل سے بچانے کے لئے یہ حفاظتی قدم اٹھانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

”مریم بھی ایک اچھی لڑکی ہے، آپ نے کیسے اس کو اس ٹیکٹری سے باہر نکال دیا تھا۔“ وہ تلملا اٹھا تھا۔

”وہ ایک نرس ہے، بھانت بھانت کے لوگوں سے سارا دن ملتی ہے، ہزار مردوں سے

دن بھر اس کا پالا بڑتا ہے پھر ہمیں کیا پتہ وہ کیسی ہے، کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ ایسا ہے یا معصوم صورت دیکھ کر کردار کا اندازہ تو نہیں لگایا جاسکتا نا۔“

”آیا مجھے بہت افسوس ہے آپ کی سوچ پر، نرس ہونا کوئی عیب نہیں اور مریم کے بارے میں ہر کوئی گواہی دے سکتا ہے کہ وہ یہی لڑکی ہے کس کردار کی مالک ہے پھر آپ کا دل کیوں نہیں۔“

”شامی تم اس کے لئے اپنی آیا سے بحث کر رہے ہو۔“ سسکی بیگم نہایت دکھ سے بولی تھیں۔

”آیا میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا بس جو حقیقت ہے وہ بتا رہا ہوں۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نہایت نرم لہجے میں بولا تھا، سسکی بیگم نے ناراضگی سے اس کا ہاتھ پرے ہٹا دیا تھا۔

☆☆☆

”پریشان مت ہونا، میں جلد ہی لوٹ کر آؤں گا۔“ اگلے دن ہی اس نے جانے کا قصد کر لیا تھا، وہ آیا کی نظر بجا کر مریم کو اک نئی آس اک نیا انتظار سونپنے آکھڑا ہوا تھا، مریم کیا کہتی بس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”مجھ پر اعتبار رکھنا، میں ضرور لوٹ کر آؤں گا۔“ وہ جلدی میں تھا مگر پھر بھی اپنی گرم انگلیوں کا کس اس کے دہکتے رخساروں پر چھوڑ گیا تھا۔

تو نہیں تیرا استعارہ نہیں آسمان پر کوئی ستارا نہیں وہ میرے سامنے سے گزرا تھا پھر بھی میں چپ رہا پکارا نہیں وہ نہیں ملتا اک بار ہمیں اور یہ زندگی دوبارہ نہیں ہر سمندر کا ایک ساحل ہے ہجر کی رات کا کنارہ نہیں ہو سکے تو نگاہ کر لینا تم پہ کچھ زور تو ہمارا نہیں

”مجھ پر اعتبار رکھنا۔“ یہ ایک سرگوشی آنے والے دنوں کا حاصل بن گئی تھی، مریم کی زندگی تو بس اس ایک فقرے کے ارد گرد گھومنے لگی تھی، دوسری طرف سلمیٰ بیگم تھیں جنہوں نے مریم پر زندگی اور تنگ کر دی تھی، پہلے تو وہ سانس اپنی مرضی سے لے سکتی تھی مگر اب تو اسے لگتا تھا سانس بھی بھابھی بیگم کی مرضی سے لینے پڑے گی۔

اٹھتے بیٹھتے ہر آئے گئے کے سامنے اسے وہ طعنے ملتے تھے کہ وہ خود سے بھی شرمندہ ہو جاتی تھی، بھائی کے سامنے اس کے ایسے ایسے عیب جن جن کو بتائے جاتے کہ ہر نئے دن کے ساتھ ساتھ بھائی جان کا بارہ اوپر سے اوپر چڑھنے لگا تھا اور اس سارے سلوک کی ایک ہی وجہ تھی۔ بس محبت، احتشام الحق کی محبت اور مجھ پر اعتبار رکھنا وہ دن کو کڑھتی اور راتوں کو جاگتی، اس کی محبت پہلے سے گر نہ گئی تھی، وہ پہلے جیسی مریم تو کہیں سے بھی نہیں لگتی تھی، جینا تو پہلے بھی آساں نہیں تھا مگر احتشام الحق کی محبت نے تو جیسے ہر راہ ہی بند کر دی تھی۔

☆☆☆

”وہ کون تھا جس کے ساتھ آج تو آئی ہے، بتا باہر ہمیں بتائے بغیر کتنے بار بنا رکھے ہیں، اب بول بھی زبان کیوں نہیں کھولتی، جب شریف بھائی کی عزت سڑکوں پر رولتے دیدوں کا پانی نہیں مرا تو اب سچ بتاتے زبان کیوں بند ہو گئی ہے۔“ آخری فقرہ دروازے سے اندر داخل ہوتے بھائی جان کو دیکھ کر کہا گیا تھا اور مریم سامنے کھڑی ٹھہر کر کانپ رہی تھی، یقیناً آج بھابھی کے دل کی نفی اس کے لئے سانپ بن کر اس کو ڈسنے والی تھی، ابھی سے اس کا جسم نیل و نیل ہونے لگا تھا۔

”بتا اب بولتی کیوں نہیں؟“ وہ پھنکار رہی تھیں۔

”بھابھی وہ لڑکا مجھے نہیں پتہ کون تھا، اس کی ماں کی حالت بہت خراب تھی اس کو کوئی ڈاکٹر نہیں مل رہا تھا تو وہ مجھے انکشن لگانے کے لئے بڑی التجا کر کے ساتھ لے گیا تھا، بخدا میں کسی غلط نیت کے ساتھ اس کے ساتھ نہیں گئی تھی، میں کسی کی ماں کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی اور اس کے ساتھ.....“ وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بتا رہی تھی۔

”اور اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سیر پائے کرنے چل پڑی، واہ اچھی کہانی کھڑی ہے تم نے، تم کیا نہیں بے وقوف سمجھتی ہو، تمہارے بدلے کچھ تو میں کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں اور تم کہہ رہی ہو تم اس لڑکے کو جانتی نہیں ہو جبکہ میں نے ہی بار آتے جاتے اسے اپنی گلی میں گھومتے دیکھا ہے اب تم یہ بھی کہو گی کہ وہ تمہارے پیچھے نہیں آتا، لی لی یہ چکر کسی اور کو دینا ہم سفید پوش لوگ تو بری مشکلوں سے باپ دادا کی عزت بچا کر بیٹھے ہوئے ہیں مگر یہ تم جیسی لڑکیاں ہی ہوتی ہیں جو بوڑوں کے سر میں خاک ڈالی دیتی ہیں۔“ بھابھی نے بڑی دانش مندی سے فرضی کہانی گھڑی تھی اور مریم کو بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور وار بنا دیا تھا، مریم سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک نیکی اس طرح گلے پڑ جائے گی وہ واقعی اس لڑکے کو نہیں جانتی تھی اور واقعی اس لڑکے کی ماں کی حالت بہت خراب تھی مگر بھابھی کو اس وقت کیسے اور کون سمجھاتا۔

”بھابھی وہ.....“ اس نے ایک بار پھر اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تھا۔

”چنانچہ.....“ بلواس کرتی ہے بد زبان۔“ بھائی کی غیرت نے بیوی کا لمبا چوڑا مکالمہ سن کر جوش مارا تھا اور بات ابھی مریم کے منہ میں ہی تھی انہوں نے آگے بڑھ کر پوری ٹوٹ سے مریم کے منہ پر طمانچہ دے مارا تھا، مریم لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ جا گئی تھی۔

”میت ماریں اسے، جوان لڑکی پر ہاتھ مت اٹھائیں، کیا لوگوں کو تماشا دکھانا ہے۔“ بھائی کی آنکھوں میں خون اتر ہوا تھا، سلمیٰ بیگم نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”اتنا کچھ ہو گیا اور تو ابھی بھی مجھے روک رہی ہے۔“ ایسے مت کریں، ٹھنڈے دماغ سے کام لیں، ادھر آئیں میری بات سنیں۔“ وہ بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے میں لے گئی تھیں، پھر تھوڑی دیر بعد مریم نے انہیں پچن سے پانی اندر لے جاتے دیکھا تھا، بھائی بے حد غصے میں تھے اور بھابھی مزید کو ہر افشائیاں کر رہی تھیں، مریم بس یہی جانتی تھی، اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا یہ مریم کے وہم گمان میں بھی نہ تھا، وہ بے بس کراہتے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی۔

”کل شام کو تیرا نکاح ہے اب تو گھر سے نہیں نکلے گی، تمہارا بھائی عبدالقدوس کے ہاتھ میں تیرا ہاتھ دے کر آزاد ہونا چاہتے ہیں پھر وہی کرنا جو وہ چاہے گا۔“ کئی گھنٹوں کے بعد بھابھی نے دروازے پر کھڑے ہو کر اسے ایسی اندوہناک خبر سنائی تھی جس نے مریم کو لرزادیا تھا۔

عبدالقدوس بھائی کی دکان کا ملازم تھا، بے حد کرخت اور خوفناک صورت والا بکی عمر کا عبد القدوس جس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی، جبکہ اس کے بارے میں مشہور تھا اس کی بیوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی ہے، اجڑا اور گنوار سا عبد القدوس مریم کے جواز کا نہ تھا مگر بھابھی نے اپنے لاڈلے بھائی کی محبت سے ایسا انتقام لیا تھا کہ مریم کا دل چاہا تھا وہ ابھی اور اسی وقت اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے۔

”بھابھی میں عبدالقدوس سے شادی نہیں کروں گی، بے شک مجھے زہر دے کر مار دیں مگر اتنی بوسہ نہ دیں۔“ وہ بلک رہی تھی مگر سلمیٰ بیگم

دروازہ بند کر کے پلٹ گئی تھیں، اس خوبصورت بلا کوٹا لے کر اس سے اچھا انتظام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا یا جانے کیا تھا احتشام سوئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اس نے مریم کو روتے پینے اور چلاتے دیکھا بھی تھا اور سنا بھی، کوئی اسے بے دردی سے مار رہا تھا اور وہ فریاد کر رہی تھی، احتشام سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا، پھر اس نے بے تابی سے آیا کہ کھرفون کھا ڈالا تھا دل کو کسی صورت قرار چو نہیں آرہا تھا۔

”ہیلو آپ کیسی ہیں آپ، بھائی کیسے ہیں اور بچے۔“ وہ آپا کے فون اٹھاتے ہی شروع ہو گیا تھا، جو بات پوچھنا چاہا رہا تھا اور جس کے بارے میں، وہ بولوں پر لاتے ہوئے ڈرتا تھا اسے ان دنوں میں مریم کے ساتھ آیا کے سلوک کا اندازہ ہو گیا تھا، اس نے ان کے گھر میں رہتے ہوئے بہت کچھ دیکھا تھا۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں، تم سناؤ امی جان کیسی ہیں۔“ آپا کالج ہشاش بشاش تھا۔

”آپا سب ٹھیک تو ہے نا۔“ اس نے ان کو جواب دینے کے بجائے پوچھا تھا، جانے وہ ان سے کس قسم کی سلی چاہتا تھا۔

”ہاں ہاں سب ٹھیک ہے، تم کیوں فکر مند ہو رہے ہو۔“ آپا اتنی نادان نہیں تھیں کہ اسے کسی بات کی بھنگ بھی پڑنے دیتیں اس لئے ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا دھیان بھٹکا کر فون بند کر چکی تھیں۔

مریم کے پاس آج کا آدھا دن اور ایک پوری رات تھی اور بس، اگلا دن اس کے لئے زندگی بھر کی مصیبت لانے والا تھا، اسے اپنے لئے خود کو عبدالقدوس جیسے جنگلی سے بچانے کے لئے جو کچھ بھی کرنا تھا وہ اسی کم وقت اور تھوڑی سی

مدت میں کرنا تھا، بھابھی نے اس کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی تھی اب گھر سے فرار اس کے لئے آسان نہ رہا تھا، وہ ہاسپٹل جاتی تو پھر بھی لوٹ کر نہ آتی، مگر اب اسے سوچنا تھا کہ وہ کیسے گھر سے نکل سکتی تھی، جبکہ بھابھی اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھیں۔

”اس انسانوں سے بھری دنیا میں میرے لئے بہت جگہ ہوگی کوئی تو مجھے پناہ دے ہی دے گا جب اپنے غیر بن جائیں گے رشتے خون کے رشتے بے دید ہو جائیں بہت اپنے نفرت سے آنکھیں پھیر لیں تو پھر غیروں کو آزمانا ہی پڑتا ہے اور پھر میری کہانی سن کر کوئی مجھ پر ترس کھائی لے گا۔“ وہ بستر پر لیٹی مختلف انداز سے سو رہی تھی۔

جب کبھی زندگی کو سوچتا ہوں ہر گھڑی تنگی کو سوچتا ہوں تیرے ہونے سے سب مکمل تھا آج تیری کمی کو سوچتا ہوں خواہشیں راکھ ہو گئیں جس سے میں اسی بے بسی کو سوچتا ہوں تجھ سے احساس کا ہے ربط عجیب کب کہاں میں کسی کو سوچتا ہوں دل کے صحرا میں جب غبار اٹھے قطرہ قطرہ میں تجھ کو ہی سوچتا ہوں ”مریم نے جاب چھوڑ دی ہے بس ہولی ہیں نا کچھ گویلو مجبوریاں، اب بی بی میں سمجھیں تفصیل کیا بتاؤں، ہاں سب کو کہہ دینا، اب وہ ہاسپٹل بھی نہیں آئے گی۔“ سوچتے سوچتے جب اس کا دماغ شل ہو گیا تو اس نے اپنا دھیان باہر سے آتی بھابھی کی درشت آواز پر لگا دیا جو فون پر کسی سے مخاطب تھیں اور ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ فون ہاسپٹل سے آیا تھا، کس نے کیا ہوگا، سب مجھے مس کر رہے ہوں گے، تہینہ، یعنی، ثانیہ، رابعہ کون ہوگی فون پر، اپنی دوستوں کو یاد کر کے

اس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

”میرے مرلیض، میری مسیحا کے منتظر، سب مجھے یاد کر رہے ہوں گے، وارڈ نمبر دو کے ہیڈ نمبر انیس کا بوڑھا مرلیض، تو یقیناً مجھے کوس رہا ہو گا میری شکل میں اسے اپنا مرحوم بیٹی کی صورت نظر آئی تھی وہ تو میرے سوا کسی اور سے دوا بھی نہیں کھاتا تھا۔“ آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی، اس نے بھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا، ہر کسی کے ساتھ اچھائی کی تھی، اس کے ماں باپ نے بھی کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا تھا کہتے ہیں ماں باپ کا کیا اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے اس نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر آخر وہ کیا کام ہوگا جو اس کے والدین سے سرزد ہوا اور سزا اسے مل رہی تھی اس کی یادداشت میں ایسی کوئی بات ایسا کوئی کام نہیں تھا، پھر اسے یاد آگیا اس کے ماں باپ کے عظیم الشان غلطی سہمی بیگم کا انتخاب، وہ عورت تھی جو غلط انتخاب کے طور پر اس گھر میں آئی تھی اور جس کے آنے سے آج وہ برباد ہونے جا رہی تھی۔

شام آہستہ آہستہ ڈھلنے لگی تھی، سب ڈی روحوں کو اپنے اپنے گھر لوٹنے کی جلدی تھی، کیا جانور اور کیا انسان سب سکون کی خاطر گھروں کو واپس جا رہے تھے اور مریم سکون کی خاطر اپنے گھر کو چھوڑنے والی تھی، آج کی رات سب گھروں میں سکون سے سوئیں گے اور وہ شہر کی سڑکوں پر بھٹک رہی ہوگی۔

اس نے ایک شاپنگ بیگ میں اپنے چند جوڑے اور کچھ ضروری سامان رکھ لیا تھا وہ سب کے سونے کا انتظار کر رہی تھی پھر اسے اس گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دینا تھا، یہ اب اس کے ماں باپ کا گھر نہیں رہا تھا، سہمی بیگم کی راجدھانی تھی جس کے سیاہ و سفید کی وہ مالک تھی۔

”میں کیا کرنے جا رہی ہوں، ایک عورت

کی نفرت کی خاطر اپنے مرے ہوئے ماں باپ کے نام کو بیٹہ لگانے، میں اس گھر سے چلی جاؤں گی تو سہمی بیگم کی پچھلی تمام باتوں پر تصدیق کی مہر ثبت ہو جائے گی، وہ دنیا والوں کو بھی نہیں بتائے گی کہ میں نے کس ظلم سے بچنے کی خاطر گھر چھوڑا وہ تو سب کو بتائے گی کہ میں کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہوں، لوگ مجھ پر تھو تھو کر س گے میرے بھائی کا سر جھک جائے گا، احتشام الحق کی محبت بے وفائی کا نیبل لگا دے گی اور میرا مقدس پیشہ جس کے ساتھ میں وابستہ ہوں لوگ اس پر بھی پتھر اچھالیں گے، میرا ایک غلط قدم میری باقی دوستوں کی بدنامی بن جائے گا۔“ رات گھبری ہو گئی تھی وہ گھر سے باہر نکلنے کے لئے دروازہ کھولنے والی تھی مگر یہ سوچیں اس طرح اس پر حملہ آور ہوئی تھیں کہ وہ واپس اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر گئی تھی، اس نے اپنے بڑھتے قیام روک لئے تھے، اسے اب فرار کی ضرورت نہیں تھی وہ اس عورت کے ظلم و شتم کا نشانہ بننے کے لئے تیار تھی، وہ ایک اچھی بیٹی تھی اچھی بہن تھی اور با وفا محبوبہ تھی وہ ایسی ہی رہنا چاہتی تھی، وہ کسی کے لئے بھی بدنامی کا سبب نہیں بننا چاہتی تھی، اس کے لئے بے شک اسے عبد القدوس کے حوالے کیوں نہ کر دیا جاتا۔

☆☆☆

دو گھنٹے بعد اس کا نکاح تھا، بس دو تین لوگوں کو نکاح کے لئے بلایا گیا تھا، سب کچھ ایسی خاموشی سے ہو رہا تھا کہ جیسے کسی کی موت کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔

”یہ بہن لیدا، نکاح خواں آنے والا تھا ساتھ ہی تمہارا دولہا بھی۔“ اس نے رو رو کر اپنا حشر کر لیا تھا بھابھی اس کے کمرے میں آئی تھیں اور ہلکے گلابی رنگ کا چمکتا ہوا جوڑا اور کچھ چیزیں اس کے قریب پھینک کر چلی گئی تھیں، وہ بے بسی سے اس جوڑے کو دیکھتی رہی تھی اور دل لہو رنگ

ہوتا رہا تھا۔

باہر سے باتوں کی آواز آنے لگی تھی یقیناً مہمان آگئے تھے، مریم نے گھبرا کر کانوں پر تکیہ رکھ لیا تھا وہ ان کی آوازوں سے بچنا چاہتی تھی، وہ کچھ ساعتوں تک تو سکون چاہتی تھی۔

سہمی بیگم چیزیں مریم کے پاس پھینک کر جونہی باہر نکلیں تو دروازے سے اندر محض میں آنے والے شخص نے ان کے ہوش اڑا دیئے تھے، انہیں لگا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہیں، انہوں نے اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھا تھا وہ کوئی خواب یا سیراب نہیں تھا، احتشام الحق تھا، جو سفری بیگ تھامے اب محض کے وسط میں کھڑا تھا اور اسے اپنی آپا کے سائت و جلد وجود کو دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی، کہ وہ اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنے کی بجائے سکتے ہیں کیوں آگئی تھیں۔

”آپا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ اس نے بیگ زمین پر رکھا تھا اور تیزی سے ان کے قریب آیا تھا۔

”تیت..... تم کیسے آئے ہو۔“ آج آپا کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی، سوال کچھ تھا جواب کچھ اور آیا تھا۔

”اسے کوچ سے آیا ہوں۔“ اسے مذاق سوچھا تھا، وہ مسکرانے لگا تھا، سہمی بیگم کو یہ مذاق ایک آنکھ نہیں بھایا تھا، کیا تھا اگر یہ دو گھنٹے صرف دو گھنٹے اور لیٹ ہو جاتا، انہیں ساری پلاننگ خاک میں ملتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

آپا کے چہرے پر ایسا کچھ تھا کہ احتشام کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا، گھر میں بہت سناٹا تھا، مگر اس سناٹے میں بھی ان دیکھی پچھلی سی محسوس ہو رہی تھی۔

”سہمی..... سہمی بیگم کہاں ہو بھی، مہمان بس آنے والے ہیں، میں یہ چیزیں لے آیا ہوں۔“ اس کے بہنوئی صاحب مختلف شاپر ہاتھ میں تھامے غلٹ میں گھر میں داخل ہوئے تھے اور

احتشام کو دیکھ کر ذرا حیران ہوئے تھے پھر اس کے پاس آکر اس کی خیریت پوچھنے لگے تھے۔
”کیسے مہمان آرہے ہیں۔“ احتشام ان سے بغل گیر ہوتے ہوئے پوچھنے لگا تھا۔

”ابھی مریم کا نکاح ہے۔“ احتشام گھر کا بندہ تھا اس لئے اس وقت جب وہ ساری کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھنے والا تھا اسے بتانا ضروری ہو گیا تھا۔

”مریم کا نکاح؟“ اس پر تو آسمان ٹوٹ پڑا تھا، اس کی آواز دور نہیں کھائی سے آئی تھی۔
”ہاں۔“

”مگر اتنی جلد بازی میں کیوں؟ یہ شادی والا گھر تو نہیں لگ رہا، پھر نکاح کیسے اور کس کے ساتھ ہو رہا ہے۔“ وہ بے ربط سا بول رہا تھا، اسے اس پچھلے بچاتے سائے کے پیچھے کوئی بڑی کہانی نظر آرہی تھی۔

”ادھر آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ سلٹی بیگم اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آئی تھیں اور جس طرح شوہر کے کان بھرے تھے انہی الفاظ میں احتشام کو سب کچھ بتانے لگی تھیں، احتشام نے بڑی سلی سے بہن کی بات سنی تھی اور جیسے ہی ان کی بات ختم ہوئی تھی وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور تیزی سے بہن کی جانب بڑھا تھا۔

”مریم جیسی بھی ہے جس کردار کی بھی مالک ہے جو بھی اس نے کیا ہے میں اس کو اپنانے کو تیار ہوں، بھائی جان اب آپ کا دل چاہے تو عبد القدوس کا پر و پوزل مان لیں یا پھر مجھے یہ سعادت بخش دیں۔“

”مم..... مگر احتشام تو.....“ مریم جیسی بھی تھی ان کی بہن تھی، احتشام اتنی سونہیں ہزار نہیں لاکھوں درجے عبد القدوس سے بہتر تھا اور پھر اگر وہ سب کچھ جانتے ہو جتے مریم کو اپنانا چاہتا تھا تو انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

”میرے لئے اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہوگی۔“ انہوں نے سوچنے میں ایک لمبھی نہیں لگایا تھا اس پل سلٹی بیگم کے تاثرات دیکھنے والے تھے۔

☆☆☆

اس نے برستی آنکھوں کے ساتھ چمکتا دمکتا گلابی جوڑا پہن لیا تھا، نکاح خواں اندر آیا تھا اور اس سے اسباب و تمول کے تمام مرحلے طے کروا لئے گئے تھے۔

”مبارک ہو۔“ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب ایک شناساسی دل کھینچنے والی آواز ساعتوں کے بے حد قریب سے ابھری تھی، اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور وہ دھن دھن جال سامنے ہی تو کھڑا تھا، مریم نے اپنی نم آنکھیں اس کے سر پر پڑکا دی تھیں جن سے ایک ہی شکوہ پھوٹ رہا تھا کہ موت کی وادی میں جانے کی مبارک باد ساری دنیا دیتی ہے مگر یہ دھن دھن جال تو نہ دیتا۔

”میں نے کہا مبارک ہو۔“ وہ اس کے سامنے بیڑ پر بیٹھ گیا تھا۔

مریم کو اس کے لہجے کی خوشی اس کی اس کے سامنے بیٹھنے کی جسارت ایک آنکھ نہ بھائی تھی، وہ کھسک کر دیوار کے ساتھ لگ گئی تھی، اگر سلٹی بیگم آجائیں تو جانے اب اس کے لئے کیا سزا تجویز کریں اسے یہی خوف بہت تھا۔

”کچھ تو بولیں مریم، کیا نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“ وہ اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا تھا۔

”جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے، اس کے بعد بھی بولنے کی کچھ محاش رہ جاتی ہے۔“ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

”یار اتنا بھی برا نہیں ہوا۔“ وہ شاید مسکرایا تھا۔

”کنک..... کیا اس سے زیادہ برا کسی کے ساتھ اور کیا ہو سکتا ہے۔“ اس سے مریم کو وہ

بالکل اپنی اپنی زبان بولتا ہوا لگا تھا، اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی، محبوب ایسا بے وفا نکلتے تو دکھ تو بے تحاشا ہوتا ہے۔

”مریم احتشام لاحق صلبہ اگر آپ کو رونے سے فرصت ہوئی اور آپ نکاح نامے پر نظر دوڑائیں تو آپ کو بخوبی پتہ چل جاتا کہ آپ عبد القدوس صاحب کی نہیں بلکہ احتشام الحق کی زندگی میں داخل ہو گئی ہیں۔“

”انکشاف تھا یا دھماکہ۔“ مریم تو اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی۔
”آپ میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں کر رہے ہیں۔“

”یہ مذاق ہے۔“ اس نے نکاح نامے کی کاپی اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی تھی اور مریم کے اعصاب اتنے مضبوط نہ تھے کہ سب کچھ سہہ جاتے، وہ کھڑے کھڑے لہرا کر بیڑ پر گر گئی تھی، احتشام اتنی پانی لینے باہر کو دوڑا تھا۔

☆☆☆

یہاں خاموش نظروں کا سہارا کون بنتا ہے بہت گہرے سمندر کا کنارہ کون بنتا ہے چلو ہم دیکھتے ہیں خود کو اب برباد کر کے بھی کہ ان بربادیوں میں بھی سہارا کون بنتا ہے سلٹی بیگم نے ان لوگوں سے مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا، اس دن اور اسی وقت احتشام مریم کو ہوش میں آتے ہی ساتھ لے کر اس گھر سے نکل آیا تھا، اس نے اپنی ماں کو آکر ساری کہانی سنا دی تھی، وہ بیٹی جیسی نہ تھیں بلکہ سلٹی بیگم جانے کے گھر میں بیٹیسی سوچ لے کر پیدا ہوئی تھیں۔
حیرت ہوئی تھی، احتشام کے گھر میں آکر مریم کو سب کچھ ملا تھا، محبت بھی عزت بھی اور جاہت بھی، اس نے دوبارہ سے جاب شروع کر دی تھی، کہ احتشام کے نزدیک یہ فرشتوں سا پیشہ تھا، سلٹی بیگم کو جب اپنے بیکے میں بستی مریم کی کوئی خبر جرتی تھی ان کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے

تھے۔
”مگر مریم آج بھی سطرچی کی سلٹی بیگم اپنے دل کو وسیع کر کے اسے گلے سے لگا لیں۔“

”کچھ پھل لینے ہیں اور کچھ منھائی۔“ آج وہ احتشام کے ساتھ آؤنگ کے لئے باہر نکلی تھی لیکن بازار جا کر اس کا ارادہ بدل گیا تھا اس نے احتشام سے فرمائش کی تھی۔
”وہ کیوں۔“

”بس لیں نا پھر بتاتی ہوں۔“ احتشام نے پھل اور منھائی لے لئے تھے۔
”اب بھیا کی طرف چلیں۔“ اگلی فرمائش اور بھی حیران کن تھی۔

”مگر مریم.....“ احتشام سنجیدہ سا ہو گیا تھا، اسے مریم کے ساتھ اپنی آپا کا سلوک آج بھی یاد تھا۔

”بس آپ چلیں نا، پھل کسی کو تو کرنا ہے نا، وہ اپنی خود نہیں چھوڑتے تو ہمیں اپنی نہیں چھوڑنی چاہیے۔“ مریم نے بڑے پن سے کہا تھا اور احتشام نے بائیک آپا کے گھر کی طرف موڑ لی تھی جب اس کی بیوی کا ظرف بڑا تھا تو اس کا کیوں چھوٹا ہوتا۔

”تت..... تم جانتے ہو انہیں؟“ اس کے چہرے کے تاثرات نے نازو کو بے حد ٹھٹھا دیا تھا، اس نے بے یقین نظروں سے صالح کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا، جس کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کا دریا اُٹھ آیا تھا۔

”جی..... کیا یہ حسان کے پایا ہیں؟“ اس نے خود ہی بے تابانہ انداز میں پوچھا تھا۔

”ہاں۔“ انہوں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے

ناولٹ

انہیں۔“ صالح کے چہرے یہ جھلنے لگے کہ اسے آثار تھے، اس نے نازو کو بھی مضطرب کر دیا تھا، بار بار اس کا دل دھڑک دھڑک کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ سامنے بیٹھا لڑکا اس کے لئے اچھی نہیں، ان دونوں کے بیچ کوئی گہرا تعلق ہے۔

”مم..... مم..... میں۔“ صالح نے اپنی پوری قوت صرف کر کے کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن الفاظ بول کے کانٹوں کی طرح اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے تھے، وہ بیچارہ اپنے لبوں کو چل کے رہ گیا۔

نازو کی بے چینی تھی کہ حد سے سوا تھی اور صالح کے لب تھے کہ باہم مضبوطی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے، کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے لب پھڑ پھڑا کے پھر خاموش ہو گئے

”یہ لو، آج تم میرے ہاتھ کی کانی کے ساتھ ساتھ یہ ایک بھی ٹیٹ کر دو، جو اگرچہ میں نے نہیں بنایا، لیکن اگر میں بنانا تو یقیناً اس سے



بھی مزیدار بناتا۔“ حسان گرم بھاپ اڑاتی
کافی کے گنگ کے ہمراہ ایک لئے بوئے خوشگوار
موڈ میں اندر داخل ہوا تھا۔

ناز و تو اسے اندر آتا دیکھ کر سنبھل کے بیٹھ گئی
تھی، جو بھی حقیقت تھی وہ فی الحال حسان سے مخفی
رکھنا چاہتی تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ اپنے باپ کے
بارے میں کیسی رائے رکھتا ہے، البتہ اس کا
اندازہ اتنا ضرور تھا کہ وہ اپنے باپ کے تذکرے
پر ہزار سا ہو جایا کرتا تھا، البتہ ناز و کے ادب کا
ظاہر کر کے وہ بھی اسے اس تذکرے سے نوک
نہیں پایا تھا، لیکن اس کے چہرے پر جو تناؤ کی
کیفیت پیدا ہو جاتی تھی وہ ناز و کو پریشان کر دیتی
تھی، جسے ہمیشہ وہ جھٹکنے کی کوشش کرتی۔

”مجھے امید ہے کہ اگر میرا بیٹا ایک بناتا تو
اس سے کئی گنا اچھا بناتا۔“ ناز و نے مسکراتے
ہوئے کہا، اس کا مقصد حسان کی توجہ اپنی طرف
مبذول کروانا تھا، کیونکہ اگر وہ صاحب کی حالت پر
غور کر لیتا تو یقیناً چونک جاتا۔

یہ بھی شکر تھا کہ وہ کافی بنانے میں مصروف
تھا، ان کے ماتین ہونے والی گفتگو سے لاعلم تھا،
ورنہ وہ ضرور بال کی کھال اتار کے چھوڑتا، ناز و
کی قصد کی گئی کوشش کامیاب رہی تھی، وہ ناز و
کی طرف گھوم گیا تھا، صاحب پر اس نے زیادہ غور
نہیں کیا تھا۔

”امید کیوں؟ آپ کو یقین کیوں نہیں ہے
کہ آپ کا بیٹا بہت مزے کا ایک بیک کر سکتا
ہے۔“ اس نے گردن کو اڑاتے ہوئے خیر یہ لہجے
میں کہا تھا۔

”یقین تو کھانے کے بعد ہی کیا جاسکتا
ہے، پہلے تو صرف امید باندھی جاتی ہے۔“ ناز و
نے گویا بڑے تپے کی بات کی تھی۔

”ایسے یقین کا کیا فائدہ۔“ وہ برا سامنے
بناتے ہوئے بولا، پھر کافی کا گنگ ناز و کی طرف
بڑھاتے ہوئے بولا۔

”چلیں یہ کافی تو پیئیں جس کے خوش ذائقہ
ہونے کا آپ کو سو فیصد یقین ہے۔“

”بالکل۔“ ناز و نے مسکراتے ہوئے کافی
کا گنگ تھام لیا۔

حسان سے گفتگو کے دوران ان کی نظریں
گاہے گاہے صاحب کا جائزہ لے رہی تھیں، جو ابھی
تک بے یقینی کی کیفیت میں مغموم بیٹھا تھا۔
”یہ لو بار! تم بھی پیو۔“ حسان کی آواز
اسے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لائی۔

”تو اسی لئے مجھے اس سے اس قدر اجنبیت
محسوس ہوتی تھی کہ اس لڑکے سے میرا کتنا گہرا
خونی رشتہ ہے۔“ کافی کا گنگ پکڑنے کی بجائے
وہ ایک گنگ اسے دیکھ گیا۔

”کیا بات ہے مجھی کہیں میرے سر پر
سینگ تو نہیں اگ آئے۔“ اسے یوں ہلکی باندھ
کر اپنی طرف دیکھتا یا کر حسان نے اپنے سر پر
نادیدہ سینگوں کو تلاش کرتے ہوئے کہا تھا۔

”صاحب بیٹا! آپ کی کافی ٹھنڈی ہو رہی
ہے۔“ ناز و نے دانستہ ذرا اونچی آواز سے اسے
مخاطب کیا تھا۔

وہ چونک کر سیدھا ہوا، ناز و کی آنکھوں میں
اسے ایک التجا نظر آتی تھی، گہرا سانس بھرتے
ہوئے اس نے کافی کا گنگ تھام لیا، حسان بھی اپنا
گنگ لئے اس کے برابر آکے بیٹھ گیا تھا۔

ابھی اس نے کافی کا ایک گھونٹ ہی بھرا
تھا، جب اس کے موبائل پر ہپ ہونے لگ گئی،
گنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے جینز کی سائیڈ
پاکٹ سے تیل نکالا تھا، جس کی اسکرین پر ”ماما
کالنگ“ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔

”جی ماما! السلام و علیکم!“ اس نے یس کا
یشن پریس کر کے تیل کان سے نکالا۔

”ماما! میں حسان کی طرف ہوں۔“ وہ اپنی
موجودگی کا بتا رہا تھا۔

”او کے I am coming۔“ تیل

اپس پاکٹ میں ڈالتے ہوئے وہ اب حسان کی
طرف متوجہ ہوا تھا۔

”او کے مجھے اب اجازت دو، ماما کا فون
تھا، گھر میں کچھ گیٹ آئے ہیں۔“ وہ کہنے کے
ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

”تو کیا تم نے مہمان نوازی کرنی ہے۔“
حسان بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

”ممکن ہے کرنی پڑ جائے۔“ اس نے ہلکا
ماز بردستی مسکراتے کی کوشش کی تھی اور ناز و سے
سلام لیتے ہوئے حسان کے ہمراہ باہر نکل گیا۔

ناز و اپنے دل میں بے چینی کی خلش لئے
ابھی بیٹھ رہی تھی۔

”مجھے صاحب سے بہت جلد احمد کے بارے
میں پوچھنا ہے۔“ اس نے دل میں مغموم ارادہ کیا
اور صاحب سے اگلی ملاقات کے متعلق سوچنے لگی۔

☆☆☆
”آؤ بیٹھو۔“ ناز و نے اگلے دن ہی صاحب
کو اپنے بوتیک میں انوائٹ کر لیا تھا، حسان ان
کی اس ملاقات سے بے خبر تھا۔

”ٹھیک یو۔“ اس نے چیئر سنبھالتے
ہوئے کہا تھا۔

”چائے لو گے یا کافی؟“ وہ انٹرکام کی
طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔

”کافی تو اب صرف حسان کے ہاتھ کی ہی
ہی لگتی ہے، آپ چائے منگوائیں۔“ وہ مسکراتے
ہوئے کہنے لگا، ناز و نے نوٹ کیا وہ کافی حد تک
ہلکے سنبھال چکا تھا، گل والی کیفیت یکسر ختم ہو چکی
کی اور اس بات نے ناز و کو بھی کافی حد تک
طمینن کر دیا تھا کہ وہ مضبوط اعصاب کا سمجھدار
”کا ہے۔“

”او کے۔“ سر ہلاتے ہوئے اس نے دو
کپ چائے آرڈر کی تھی۔

اگرچہ اس کے اندر بے تابی اور اضطراب کا
مندھڑکنا نہیں مار رہا تھا۔

تاہم اس نے خود کو بظاہر پرسکون بھی رکھا
تھا، بیون چائے رکھ کے جا چکا تھا، ناز و نے
آداب میزبانی نبھاتے ہوئے اسے چائے بنا کر
دی تھی۔

”جی..... اب پوچھئے آپ مجھ سے کیا
پوچھنا چاہتی ہیں۔“ صاحب نے چائے کا سیپ
لیتے ہوئے ناز و سے کہا تھا۔

کل سے وہ خود بھی بہت بے چین تھا،
ہزاروں سوال سے اس کے دل و دماغ میں کلہا
رہے تھے، اس نے محسوس کیا تھا، ناز و حسان کے
ساتھ اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھی، لہذا
وہ بہت بے گل ہونے کے باوجود خاموش رہا تھا،
وہ خود کی ایسے موقع کا تلاشی تھا جب حسان گھر
نہ ہو اور وہ کھل کر ناز و سے بات کر سکے، لیکن ناز و
نے آج خود ہی اسے فون کر کے اسے بوتیک پہ
انوائٹ کر لیا تھا، صاحب ایک منٹ کی بھی تاخیر
کیے بغیر ماما کو ایک ضروری کام کا کہہ کر اسی وقت
نکل آیا تھا۔

”سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ حسان کے پایا
احمد صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔“ وہ سوال جو
اس کے لبوں پہ چل رہا تھا اس نے فوراً داغ دیا
تھا۔

”وہ میرے ابو ہیں۔“ وہ نہایت سکون سے
گویا ہوا تھا۔

ناز و چند لمحوں کے لئے اپنی جگہ پر ساکت
ہو گئی تھی، اس کی تخیل و بے یقین نگاہیں صاحب کے
چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔

”کل..... لیکن میں تو تمہارے فادر سے مل
چکی ہوں۔“ اس کے حواس کسی قدر ٹھکانے پہ
آئے تو فوراً ہی اس کے ذہن میں صاحب کے پایا
کی تصویر کی کوندے کی طرح لپکی تھی۔

ایک تقریب کے موقع پر صاحب نے اپنی ماما
اور پایا کا تعارف اس سے کروایا تھا۔

وہ میرے فادر نہیں میرے چاچو ہیں،

ابتداء سے اپنی کہانی کا آغاز کیا تھا۔
کچھ وعدے، تمسک، یادیں تھیں
کچھ تہمت تھے فریادیں تھیں
کچھ آنسو تھے جو بہائے تھے
کچھ دھوکے تھے جو کھائے تھے
کچھ بکسوں کی پرچھائیاں تھیں
کچھ دل کو روک دیا گئے تھے
اب پاس ہمارے کچھ بھی نہیں۔
اب اس کے مارے کچھ بھی نہیں
بس.....

یادوں کی ذخیریں ہیں
کچھ رنگ اڑی تصویریں ہیں
کچھ لفظ کی تحریریں ہیں
اک دل جو دیکھ پایا سا ہے
بس یہی میرا اثاثہ ہے
بس یہی میرا اثاثہ ہے

ناز و ابی داستان سنا کر خاموش ہو چکی تھی،
آنسوؤں کی لڑیاں قطار کی صورت میں اس کے
رخساروں پہ بہہ رہی تھیں، اس نے صراخ سے
کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی، ایک دفعہ
پہلے اس نے احمد کو اپنی جتاسانی تھی جو بہت وسیع
القلب تھا، جس نے اسے ملاہمت کرنے کی
بجائے اس سے رشتہ جوڑا تھا اور بھی اسے اس کی
غلطی پہ عار نہیں دلائی تھی، بلکہ اپنا نام دے کر
اسے معاشرے میں مستتر ٹھہرا تھا اور اپنی نشانی
حسان کی شکل میں اسے دے کر تو گویا اس پر
احسانات و انعامات کی حد ہی کر ڈالی تھی، وہ احمد
عبدالرحمن جیسا شخص ملنے پر ساری زندگی بھی خدا
کا شکر ادا کرتی تو کم تھا۔

آج مد مقابل اسی شخص کا بیٹا تھا، جس میں
اس نے احمد کی جھلک دیکھی تھی، اس کی خوشبو
محسوس کی تھی، صراخ کے بہت سے انداز و اطوار
احمد سے ملتے تھے، اسی لئے آج اس نے اپنے
دل کا بوجھ اس کے سامنے اتار دیا تھا، تاکہ اس

کا بوجھ تھا اور میں دن رات اپنے اللہ سے یہ
دعا میں کرتی تھی کہ وہ اس بوجھ کو ہلکا کر دے،
جب مردوں تو پرسکون ہوں گے مردوں، میرا کسی پہ
ضرر نہ ہو، نہ ہی میں کسی کے مقروض ہوں آج
میں اپنے سامنے دیکھ کر میں پھر اس ذات
قدس کے سامنے سجدہ ریز ہونا چاہتی ہوں، جس
نے میری اس خواہش کو بھی پورا کر دیا۔ اس کی
آنکھیں احساس تشکر سے اشک بار ہو گئی تھیں۔
”میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی
کہ حسان کی اچھی تربیت کر سکوں اور شاید میں کسی
حد تک اس میں کامیاب بھی رہی ہوں، لیکن پھر
بھی مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے باپ
سے متاثر ہے، اس نے بھی ایسا کہا تو نہیں لیکن
ماں ہوں ناں، میں تو اس کے دل کے اندر تک
بھاٹک جیتی ہوں، میں چاہتی تھی کہ اس کی ذات
میں کوئی خلا نہ رہے وہ ایک کامیاب مرد بن کے
زندگی گزارے، میں نے اسی لئے اسے بھی اس
کے باپ کے بارے میں نہیں بتایا، لیکن اب مجھے
لگتا ہے کہ شاید میں نے غلطی کر دی، مجھے اسے
سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا، لیکن اب تو پولوں کے
نیچے سے بہت سایا بی گزر چکا، اس بات کا فیصلہ تو
اب نہیں کرنا ہے کہ میں نے سچ کیا یا غلط۔“ وہ
اندھنیے کو حال میں سانس لینے کو رکھی کیونکہ اب
اسے صراخ کے ہمراہ اپنے ماضی میں سفر کرنا تھا۔

بہت طویل
بہت محنت
ساہا سال کی آبلہ پائی بہ مشتمل
لفظ لفظ آنسوؤں کی داستان کے ہمراہ
زخم زخم وجود لئے

”میرا نام نازین ہے، میں ایک چھوٹے
سے گاؤں کی رہنے والی تھی، میرے والدین
بہت سادہ تھے، میری ضد پہ میرے ابا نے مجھے
آج میں داخلہ دلوا دیا تھا، وہاں میری ملاقات
مرین عرف میری سے ہوئی تھی۔“ اس نے بالکل

ہوئے بوجھا تھا۔
”کچھ کہ نہیں سکتا، ماما، بابا مجھ سے بہت
محبت کرتے ہیں، میں ان کے اعتماد کو نہیں
پہنچا سکتا، میری خواہشات اپنی جگہ، لیکن ان کا
احترام ہر حال میں مجھ پر واجب ہے۔“ اس نے
ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔
”احمد کے بیٹے کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔“
اس کی آنکھوں میں ٹپکھیل گئی۔

”حسان بھی تو ان کا ہی بیٹا ہے۔“ صراخ
نے کہنا چاہا تھا لیکن وہ کہ نہیں پایا۔
کل سے ایک بات پچاس کی طرح اس
کے سینے میں اگی ہوئی تھی، اس کے ابو احمد عبد
الرحمن نے دوسری شادی کیوں کی؟ اور وہ بھی
خفیہ، پھر ان میں سے ان کا ایک بیٹا بھی تھا، اگر
انہوں نے شادی کر ہی لی تھی تو اسے جی کیوں
رکھا؟

حسان اپنے والد کے بارے میں بغض رکھتا
تھا اس نے الگ اسے پریشان کر رکھا تھا، جب
اسے علم ہو گا کہ ان دونوں کا باپ ایک ہی ہے تو
کیا وہ انتقام لینے سے باز آئے گا؟ سعود تو وہ
وقت اپنے بڑے بھائی احمد عبدالرحمن کی تعریفوں
سے رطب اللسان رہتا تھا، خود اپنا بیٹا دے کر
انہوں نے جو اپنا رکی اعلیٰ مثال قائم کی تھی اس
گواہ تو خود صراخ تھا۔

”کہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو سب
کے یا کم میرے علم میں نہیں ہے۔“ اس نے
دل نہ کہا تھا۔
اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ساری حقیقتیں
اسے حسان کی، ماما کے علاوہ اور کوئی نہیں بتا سکتا
اسی لئے وہ آج کے سامنے موجود تھا اور پہلے
انہیں اپنی کہانی سنا چکا تھا اور اب ان کی سننے
لئے بے تاب وہ بے قرار تھا۔
”صراخ بیٹا! بہت ساری باتیں ایسی ہیں
میں بھی کسی سے نہیں کہہ سکی، میرے دل پہ بہ

میرے چاچو نے مجھے ایذا پہنچا دیا تھا، شروع میں
ہم سب اکٹھے مل کر رہتے تھے، میری مین ہمیشہ
ہیں، ایک کی وفات بچپن میں ہی ہو گئی تھی اب دو
ہیں، میری چھوٹی بہن کی پیدائش کے وقت
ڈاکٹرز نے میری امی سے کہا تھا کہ اب وہ دوبارہ
کبھی ماں نہیں بن سکتیں، میں ان کا انکوتا بیٹا تھا،
میری ماما یعنی میری چچی کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ
کہیں ان سے مجھے چھین نہ لیا جائے، کیونکہ ان
کے گھر تو کوئی اولاد ہی نہیں تھی، پھر ماما کے بے
حد اصرار پر بابا لندن شفٹ ہو گئے، میں اس
وقت پانچ سال کا تھا۔“ وہ کسی غیر مرمی لفظ پہ
لگا ہیں جمائے اسے اپنے آپ بیتی سنا رہا تھا،
جبکہ ناز و دم بخود اسے سن رہی تھی۔

”پھر تب سے لے کر اب تک میں کبھی
پاکستان نہیں گیا، ماما میری محبت میں بہت زیادہ
پوزیو ہو چکی ہیں، انہیں ابھی تک یہ ڈر ہے کہ اگر
میں پاکستان گیا تو میرے والدین مجھے واپس
نہیں آنے دیں گے، ان کے جنون کا تو یہ عالم
ہے کہ انہوں نے بھی میری تصویر تک میرے گھر
والوں کو نہیں دکھائی مبادا میری شکل انہیں بے
چین نہ کر دے، البتہ میرے پاس سب کی
تصویریں ہیں، جو میرے کزنز وقتاً فوقتاً مجھے سینڈ
کرتے رہتے ہیں۔“ ایک گہری سانس بھرتے
ہوئے وہ خاموش ہو گیا تھا، ناز و کو اس کا لہجہ بھیگا
ہوا محسوس ہوا تھا۔

اگرچہ راحیلہ اور سعود نے اسے پھیلی کا
چھال بنا کے رکھا ہوا تھا، اس کے ہر خواہش کو اس
نے لبوں پہ آنے سے پہلے ہی پورا کر دیا گیا تھا،
لیکن پھر بھی اپنے خونی رشتوں سے ملنے کی
خواہش بھی بکھار اس کی ہر خواہش پہ حاوی ہو
جاتی تھی، یہ ایک ایسی خلش تھی جو بچپن سے لے
کر اب تک اس کے ساتھ ساتھ پیڑی رہی تھی۔
”تو کیا تم کبھی پاکستان نہیں جاؤ گے؟“
ناز و نے اس کی یاسیت بھرے چہرے کو دیکھتے

کے مرنے کے بعد کوئی سو اس کے بیٹے کو حقیقت حال سے آگاہ کر سکے، کوئی تو ہو جو اس کی ذات میں موجود غلطی کو بر کر سکے۔

صالح کو بھی اپنے گال گیلے ہوتے محسوس ہوئے تھے، کمرے میں قبر کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی، دونوں نفوس ہی اپنے اپنے خیالوں کی یلغار میں بھٹنے ہوئے تھے۔

”نہیں میرا فیصلہ کس حد تک لگا ہے بیٹا!“ طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے بالآخر نازو نے اس سے دریافت کیا تھا، جسے نت نئے انکشافات نے جامد و ساکت کر ڈالا تھا۔

صالح نے گہری سوچوں کے آنکھوں کو جھٹکتے ہوئے نہایت عقیدت و احترام سے لبریز آنکھوں سے نازو کو دیکھا تھا۔

”آپ نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ بہت طویل، تنگ اور دشوار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت مبر، حوصلہ اور استقلال بھی مانگتا تھا اور اس امتحان سے آپ کا بخیر و عافیت نکل آنا یقیناً اس میں اللہ تعالیٰ کی خاص مدد و نصرت آپ کے شامل حال رہی ہے۔“ وہ بولا تو اس کے لہجے و انداز سے حسین آمیز جذبات چمک رہے تھے۔

اور نازو کو یوں لگا تھا کہ جیسے یہ توصیفی کلمات اس کے سامنے بیٹھے صالح نے نہیں بلکہ احمد نے کہے ہوں، اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر تشکر کے آنسوؤں نکل پڑے تھے۔

صالح اپنی جگہ سے اٹھ کر نازو کے پاس آیا، اس کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے نازو کے گود میں دھرے ہاتھوں کو تھاما تھا اور چوم کر نہایت عقیدت سے آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا تھا۔

”جس ماں کے دو جوان بیٹے ہوں، اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہونے چاہیے۔“ نازو کے آنسوؤں میں مزید روائی آ گئی تھی، اس نے صالح کو خود سے لگا لیا تھا اور دیوانہ وار اسے

چومے جا رہی تھی۔

”میرا صالح..... میرا بیٹا..... میرے احمد کی نشانی..... اے خدا! میں حقیر سی بندی تیرا جتنا شکر ادا کروں اتنا ہی کم ہے، میں ایک بچے کو ترستی تھی تو نے مجھے دودو بیٹے دے دیئے۔“ اسے لگ رہا تھا آج اس کے دل سے ہر حسرت ہر غلطی ختم ہو جائے گی۔

”بس اب آپ نے مزید نہیں رونا۔“ صالح نے نشو واکس سے نشوونگ کر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بڑی پیار بھری دھول سے کہا تھا۔

”بیٹا! یہ تو شکرانے کی آنسو ہیں۔“ وہ پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے بولی۔

”شکرانے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں، صرف آنسو بہانے سے ہی شکر ادا نہیں ہوتے۔“ وہ ترنت بولا تو نازو بے اختیار ہنس پڑی۔

صالح نے آج پہلی مرتبہ انہیں ہنسنے ہوئے دیکھا تھا، ورنہ وہ صرف مسکرانے پہ ہی اکتفا کرتی تھیں۔

”شاباش، میری ماما تو بس ہنستی مسکراتی ہی اچھی لگتی ہیں۔“ اسے ہنسا دیکھ کر وہ بھی خوش ہو گیا تھا۔

”اللہ میرے بیٹوں کو ہمیشہ ہنستا مسکراتے رکھے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے تہہ دل سے دعا کی تھی پھر ایک دم کچھ یاد آنے پہ صالح نے پوچھنے لگیں۔

”تمہارے پاس تصویریں تو ہوں گی نا؟ میری بیٹیوں کی، جن کا تم بتا رہے تھے کہ تمہارا دو بہنیں بھی ہیں۔“ ان کے لہجے میں محسوس جانے والی متاعی۔

”جی ہاں ہیں، میرے کمپیوٹر میں ان تصویریں موجود ہیں، میں آپ کو لا کر دکھاؤں میرے ابو اور بچا جان مل کر رہتے ہیں، ان کے بھی دو بچے ہیں، وہب اور ماہا اور میری صاحب

بھینھو راولپنڈی رہتی ہیں، ان کے بھی دونوں بچے منال اور غوری پڑھنے کے لئے بیہیں رہتے ہیں، سب مل جل کر رہتے ہیں اور آئے دن خوب ملہ مکھ چائے رکھتے ہیں، میرے پاس ایک فنیشن کی تمام پیکرز سیف ہیں، غوری نے سب سے چوری مجھے سینڈ کی تھیں، میں آپ کو دکھاؤں گا۔“ وہ بچوں کے سے جوش و خروش سے بولا تھا۔

”ضرور..... میں ضرور دیکھوں گی۔“ نازو نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے تائید کی تھی۔

”ماما! پھر ہم سب مل کر پاکستان چلیں گے بہت مزہ آئے گا، ابو آپ کا اور حسان کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔“ وہ نازو کا ہاتھ پکڑ کے دبے جوش سے بولا تھا، گویا تصور کی آنکھ سے مستقل کا منظر دیکھ رہا ہو۔

نازو کا چہرہ اس کی خواہش پہ ایک لمحے کے لئے پھیکا پڑا تھا، کچھ بھی تھا وہ آج بھی اپنے ”وعدے“ پہ قائم و دائم تھی، اگر اس نے صالح سے یہ سب سنا کر کیا تھا تو اس کا مقصد جان کر احمد کی زندگی کو ڈسٹرب کرنا نہیں بلکہ احمد کے کردار کو صاف کرنا تھا، جو حسان کی خود ساختہ غلطیوں کے نتیجے میں گرد آلود ہو چکا تھا۔

”جو اللہ کو منظور ہوا۔“ وہ آہستگی سے اس کا سر تھپتھا کے بولی، وہ اسی میں خوش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اب وہ حسان ان کی طرف سے مطمئن و پرسکون ہو گئی تھی، اسے صالح کی صلاحیتوں پہ اعتماد تھا وہ جانتی تھی کہ وقت آنے پہ صالح ہی حسان کی سوچ درست کر سکتا ہے، ویسے بھی آج کل اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی، اس کے دل کی بے تحاشہ خواہش تھی کہ وہ ایک بار اپنے پروردگار کا رشتوں بھرا گھر دیکھ لے۔

جج کا سیزن بھی آنے والا تھا، اس نے حسان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ ایک لمحہ خاموشی کے بعد بولا تھا۔

”ماما! ابھی تو آپ کی طبیعت بھی سیٹ نہیں رہتی، آپ اچھی طرح ٹھیک ہو لیں، پھر نیکسٹ ایئر چلیں گے، جب تک میری ایجوکیشن بھی مکمل ہو جائے گی۔“ حسان ان کی خواہش بہت عرصے سے جانتا تھا، لیکن ہر دفعہ ہی کوئی نہ کوئی براہیلم پیش آ جاتی اور ہر دفعہ ہی ان کا پروگرام ٹیکسل ہو جاتا۔

”پتہ نہیں نیکسٹ ایئر تک کون زندہ رہتا ہے، اس سعادت کو حاصل کرنے کے لئے۔“ ان کے لہجے میں ایسی تشنہ حسرت تھی جس نے حسان کو بھی بڑا دیا۔

”آپ پریشان مت ہوں ماما! ہم انشا اللہ اسی سال جاؤں گے۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کے بولا تو نازو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”اللہ میرے بیٹے کو ہمیشہ سکھی رکھے۔“ وہ دنور مسرت سے اس کے ہاتھ کو بوسہ لیتے ہوئے نہایت محبت سے گویا ہوئیں۔

”ڈس از ناٹ سیر ماما! یہ تو خالصتاً لڑکیوں کو دی جانے والی دعا ہے۔“ وہ مسرور۔

”تم میرے بیٹے بھی ہو اور بیٹی بھی۔“ وہ شرارت سے بولیں۔

”کیا..... آ..... آ۔“ وہ احتجاجاً چلا اٹھا، نازو کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر ہنس پڑی۔

اسی اثناء میں لاؤنج میں پڑا ہوا فون جج اٹھا، وہ مصنوعی ناراضگی سے انہیں دیکھتا لاؤنج کی طرف بڑھ گیا، نازو اس کی چوڑی پشت کو دیکھتے ہوئے مسکراتے لگی۔

”ماما! میں ہاسپل جا رہا ہوں۔“ چند سیکنڈ بعد وہ فون سن کے آیا تو نہایت غلٹ میں انہیں مخاطب کر کے بولا۔

”خیریت بیٹا! کس کا فون تھا؟“ نازو کا دل دھڑک اٹھا۔

”صالح کا۔“ وہ مختصر ا کہتا واپس پلٹ گیا، نازو کا دل ڈوبنے لگا، وہ بھی اس کے پیچھے ہی

لیگی۔

”سب ٹھیک ہے؟ کون ہے ہاسپٹل میں؟“ وہ اپنے کمرے سے کی رنگ لے کر نکل رہا تھا جب نازو نے بے تابی سے دریافت کیا ”صالح کے پایا ہیں، مجھے اپنی خود صحت صورتحال کا علم نہیں، وہاں جا کر آپ کو انفارم کروں گا، اوکے اللہ حافظ۔“ تیز تیز لہجے میں کہتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ نازو اپنے ڈوبتے دل سمیت اندر آگئی، صالح اسے بالکل حسان کی طرح عزیز ہو گیا تھا، وہ اٹھ کر وضو کر کے چل دی تاکہ اپنے دوسرے بیٹے کی خوشیاں اللہ سے مانگ سکے۔

☆☆☆

”سعود صاحب کو برین ٹیومر ہے وہ بھی آخری اسٹیج پر۔“ شام کو حسان گھر آیا تو وہ اس کے انتظار میں بیل رہی تھی، یہ خبر اس پہ بجلی بن کے گری گئی۔

”اور صالح۔“ نازو نے سوالیہ نظروں سے حسان کو دیکھا تو وہ نگاہیں چرا گیا۔ ”بہت بری حالت ہے اس کی۔“ وہ مدھم لہجے میں بولا۔

”مجھے بھی نے چلو اس مشکل وقت میں ہمیں ان کے کام آنا چاہیے جبکہ ان کا یہاں اپنا کوئی نہیں ہے۔“ وہ فوراً جانے کے لئے کھڑی ہو گئی تھی۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے ماما! لیکن ابھی اس کے پایا کے کوئیز وغیرہ وہاں صحت ہیں میں اور صالح صبح سے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، انہوں نے زبردستی ہم دونوں کو بیچ دیا ہے، میں صبح جاتے ہوئے آپ کو ساتھ لے جاؤں گا۔“ حسان نے نرم لہجے میں انہیں جانے سے منع کیا تھا۔

”ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں..... کوئی امید؟“ نازو نے رک رک کر خورندہ لہجے میں پوچھا۔ ”ڈاکٹرز نے کہا ہے زیادہ سے زیادہ

اڑتالیس گھنٹے کی زندگی ہے ان کے پاس۔“ اس نے تباہ تو ناز و کو اپنا دل چھٹا ہوا محسوس ہوا۔ ”کتنی عجیب بات ہے ناں ماما! ساری زندگی انہوں نے صالح کو اپنوں سے دور رکھنا چاہا اور آج اس زندگی نے ان سے وفاتہ کی، اب وہ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کے آخری سانس وہ اپنے ملک میں، اپنی سر زمین پر، اپنوں کے ساتھ گزاریں لیکن اب ان کے پاس اتنی مہلت نہیں ہے۔“ حسان کا لہجہ صالح کے غم سے ٹوٹ رہا تھا۔

”بیٹا! ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کی زندگی دراز.....“ وہ جو انہیں درازی عمر کی دعا دیتے جا رہی تھی حسان نے اس کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی۔

”نہیں ماما! ڈاکٹر دیکھتے ہیں ان کی زندگی کی بجائے یہ دعا کرو کہ وہ جس تکلیف میں تڑپ رہے ہیں، انہیں اس تکلیف سے نجات مل جائے۔“ حسان لب کھلتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ”آپ بھی کچھ دیر آرام کر لیں، آپ کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، صبح ہم اسٹے ہسپتال چلے جائیں گے۔“ وہ انہیں آرام کرنے کی تاکید کرتا خود بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

نازو نے اس نازک موقع پر ان سب کا بہت ساتھ دیا تھا، سب سے زیادہ نازک حالت تو راحیلہ کی تھی، جو اپنے محبوب شوہر کو ایس حالت میں دیکھ کر اندر ہی اندر ختم ہوئی جا رہی تھی۔ ”کاش! میں اتنی خود غرضی کا مظاہرہ نہ کرتی تو سعود آج اپنوں کے درمیان ہوتے، ان کو کندھا دینے کے لئے اپنے ہوتے، میری خود غرضی نے انہیں اس حال تک پہنچایا ہے۔“ راحیلہ، نازو کے کندھے سے لگی زار و قطار رو رہی تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے راحیلہ! ہر انسان کو

وہی ملتا ہے جو اس کی تقدیر میں درج ہوتا ہے، اگر سعود صاحب کی تقدیر میں درج ہوتا کہ وہ پاکستان جائیں تو تمہاری کوئی کوشش کوئی دعا کام نہ آتی، تقدیر کے آگے ہر حربہ بے کار اور ناکام ہو جاتا ہے، بس ان کی تقدیر میں یہی لکھا تھا۔“ نازو نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے دلاسہ دیا تھا۔

واقعی نازو کی باتوں سے اس کے دل کو کس قدر تسلی ہوئی تھی، لیکن اس کے دل کی بے قراری حد سے ہوا تھی۔

”میں سعود کے بغیر زندہ رہ کے کیا کروں گی، سعود کے بغیر میرے لئے زندگی بے کار ہے۔“ وہ ایک بار پھر تڑپ تڑپ کے رو دی۔ ”ایسے نہیں کہتے راحیلہ! تمہارا بیٹا ہے اسے تمہاری ضرورت ہے۔“ نازو نے اسے سرزنش کرنے کے ساتھ ساتھ صالح کا حوالہ دیا تھا۔

”وہ بھی میری وجہ سے محرومی کا شکار ہوا تھا، اچھا ہو گا جبکہ میں نہ رہوں گی تو اس کے سامنے راستہ بالکل صاف ہو گا، وہ بلا جھجک سب کی محنتوں کو سمیٹ سکے گا۔“ وہ تو پتھر دل بن گئی تھی۔

”اتنی بابوسی کی باتیں نہیں کرتے، صالح نے گا تو اسے کس قدر تکلیف ہوگی خود کو سنبھالو۔“ نازو نے نرمی سے اس کے بال سنوارتے ہوئے پیار بھرے انداز میں کہا تھا۔

اس کی بات میں واقعی وزن تھا راحیلہ خاموش ہوئی تھی، لیکن اس کے آنسو بدستور جاری و ساری تھے۔

”میں ذرا صالح کو دیکھ لوں، پتہ نہیں بچہ بیچارہ کدھر کھل گیا ہے۔“ وہ صالح کی تلاش میں باہر نکل آئی۔

لفٹ سے نیچے اترتے ہوئے اسے ایک چہرہ جانا پہچانا سا لگا تھا، پہلے تو اس کے ذہن میں

نہیں آیا کہ اس نے اس عورت کو کہاں دیکھا۔ ”مونا!“ دفعتاً اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا، تو وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکی تب تک وہ کافی دور جا چکی تھی۔

”مونا..... مونا..... رکو۔“ فاصلہ قدرے کم ہوا تو نازو اسے آواز دے دینے لگی گئی، مونا نے رک کر پیچھے پلٹ کے دیکھا۔

”کتنی ہو مونا!“ اس کے قریب پہنچتے پہنچتے نازو کی سانس پھول گئی تھی، تاہم وہ اس کے پاس پہنچ کے ہی رک گئی۔

”تم نازنین ہو ناں؟“ نازو کی توقع کے برعکس اس نے فوراً اسے پہچان لیا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے سر اثبات میں ہلایا، پھر تعجب آمیز لہجے میں استفسار کرنے لگی۔

”تم نے مجھے اتنی جلدی کیسے پہچان لیا۔“ اسے واقعی حیرت ہوئی تھی، کیونکہ اب وہ نوجوانی سے بڑھاپے میں داخل ہو چکی تھی، خود مونا بھی کافی حد تک بدل چکی تھی، جوانی کی خوبصورتی و رعنائی اب ختم ہوئی جا رہی تھی، اسی لئے اسے بھی پہچاننے بھی کچھ دقت لگا تھا۔

”کیونکہ تم آج بھی اتنی ہی خوبصورت ہو۔“ مونا نے سفید دوپٹے کے ہالے میں اس جھپٹے چہرے کو سراہتی نظروں سے دیکھتے ہوئے قہقہہ لگا لگا تھا، نازو جھپٹ گئی۔

”بھئی اپنے محسن کو کون بھولتا ہے، میں بھی نہیں بھولی۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے اپنے وہی لا پراواہ انداز میں بولی، نازو نے سمجھ نہ آئے والی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”تم جانتی ہو، اندر کمرے میں بستر مرگ پہ لیٹی شخصیت کون ہے۔“ اس نے عجب بھید بھرے انداز میں اس سے دریافت کیا تھا۔

”نہیں۔“ نازو نے نرمی میں ہلایا۔

”مہربن، میری Your collage friend“ مونا کے انکشاف نے اسے ہلا کے

رکھ دیا، اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”Dont worry“ میں یہاں اس کی تیار داری کے لئے نہیں رکی بلکہ اس خیمیت (مولی سی گالی) کی طرف میرے کچھ احباب ہیں، بڑی مشکل سے اس ہاسٹل کی کھوج لگانے اس تک پہنچی تھی، آ جاؤ تم بھی مل لو۔“ اس کی گالیاں بکنے کی عادت ابھی تک ترک نہیں ہوئی تھی، وہ اس کا ہاتھ پکڑے اندر کمرے میں داخل ہوئی، ناز کو اپنی ٹانگوں سے جان لپکتی محسوس ہو رہی تھی، وہ مونا کے ساتھ ہنستی ہوئی اندر پہنچی تھی۔

”میری۔“ میری کو دیکھ کر اسے ایک زبردست دھچکا لگا تھا، بڑیوں کا ڈھانچہ بنی وہ بیڈ پہ لیٹی نظر ہی نہیں آ رہی تھی، وہ چہرہ جو حسن میں اپنی مثال آپ تھا آج عصرت کا نشان بنا ہوا تھا، چمکے گال، اندر گھنسی ہوئی آنکھیں، ستواں ناک اب کافی حد تک پھیل چکی تھی، آدھے سے زیادہ دانت بھی گر چکے تھے، اس کا سراجم کمزوری و نقاہت کے باعث کپکپا رہا تھا۔

”میرے خدا! نازو نے بے ساختہ جھرمھری لی، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ زندگی میں دوبارہ بھی میری سے ملے گی، وہ تو اس باب کو ہی ختم کر چکی تھی، لیکن آج اسے اپنے سامنے اور وہ بھی اس حالت میں دیکھ کر نازو کے دل کی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔

”اے میری! دیکھو کون آیا ہے۔“ مونا نے اس کے قریب جا کر زور سے کہا تھا۔

”بیچاری کو اونچا سنانی دیتا ہے۔“ مونا نے استہزاء سے متاسفانہ لہجہ اختیار کیا تھا، نازو اپنے لب پہنچنے کے رہ گئی، اس کا دل گویا کسی نے مٹی میں جکڑ رکھا تھا۔

میری نے آہستگی سے آنکھیں کھولی تھیں اور اونچا ہو کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔

”اُف!.....“ نازو نے بے ساختہ اپنی

آنکھیں زور سے میچیں، وہ آنکھیں جن میں زندگی بڑے بھر پور طریقے سے گردش کرتی تھی، آج سیاہ اندھیرے غاروں کی مانند بے نور لگ رہی تھیں۔

”نازنین ہے، وہی نازنین جس کی وجہ سے تمہاری قسمت کی کاپی پٹی تھی اور میری بھی۔“ مونا نے تعارف کروا کے خود ہی اس کی مشکل کو حل کر دیا تھا، میری بڑے بھر پور طریقے سے چونکی تھی اور پھر اپنی قوت صرف کر کے نیچے سے ٹیک لگاتے ہوئے نیم دراز ہو گئی اس کی نگاہیں نازو پہ جمی تھیں۔

”ناز..... نین۔“ اس کے نوکھے پہری زدہ لبوں میں جنبش ہوئی تھی۔

”جاتی ہو نازنین! تمہارے جانے کے بعد ان تینوں کا بہت برا حال ہوا تھا، بیچاروں نے بڑی کوشش کی کہ تم انہیں مل جاؤ لیکن تم تو میری دسترس سے بھی نکل چکی تھیں۔“ مونا اب نازو کی طرف متوجہ تھی۔

”ہیو، میں تمہیں ساری بات بتاتی ہوں۔“ مونا نے اسے ہنسنے کا اشارہ کیا تو وہ کسی ریوٹ کنٹرول رپورٹ کی طرح چیخ رہی تھی۔

”یہ تینوں حسنا راؤ سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ تمہیں ایک ماہ کے لئے اس کے محل میں چھوڑیں گے ویسے بھی ان کے پاس جتنی بھی مراعات تھیں وہ سب حسنا راؤ کی دی ہوئی تھیں، میرے ساتھ تو یہ لوگ پہلے ہی فراڈ کرتے آ رہے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ اب میں ان کے درمیان سے نکل جاؤں۔“

”خیر جب میں نے تمہیں وہاں سے غائب کروا تو پہلی رات ان تینوں نے حسنا راؤ سے کوئی بہانہ کھڑا دیا، میرے پاس بدلہ لینے کا بہت اچھا موقع تھا، میں نے حسنا راؤ کو ہون کیا اور بتایا کہ ان تینوں نے مل کر کسی اور پارٹی سے پیسے زیادہ لے کر نازو کو اس کے حوالے کر دیا ہے،

حسنا راؤ تو غصے سے پاگل ہو گیا اس نے دو دن تک انتظار کیا، تم نے نہ ملنا تھا نہ ملی، میری بات اس کے دل میں راسخ ہو گئی، بس پھر وہیں سے ان کی بددیہی کا آغاز ہوا، حسنا راؤ نے ان سے تمام مراعات چھین لی، یہ تو میں جانتی تھی کہ وہ اصولوں کا کتنا پکا آدمی ہے، وہ بے ایمانی برداشت نہیں کرتا، بس پھر اس نے ان تینوں کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا، یہ کتوں کی طرح آپس میں ملنے جھگڑنے لگے۔

”تینوں نے مل کر پاکستان میں کچھ پراپرٹی خریدی تھی، اب یہی ان کا آخری سرمایہ تھا، دولت کے لالچ میں عدیل ہاشمی نے سکندر کوئل کر ڈالا، اس کا ارادہ تھا میری کو ٹھکانے لگانے کہ وہ ساری پراپرٹی سیٹ لے، لیکن میری نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنا فلیٹ چھوڑ دیا اور تمہارے تنک پہنچ گئی اور عدیل ہاشمی کو پچیس سال قید با مشقت کی سزا مل گئی، پیچھے تو کوئی تھا نہیں جو اس دفاع کرتا، پتہ نہیں چیل میں ہی مر کھ گیا یا ابھی تک کہیں پڑا ہوا ہے۔“

”رہ گی میری، تو یہ عدیل ہاشمی کے خوف سے سب کچھ بچ باج کر امریکہ چلی گئی، لیکن شاید تمہاری بددعاؤں کا حصار اس کے ساتھ ساتھ تھا، بیچاری نے جو کام بھی کرنا چاہا اس میں نقصان ہی اٹھایا، تھک مار کر شادی کر لی، شوہر شراب کا رسیا نکلا، جو اسے بھی مار پیٹ کر شراب کے لئے پیسے نکلاتا ہے، دو بیٹے، ایک بیٹی ہے لیکن وہ بھی باپ کے نقش قدم پر ہیں، بیٹی اپنے ہی بھائیوں اور باپ کے ہاتھوں ٹھوکانی ہوئی ہے، امریکہ میں کھرچونکہ اس کے نام تھا لہذا اس نے اسے بیچ ڈالا اور لندن آ گئی، لیکن تب تک اسے بیمار یوں نے چاٹ ڈالا تھا۔“ مونا یوں اسے بتا رہی تھی جیسے کوئی کہانی سنا رہی ہو، اس کے لہجے میں کہیں بھی میری کے لئے کسی یا ہمدردی نہیں تھی۔

میری نے دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے

اور کسی ہارے ہوئے جواہر کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی، آنکھوں کے سوتے خشک تھے، پتہ نہیں وہ کتنا رو چکی تھی کہ اب اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نہ رہے تھے۔

”مم..... مجھے..... م..... معاف..... کر..... دو۔“ میری نے اپنے رعشہ زدہ ہاتھ اس کے سامنے جوڑتے ہوئے کہا۔

”تمہیں معافی مجھ سے نہیں اللہ سے مانگنی چاہیے کہ وہ تمہاری اگلی منزلیں آسان کرے، حسرت اور افسوس تو یہ ہے کہ تمہیں ہر قدم پر ٹھوکر ملی لیکن تم نے کسی بھی موقع پر اپنے رب سے رجوع نہ کیا، ابھی بھی موقع ہے ابھی بھی اسے سے معافی مانگ لو۔“ میری کو نازو اس وقت بہت شفیق بہت پاکیزہ اور بہت اعلیٰ ہستی لگی تھی، وہ اپنے ہی ہاتھوں یہ سر رکے پھوٹ پھوٹ کے رو دی، پتہ نہیں کب کا خشک سیل رواں پھر سے جاری ہو گیا تھا۔

”میں بہت سچ عورت ہوں نازنین! میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ اس کے تقدس میں مجھے پناہ مل سکے، میرے گناہ حد سے بڑھ چکے ہیں۔“ اس کا لہجہ مکمل مایوسی کا غماز تھا۔

”تمہارے گناہ جتنے بھی سہی اس کی رحمت سے بہر حال کم ہی ہیں، مجھے دیکھو میں تو تم سے بھی زیادہ گناہ گار ہوں، لیکن اس رحمن نے میرے ایک دفعہ معافی مانگنے پر ہی میرے عیبوں پر پردہ ڈال دیا، اس سے بڑا گناہ کیا ہوگا کہ میں نے اپنے بوڑھے والدین کے سر میں خاک ڈلوای، بڑھاپے میں ان کی ذلت و رسوائی کا سبب بنی۔“ نازو کی آواز رندھ گئی، وہ جب جب اپنے والدین کے جھکے ہوئے سر کو قصور میں لاتی تب تب اسے اپنا دل کٹا محسوس ہوتا۔

”نہیں..... نہیں۔“ میری نے تڑپ کر اسے ٹوکا۔

”جس دن تم میرے ساتھ گھر سے بھاگی

تھی، اسی دن واپسی پر تم جس دین پہ جاتی تھی وہ دین ایک ٹالر سے ٹلرا کر راستے سے نزلری خان پور کی نہر میں جا گری تھی، کئی لاشیں لاپتہ رہ گئی تھیں، تمہارے گھر والے بھی یہی سمجھتے رہے کہ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔ میری کاتیں سن کر نازو کو اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”تو کیا یہاں بھی اس کے رب نے اس کی لاج رکھ لی تھی؟“ اسے لگا تھا آج یہ آخری پھاس بھی اس کے سینے سے نکل گئی۔
”مجھے عدیلہ نقوی ملی تھی، وہ تمہارے حوالے سے بہت افسوس کر رہی تھی، وہ تہرے گھر بھی گئی تھی، اس نے مجھے بتایا تھا، میں نے چاہا کہ اسے حقیقت بتا دوں، لیکن کسی نادیہ فوت نے مجھے ایسا کرنے سے روک لیا۔“ میری مزید اسے بتا رہی تھی۔

نازو کو احساس ہوا اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا، اس کے اندر بولنے کی بھی سکت نہیں تھی، اس کے گھر والے اسے مردہ سمجھ کے رودھو بیٹھے تھے، یہ لاکھوں کروڑوں گنا بہتر تھا اس سے کہ انہیں حقیقت سے آگاہی ہوئی، کم از کم وہ لوگوں کے طنزوں، تشوؤں سے تونج گئے تھے، آخر کبھی نہ بھی تو ان کے دل کو قرار آ ہی گیا ہوگا، وہ رب کی رضا سمجھ کر بھی تو صبر کر ہی بیٹھے ہوں گے۔

”میں تمہاری گناہ گار ہوں نازنین! مجھے معاف کر دو۔“ وہ ایک مرتبہ بھی لہجے میں گویا ہوئی۔

”تم نے یہ خبر سنا کر میرا ہر درد ختم کر دیا ہے، میں نے تمہیں اپنا ہر قصور معاف کیا اور تمہیں بھی نصیحت کروں گی کہ ابھی بھی وقت ہے نجانے تم نے کتنی زندگیاں برباد کی ہیں ابھی بھی معافی مانگ لو۔“ نازو کچھ بولنے کے قابل ہوئی تو نرم لہجے میں اسے ترغیب دینے لگی۔

”بھئی میں نے پہلے ہی اس کھیلے سے توبہ تاب ہو کے ایک فرم میں جاب کر لی تھی، اگرچہ میں تمہاری طرح نمازی نہ بن سکی، لیکن میں نے کسی کی زندگی کو بھی جہنم نہیں بنایا، ان تینوں کے واقعے سے عبرت پکڑ کے میں نے شادی کر لی اور حلال طریقے سے زندگی گزار رہی شاید یہی وجہ ہے کہ آج میں باعزت زندگی گزار رہی ہوں۔“
مونا جو اس سارے وقت میں خاموش بیٹھی تھی میری کی حالت یہ چہرہ چھری لیتے ہوئے بولی۔
”آپ یہاں کیسی ہوتی ہیں اور میں ہر جگہ آپ کو تلاش کر چکا ہوں۔“ صاحب اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا اور انہیں ایک قریب المرگ عورت کے سامنے بیٹھے دیکھ کر ہنسنے لگا۔
”یہ میرا بیٹا ہے صاحب، میرے دو بیٹے ہیں، دوسرا بھی یہیں ہیں۔“ نازو نے ان دونوں سے صاحب کا تعارف کروایا تھا۔

میری کی گردن ندامت کے بارگراں سے جھکی ہوئی تھی، وہ اپنا سب کچھ لٹا پٹا کے اگلی منزل کے انتظار میں تھی اور وہ بھی بالکل خالی ہاتھ۔
”صاحب بیٹا! یہ میری کالج فیلو مرن ہیں اور یہ مونا۔“ نازو نے اب اس کا تعارف کروایا، تو وہ بے حد چونک کر میری کو دیکھنے لگا، جو دیکھنے والوں کے لئے عبرت کا نشان بن چکی تھی۔

”انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے، قدرت کی لاشی بے آواز ہے، چلیں ماما! حسان آپ کا ویٹ کر رہا ہے۔“ صاحب نے ایک سرد آہ خارج کرتے ہوئے نازو کا ہاتھ پکڑ کے اسے اٹھاتا چاہا۔

”اچھا میری! میں رب تعالیٰ سے تمہارے لئے دعا کروں گی اور تم بھی کرنا، ابھی بھی اسے پکار لو، شاید یہی پکار کام آ جائے۔“ نازو آنکھوں میں آنسو لئے کھڑی ہو گئی اور مونا سے مصافحہ کرتی ہوئی صاحب کے ہمراہ باہر نکل گئی، میری ان دونوں

کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔

”Enjoy your life“ سب کو یہ سبق رٹوانے والی کو خود یہ نعرہ بہت مزینکا پڑا تھا، وہ سب کچھ نوا کے ہی دست وہی داماں تھی۔
”لیکن نہیں، نازنین کہہ رہی تھی ابھی بھی میرے پاس کچھ وقت ہے۔“ اس کے دل کے اندر ایک نئی امید جاگی اور پہلی دفعہ اس نے کچھ تباؤ کے بجائے گناہ کی ندامت لئے توبہ کے آنسو بہائے تھے۔

جس لڑکی کو اس نے غلامت کے ڈھیر پہ پھینکا جا رہا تھا وہ جاتے ہوئے اسے روشنی کا راستہ دکھا گئی تھی۔

☆☆☆

بہت کٹھن بہت تکلف دہ وقت تھا یہ ان سب کے لئے، سعود اڑتا بیس گھنٹے بھی گزار نہیں پائے تھے کہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے پھر ایک لحظہ ہوتا تو شاید وہ سب مل جل کے سہار لیتے، لیکن سعود کی وفات کے تیسرے دن ہی راحیلہ اپنے محبوب شوہر کے پہلو میں جاسوئی تھی۔

صاحب کے اوپر تو گویم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، اس کے دل کو کسی طور چین و فرار نہیں آ رہا تھا، اس کا ہنسا بستا گھر ایک دم اجڑ گیا تھا، وہ گھر جس میں ان تینوں کے تہمتے تھے خوبصورت یادیں تھیں، آج وہاں قبرستان کی سی خاموشی تھی، حسان اور نازو اس کے ساتھ ساتھ تھے، اس کے غم میں برابر کے شریک، صاحب تو اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا، جو کچھ بھی کیا تھا وہ حسان نے ہی کیا تھا اور پھر آنے جانے والی ہے نازو نے ملاقات کی تھی، راحیلہ اچھی خاصی سوشل خاتون تھیں، انہوں نے یہاں بہت سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔

صاحب کے لئے پاکستان سے بھی مسلسل فونز آرہے تھے، اس کے اپنے دوہری جدائی کے عذاب میں مبتلا تھے، وہ صاحب کو بہت سلی بہت دلا سہ دیتے تھے۔

کبھی نرمی کبھی گرمی کبھی غلٹ کبھی دیر وقت اے دوست بہر حال گزر جاتا ہے لہجہ لمحہ نظر آتا ہے کبھی اک اک سال کبھی لمحے کی طرح سال گزر جاتا ہے وقت کا تو کام ہی گزر جانا ہوتا ہے، وقت سے بڑا امر ہم کوئی نہیں، اس واقعے کو بھی تقریباً ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا، صاحب نے جیسے تیسے کر کے خود کو تھوڑا بہت سنبھال ہی لیا تھا اور زیادہ وقت اسٹڈی کو دینے لگ گیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا بزنس کی کوئی کتاب کھولے ہوئے تھا، کتاب سامنے پڑی تھی، لیکن اس کا ذہن کہیں اور ہی مجور پرواز تھا، وہ اپنے خیالوں میں مگن تھا جب ڈور بیل کی چنگھاڑنی آواز نے اسے متوجہ کیا۔

”اس وقت کون آ گیا۔“ وہ بری طرح اپنی تنہائی میں ڈوبا ہوا تھا، کتاب کو یونہی کھلا چھوڑے وہ بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔
”السلام وعلیکم!“ اس نے گیٹ کھولا تو سامنے حسان اور نازو کھڑے تھے، نازو نے سلام میں پہل کی تھی۔

”وعلیکم السلام! آئیے اندر آئیے۔“ سلام کا جواب دیتا وہ راستہ چھوڑ کے سائیڈ پہ ہو گیا، حسان بھی اس سے مصافحہ کرتا اندر داخل ہو گیا تھا۔

”میں نے سوچا ذرا اپنے بیٹے کی تو خبر گیری کر کے آؤں۔“ نازو نے اندر داخل ہوتے ہوئے صاحب کو مخاطب کیا۔

”بلکہ چھاپہ مار کے آؤں کہیں لڑکا بگڑ تو نہیں رہا۔“ حسان نے اس کے کاناں میں سرگوشی کی جو اپنی بلند ضروری تھی کہ نازو بخوبی سن سکتی تھی، صاحب کے لبوں پہ سے ساختہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

”پھر ہو گئی تلی۔“ اس نے حسان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی کہاں، ابھی تو اس گھر کی ایک ایک چیز چیک کی جائے گی، تمہارا کیا بھروسہ تم کسی حسین دوشیزہ کو بھی بنا کر دیوار سے چپکا دو اور ہم اسے ڈھونڈتے رہ جائیں۔“ حسان نے بڑی باریک بینی سے دیواروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔

”لندن کی حسین دوشیزہ کم از کم کبھی بننا تو گوارا نہیں کرے گی۔“ صاحب نے اس کی بات کو انجوائے کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں کے لئے اس کا ذہن بھی بٹ گیا تھا، اس کا بہت سنجیدہ اور لئے دیئے رہنے والا دوست جب اسے ہنسائے کی خاطر اوٹ پٹا لگ باتیں یا حریف کرتا تو اسے اس پر ٹوٹ کر پیار آتا، جب وہ اس کی خاطر اپنا مزاج بدل سکتا تھا تو پھر صاحب کا بھی حق بنتا تھا کہ ہر وقت پڑمردہ بن کر اس کی حوصلہ شکنی نہ کرے، وہ بھی اس کا دل رکھنے کو مسکرا اٹھتا اور واقعی ایسا کرنے سے اس کے گرد گرد چھائی کشافت چھٹنے لگتی تھی۔

”تم دونوں کے لئے لڑکیاں ڈھونڈتی ہوں اور جلدی سے تمہارا کوئی انتظام کر لی ہوں۔“ نازو اب صوفے پر بیٹھ چکی تھی اور مصنوعی تنہی لگا ہوں سے دونوں کو گھور رہی تھی۔

”ماما! میں تو بہت شریف ہوں البتہ صاحب کی گارٹی نہیں دے سکتا۔“ حسان نوراً سے پیشتر بول اٹھا تھا۔

”اپنے بیٹے کی گارٹی دینے کے لئے میں جو ہوں۔“ نازو نے نہال ہوئی نظروں سے اپنے خوب رو بیٹے کو دیکھا تھا جو ان کا دل رکھنے کو مسکرایا تھا۔

”ماما! آپ اس کو نہیں جانتیں، جن دنوں یہ یونیورسٹی نہیں جا رہا تھا ناں، ان دنوں وہ مس سوئٹرز لینڈ روزانہ مجھ سے اس کا پوچھنے کے لئے آتی تھی۔“ حسان نے اپنی طرف سے اس کا بھانڈا اچھوڑنا چاہا تھا۔

”وہ تم سے بات کرنے کے بہانے میرا پوچھنے آتی ہو گی۔“ صاحب نے نوراً حقیقت اگلی تھی۔

حسان کھسپا ہوا کے اسے گھورنے لگا، اس کی حالت دیکھ کر صاحب کی ہنسی نکل گئی اسے ہنستا دیکھ کر ان دونوں کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔

”تم تو بڑے میسے ہو، میں تو تمہیں سیدھا سادا ہی سمجھتا رہا۔“ وہ جیسے اپنے ہی خیالات پہ افسوس کر رہا تھا۔

”میں سنا نہیں باخبر کو۔“ اس نے ہنسی کی۔

”ایک یہ بات ہے کان کو ادھر سے پکڑ لویا ادھر سے۔“ حسان نے بے نیازی سے کندھے اچکا۔

”اچھا بیٹا! باقی باتیں تو ہوتی رہیں گی ہم دراصل تم سے ملنے آئے تھے۔“ نازو نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

”جی.....؟“ صاحب نے سمجھ نہ آنے والی نگاہوں سے انہیں دیکھا، ملنے تو وہ اسے تقریباً روز ہی آتے تھے پھر یہ کیسا ملنا تھا جس کی وضاحت وہ بطور خاص کر رہی تھیں۔

”دراصل میں اور حسان سچ پہ جارہے ہیں، پرسوں کی فلائیٹ ہے انشا اللہ۔“ انہوں نے بڑے جذب سے بتایا تھا۔

بات تو خوشی کی تھی لیکن یہ نہیں کہیں صاحب کو اپنی ہارٹ بیٹ مس ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”آپ.....“ کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے لب پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

”میرا ارادہ تو بہت پہلے سے تھا، لیکن درمیان میں پھر اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا، ایسے میں ہم تمہیں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے تھے، بس اب پرسوں آخری فلائیٹ سعودیہ جا رہی ہے، حسان بڑی بھاگ دوڑ کے بعد نکلیں حاصل کی ہیں، اللہ تعالیٰ تم دونوں کو صحت تندرستی اور نیک ہم سفر عطا کریں، راحیلہ کی طرح میری خواہش یہی تھی

ہے کہ تم اپنی پڑھائی کے بعد اپنوں کے درمیان چلے جاؤ میں نے ساری زندگی اس سر ملک میں گزار دی ہے، یہاں کچھ بھی نہیں ہے، کچھ نہیں، تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس اتنے پیارے رشتے موجود ہیں، میں تم دونوں کے لئے بہت دعا میں کروں گی۔“ وہ بالکل ایسے باتیں کر رہی تھیں جیسے کوئی انسان الوداعی ملاقات پہ کسی سے کرتا ہے۔

حسان بے چینی سے پہلو پھیل کے رہ گیا، شاید اس نے بھی وہ بات محسوس کی تھی جو صاحب کر رہا تھا، اسی لئے وہ بھی مضطرب ہو رہا تھا۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں! آئی! آپ کو واپس ہمارے پاس آنا ہے۔“ صاحب نے جھل کر کہا تھا۔

صاحب کا حسان اور نازو سے کیا رشتہ ہے حسان فی الحال اس سے بے خبر تھا اور یہ بوجھ بھی نازو نے اسی کے ناتواں کندھوں پہ ڈالا تھا کہ صاحب اسے ساری حقیقت بتائے گا لیکن ابھی نہیں، اس کے جانے کے بعد، جب مناسب وقت آئے گا، اسی لئے اس کی موجودگی کا لحاظ کر کے اس نے نازو کو آئی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

”بیٹا! بڑی مقدس جگہ سے بلاوا آیا ہے، میں تو سالوں سے منتظر تھی کہ کب میری آنکھیں خود پہ ناز کریں گی، کب ان آنکھوں کو وہ مقدس مقامات نصیب ہوں گے، ساری زندگی کی تڑپ کو اب شرف قبولیت ملا ہے، بس اب اللہ پاک دل کی آخری حسرت بھی پوری کر دے، وہاں تا قیامت قیام کے لئے دو گزر زمین نصیب ہو جائے، تو مجھ گناہ گار سا کوئی خوش نصیب نہ ہو گا۔“ ان کے لہجے میں جو عشق حقیقی کی تڑپ تھی اس نے دونوں کو خاموش کر دیا تھا۔

اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جب ان کی فلائیٹ تھی، صاحب ان دونوں کو آف کرنے انیورپورٹ آیا تھا، جانے کیوں اس کا دل بار بار

کہہ رہا تھا کہ وہ اب اس چہرے کو دوبارہ نہیں دیکھے گا۔

ڈیپارچ لاؤنچ میں پہنچ کر نازو نے ایک خط اس کی طرف بھجوا دیا تھا۔

”جب پاکستان جاؤ تو اپنے پاپا کو میرا سلام دینا اور یہ خط انہیں دے دینا اور ہاں میرا حسان تمہارے پاس میری امانت ہے، میرے بعد اس کی دیکھ بھال کرنا، کوشش کرنا اس کو بھی دکھ نہ ملے، خدا ہمیشہ تمہیں شادو آباؤ رکھے آمین۔“ انہوں نے ماتھا چوم کر اسے دعا دی تھی، وہ اسی دعا کے حصار میں مقید انہیں دیکھتا رہا تھا، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھیں۔

☆☆☆

”صاحب! کیا بات ہے، تم بہت پریشان لگ رہے ہو۔“ اس نے آج کوئی کلاس اینڈ نہیں کی تھی، بس سارا دن تنہا ایک گوشے میں دوسرے گوشے میں بیٹھ کر گزارا تھا۔

کل کا سارا دن اور ساری رات بھی اس کی روکے گزری تھی، ایک پل کے لئے بھی چین نہیں آیا تھا، زندگی میں ایک بار پھر اسے راحیلہ اور سودی کی بے حد شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

جو زمین نے صبح اس کی ایک جھلک تو دیکھی تھی لیکن اس کے بعد وہ اسے نظر نہیں آیا، وہ اسے ڈھونڈتی ڈھانڈتی بالآخر ایک گوشے میں اس تک پہنچ گئی تھی، وہ تنہا بیٹھا کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا، جو زمین کے پکارنے پر اس نے خالی خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”مامی گاڈ! تمہاری آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی ہیں، یقیناً تم کل روتے رہے ہو۔“ وہ اس کی شدت گریہ سے سرخ آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو اٹھی، اسے حسان سے وابستہ ہر چیز سے عشق تھا اور یہ تو پھر جیتا جاگتا وجود تھا وہ بھی حسان کا اکھوتا اور گہرا دوست۔

”نہیں، ایسا تو کچھ نہیں ہے۔“ وہ نظریں

چراتے ہوئے رخ پھیر گیا۔

”صالح! تم تو بہت نرم مزاج ہو، حسان کی طرح مجھے اجنبیت کی مار تو مت مارو۔“ اس کے لہجے میں یں گل گل تھی، صالح کا دل فوراً سونم ہو گیا۔

”تم کل یونیورسٹی بھی نہیں آئے یقیناً کوئی بات ہے ورنہ حسان کے بعد تم نے بہت ریگولر کلاسز اینڈ کی ہیں۔“ اس کے چہرے پہ ندامت کے اثرات دیکھ کر جوزفین فوراً پہلے والی بات پر آ گئی۔

”ہاں..... وہ..... جوزفین..... وہ۔“ صالح نے کہنا چاہا تھا لیکن آنسوؤں کا پھندا اس کے حلق میں انک کے اس کے سارے الفاظ کو گنڈ مڈ کر گیا، اسے اپنا آپ خالی پرزے کی مانند ہوا میں اڑتا، بکھرتا محسوس ہوا تھا۔

”ہاں..... ہاں..... بولو..... کیا بات ہے۔“ جوزفین نے اپنا سمیت بھرے انداز میں اسے بات آگے بڑھانے کا حوصلہ دیا تھا۔

”وہ..... حسان کی ماما..... نانہین آئی..... کل مدینہ منورہ میں..... انتقال کر گئیں۔“ اس نے نہایت دقت کے ساتھ انک انک کر اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔

”مائی گاڈ!“ جوزفین کو بھی زبردست شاک لگا تھا۔

”مجھے پہلے ہی پتہ تھا جوزفین! وہ واپس نہیں آئیں گی، وہ ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کے جا رہی ہیں، لیکن..... لیکن وہ ایسی جگہ جا رہی تھیں جہاں ہم آئیں جانے سے روک نہیں سکتے تھے اور ہمارے روکنے سے وہ رک نہیں سکتی تھیں۔“ اس کے الفاظ پر آنسو غالب آ گئے تھے۔

”اور حسان.....“ کافی دیر ٹھہر کے جوزفین نے اس دہن جاں کے متعلق استفسار کیا تھا۔

”وہ وہیں ہے اس کی فلائٹ تین دن بعد ہے اس نے مجھے کہا تھا صالح رونا نہیں یہ میری ماما

کی آخری خواہش تھی زندگی کی آخری خواہش پورا ہونے پر رویا نہیں جاتا، شکر ادا کیا جاتا ہے۔“ وہ روتے ہوئے اس کے الفاظ دوہرا رہا تھا۔

جوزفین کو احساس نہیں ہوا لیکن اس کی خوبصورت نیلی جھیلی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔

”حسان ٹھیک کہتا ہے صالح! اگر یہ ان کی آخری خواہش تھی تو تمہیں واقعی رونا نہیں چاہیے۔“ حسان کی بات سے وہ اختلاف کہاں کر سکتی تھی۔

”لیکن میرے دل کو چین نہیں آ رہا جوزفین!“ وہ تڑپ کے اس کی طرف مڑا تھا۔

”مجھے تو نازنین آئی کی قسمت پر رشک آ رہا ہے کہ ان کے مرنے کے بعد کتنے لوگ ان سے محبت کرنے والے اور عقیدت رکھنے والے اور ان کے لئے دعا کرنے والے ہیں ایک ہم ہیں.....“ وہ خود پر استہزائیہ تھی

”ہم میں سے کوئی مر جائے تو کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ ان کی میت پر بیٹھ کر دو آنسو بہا لئے جائیں۔“ گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ صاف کیا، جو آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔

”تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“ وہ کھڑی ہو کر اس سے مخاطب ہوئی، صالح میکا کی انداز میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔

”تمہاری گاڑی میں چلتے ہیں، میں واپس آ کر پھر اپنی گاڑی لے جاؤں گی، کی رنگ دو مجھے۔“ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے خود ہی فیصلہ کیا، صالح نے کی رنگ نکال کر اسے تمنا دی۔

صالح کا گھر زیادہ دور نہیں تھا، یہ شکر تھا کہ اسے اتنی ہوش تھی جو وہ جوزفین کو راستہ بتاتا آیا تھا۔

گھر پہنچ کر جوزفین نے پہلے اسے سلاؤں سینک کر دیئے اور ساتھ میں چائے دی، اس کے بعد گرم دودھ کے ساتھ دو پین گلیز دیں، ہیٹر آن کر کے کمرے میں اس کے اوپر ڈالا، پانی کا جگ، گلاس اور ایک تھرماس میں چائے بھی ڈال کر اس کے ہیڈ ڈراز پر رکھ دی، وہ سیم خودگی میں تھا جب وہ واپسی کے لئے تیار ہوئی۔

”اوکے اب میں جا رہی ہوں، میں صبح یونیورسٹی جاتے ہوں تمہیں پک کر لوں گی، اب آرام کرو، ٹیک کیئر۔“ اسے ہدایات دیتی وہ دبے قدموں کمرے سے باہر آئی۔

مین گیٹ اچھی طرح بند کرنے کے بعد وہ مین روڈ پہ کئی کیپ کی تلاش میں نکل آئی تھی۔

☆☆☆

”تم دونوں کے جولا سٹ لیکچر زس ہوئے تھے، میں نے سارے احتیاط سے سنبھال کے رکھے ہوئے تھے اس فائل میں وہ سارے نوٹس موجود ہیں۔“ جوزفین نے ایک خوبصورت رٹکین کور والی فائل ان کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

حسان لندن آنے کے دو دن بعد یونیورسٹی آیا تھا، صالح بھی دو دن اس کے ساتھ ہی غائب رہا تھا، آج وہ دونوں اسے نظر آئے تو جوزفین فائل انہیں دینے کی غرض سے اس طرف آ گئی، حسان سے صبح بھی اس کی رسمی سی علیک سلیک ہوئی تھی، البتہ صالح نے بہت اچھے طریقے سے اس سے بات کی تھی۔

”تھینک یو سو مچ جوزفین!“ صالح نے فائل اس کے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تھا کہ بہر حال اتنا تو اس کا حق بنتا تھا۔

”تھینک یو والی کیا بات ہے، کلاس فیلو ہونے کے ناطے اتنا تو میرا حق بنتا ہے کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے میں تم لوگوں کی ہیلپ

کر دوں۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے اپنے ازلی اعتقاد سے گویا ہوئی تھی۔

”پھر بھی بہر حال کم از کم تھینکس کہنا تو ہمارا بھی حق بنتا ہے۔“ وہ بھی اپنی بات پہ زور دے کے بولا، حسان ان کی گفتگو کے دوران خاموش سامع بنا بیٹھا تھا۔

”کیا بات ہے حسان! بہت خاموش ہو تم۔“ اس نے جب بیٹھے حسان کو مخاطب کیا۔

”سنا تو چاہتے تھے خاموش ہوا کرتا تھا۔“ حسان نے بخندگی سے جواب دیا۔

”لیکن آج کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو۔“ وہ اپنی بات پہ قائم تھی۔

”ہاں..... شاید..... بس ایسے ہی۔“ اس نے گول مول سا جواب دیا، صاف لگ رہا تھا کہ اس نے اسے ٹالنا چاہا تھا۔

”انسان کو اتنا آدم بیزار بھی نہیں ہونا چاہیے کہ کچی سے بنے ہوئے لائف کے اندر کچھ تو پینچ ہونا چاہیے۔“ اس کا مقصد اس کی سنجیدہ طبع شخصیت پہ چوٹ کرنا نہیں بلکہ اسے اس فیز سے نکالنا تھا۔

”تم سے کس نے کہا کہ میں آدم بیزار ہوں۔“ وہ اپنی سیاہ جگمگانی آنکھیں اس پہ گاڑ کے بولا، جوزفین اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے گڑبڑا کے نگاہیں جھکا گئی۔

”بظاہر تمہارے خاموش رہنے سے تو یہی فیمل ہوتا ہے۔“ وہ چند لمحوں بعد سنبھل کے بولی۔

”بس میں بچپن سے ایسا رہا ہوں، ماما کے علاوہ میرا کوئی بیسٹ فرینڈ نہیں تھا، اسی لئے زیادہ بولنے کی بھی عادت نہیں ہے، اب ان کی کمی تو محسوس ہوئی۔“ حسان کا لہجہ آخر میں بھاری ہو گیا تھا۔

اگرچہ اسے پہلے سے لگ رہا تھا کہ جس طرح ماما کے احساسات ہیں وہ واپس نہیں آئیں گی، ان کی شدید خواہش کو اللہ تعالیٰ نے پورا کر

دیا تھا، وہ بھی رب کی رضا میں راضی تھا کہ یہی اس کی ماں نے اسے سبق پڑھایا تھا، لیکن پھر بھی ماں کی جدائی کا احساس اسے مارے ڈالتا تھا، صالح نے اس کھن وقت میں اس کا بہت ساتھ دیا تھا، یہ دو دن انہوں نے نازنین کو یاد کرتے اور ان کی باتیں کرتے گزارے تھے۔

”ہم تمہارے دکھ میں برابر کے شریک ہیں حسان! لیکن تمہیں چاہیے کہ تم اپنی اسٹڈی پر توجہ دو، کیونکہ فاضل ایگزیزٹ میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے، مصروف رہنے کی وجہ سے تمہاری توجہ بھی بٹ جائے گی اور نازنین آخری کی روح بھی یقیناً بہت خوش ہوگی۔“ جوزفین کو بے حد خوشی ہوئی تھی کہ حسان نے اپنی زندگی کی کوئی بات تو اس سے شیکر کی، لئے دیئے انداز میں رہنے والا یہ شخص اسے اپنی دستبرد سے ہمیشہ بہت دور لگا تھا۔

”جوزفین سچ کہہ رہی ہے حسان! ہماری اسٹڈی کا پہلے ہی کافی سے زیادہ خرچ ہو چکا ہے، اب ہمیں بھرپور محنت کی ضرورت ہے۔“ صالح نے بھی جوزفین کی تائید کی تھی۔

”ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔“ حسان نے بھی آہستہ سے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا تھا اور پھر واقعی ان دونوں نے اپنی ساری توجہ، لگن اور محنت اپنی پڑھائی پر مرکوز کر دی، جوزفین نے اس سلسلے میں ان دونوں سے بہت کوآپریشن کیا تھا، ان کی خاطر بھی وہ لائبریری کے چکر لگاتی

Books تلاش کرتی تھی انٹرنیٹ پر مختلف ویب سائٹس کی سرچ کرتی، کبھی کسی پروفیسر کے نوٹس ان تک پہنچاتی، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ حسان اور صالح کے درمیان اپنی جگہ بناتی چلی گئی، لیکن ایک عادت اس کی بہت اچھی تھی، اس نے حسان کی موجودگی میں بھی کبھی صالح کو فراموش نہیں کیا تھا، حالانکہ ابتدائی دنوں میں اسے صالح پر بہت غصہ آتا تھا جو ہر وقت حسان کے ساتھ چٹا رہتا تھا، جس کی وجہ سے حسان سے بات کرنے اور اسے

امپر لی کرنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔

لیکن اب اس کا رویہ بہت تبدیل ہو گیا تھا، محبت نے اسے محبت کرنا سکھایا تھا، وہ حسان سے وابستہ ہر چیز سے محبت کرنے لگی تھی، اگرچہ حسان ابھی بھی اس سے زیادہ فری نہیں ہوتا تھا، تاہم پھر بھی پہلے کی نسبت وہ اس سے تھوڑی بہت گفتگو کر لیتا تھا اور جوزفین کے لئے یہی بہت غنیمت تھا، لاشعوری طور پر ہی وہ خود کو حسان کی پسندیدگی میں ڈھالنے کی کوشش میں رہتی تھی، جب سے اس نے محسوس کیا تھا کہ حسان اس کی ڈرینک کوخت ناپسند کرتا ہے تب سے اس نے اوٹ پلاننگ کمپنیز سے بہت تھوڑے دیئے تھے۔

اب وہ زیادہ تر کھیتی باڑی کے اوپر ڈھیلی ڈھالی کی شرٹ پہن لیتی تھی، نئی اسکرٹ، ٹائیٹ جینز، شارٹ ٹاپ یہ سب الم علم اس نے اپنی وارڈ روبر سے اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

جیسے جیسے فاضل ایگزیزٹ قریب آتے جا رہے تھے، ویسے ویسے اس کے دل کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وہ حسان سے کب اور کیسے ملا کرے گی، کیونکہ اس کے وصال کی ٹرپ تو صرف جوزفین کو تھی، وہ تو اس سے کھیل سے ٹکرا انجان تھا، اس نے تو محبت کی گلیوں میں قدم رکھا ہی نہیں تھا، وہ کیا جانتا۔

وصال کا شوق! جدائی کی ٹرپ!!

ہجر و فراق سے یکسر نااہل تھا۔

”کاش! کاش حسان احمد! تمہیں بھی محبت ہو جائے۔“ اس کے دل کے اوانوں میں ایک بار پھر اس نے حسرت نے انگڑائی لی تھی۔

☆☆☆

محبت چیز ہے ایسی سبھی ہوئی ہے انہوں سے کبھی ہوئی ہے پہنوں سے

کبھی انجان راہوں سے کبھی گناہ ناموں سے محبت چیز ہے ایسی کبھی ہوتی ہے پھولوں سے کبھی بچپن کے جھولوں سے کبھی بے اختیاری میں کبھی بے اصولوں سے محبت اک محبت ہے محبت اک صداقت ہے محبت اک عبادت ہے محبت چیز ہے ایسی کھوں میں رول دیتی ہے ردائوں میں دیتی ہے ہر بھی گھول دیتی ہے محبت چیز ہے ایسی

”تو کیا تم واقعی پاکستان جا رہے ہو۔“ حسان نے صالح سے پوچھا تھا جو ابھی ابھی پاکستان سے اپنے چاچا کاؤن سن کے فارغ ہوا تھا، اس کے چہرے پر پہ انہوں کی محبت کی بڑی لہری چمک تھی۔

”ایک نہ ایک دن تو مجھے اپنے اصل کی طرف ہی لوٹ کے جانا ہے، لیکن ابھی نہیں، ابھی میرے ذمے کسی کا قرض ہے، پہلے وہ اتار لیں۔“ وہ جیسے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

”کون سا قرض؟“ حسان نے اچنبھے سے سے دیکھا۔

”تمہیں یاد ہے حسان! ایک دفعہ تم نے کہا تھا کہ تم زندگی میں ایک دفعہ ضرور پاکستان جاؤ گے، اپنے باپ کو ڈھونڈنے.....“ صالح اب اس کے چہرے کو کھونج رہا تھا۔

”ڈھونڈنے نہیں بدلے لینے اپنی ماں کی اردمیوں اور گفتگوں کا۔“ اس شخص کے ذکر پر ہی اس کے اردقن گئے تھے اور آنکھوں سے شرارے لگے لگے تھے، لہجہ بھی شعلوں کی سی آج لگے

ہوئے تھا۔

”اور اگر تمہیں پتہ چل جائے کہ وہ شخص کون ہے اور کہاں ہے تو کیا کرو گے تم۔“ وہ بھی گویا آج کسوی کسوی پھینکے یہ آمادہ تھا۔

”میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا اور اپنا حساب لے کر دم لوں گا۔“ اس کے جذبات بھڑک اٹھے تھے، وہ تو گویا تصور میں ہی اس شخص کا گریبان پکڑے ہوئے تھا۔

”میں تمہارے قادر کو جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔“ صالح اس پر نظر سے جمائے اعتماد سے بولا تھا۔

”کیا..... آ..... آ۔“ حسان تو اچھل کے کھڑا ہوا تھا، اس کی آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ وہ پر جوش ہوا تھا۔

”جب موقع آتا تھا تب ہی تمہیں بتانا تھا، تم نے پوچھا نہیں کہ میں انہیں کیسے جانتا ہوں۔“ اس کا خیال تھا کہ حسان سب سے پہلے یہی سوال کرے گا، لیکن اس کی توقع کے برعکس اس نے فوراً ہی اس کی بات پر اعتبار کر لیا تھا، شاید وہ اپنے باپ سے بدلہ لینے کے لیے بہت بے چین تھا جو جاچ پڑتا اور تحقیق میں بھی نہیں گیا۔

”ہاں یہ بات تو واقعی اہم بات ہے کہ تم انہیں کیسے جانتے ہو۔“ صالح کے کہنے پر ہی یہ بات اس کے ذہن میں آئی تھی۔

”وہ میرے والد ہیں حسان! میرے پاپا سعود کے سب سے بڑے بھائی احمد عبدالرحمن، ہمارے سارے رشتے دار انہیں عبدالرحمن کہتے ہیں جبکہ آس میں ان کے کوٹیز احمد کہتے ہیں، اسی کی نسبت میں، میں صالح عبدالرحمن اور تم حسان احمد۔“ صالح نے بالآخر وہ ہم پھوڑ ہی دیا تھا، جس نے حسان کے پر خچے اڑا دیا تھا۔

وہ جھٹی پھٹی بے یقین اور کسی قدر بے حواس

نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا اسے اپنی سماعت پہ ہرگز ہرگز یقین نہیں آ رہا تھا، ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے کانوں نے کچھ غلط سنا تھا۔

”تت..... تم..... مذاق کر رہے ہونا۔“ اسے اپنی ہی آواز بڑی اجنبی سی لگی تھی۔

”میں حسان ایسی بات مذاق میں نہیں کی جاتیں۔“ اس نے لمبی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی تردید کی تھی، پھر بڑے نرم انداز میں گویا ہوا تھا۔

”تمہیں کبھی محسوس نہیں ہوا حسان! کہ ہمارے مابین فریڈ شپ کے علاوہ بھی کچھ ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب کرتا ہے، جو محبت اور جذبات ہم ایک دوسرے کے لئے رکھتے ہیں یہ صرف دوستی نہیں یقیناً اس سے آگے یہ ہمارے خونی رشتے کا اعجاز ہے، ورنہ اپنی اپنی طبیعتوں کے برعکس ہم اتنی جلدی ایک دوسرے کے قریب کیسے آسکتے تھے؟“ وہ سوال بنا اس کے سامنے کھڑا تھا، جبکہ حسان کو اپنا وجود بھر بھری ریت کی مانند بھرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”میں جس شخص کے تصور تک سے نفرت کرتا رہا، اسی کے خون سے اسی کے بازو سے محبت میں اتنا آگے نکل گیا۔“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوا۔

”اس کا خون تو تم بھی ہو حسان!“ صراح نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”مت نام لو اس شخص کا میرے سامنے۔“ وہ ایک دم بھڑک کے چلا اٹھا۔

”تم ہرگز اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ اسے تمہارا باپ سمجھ کے میں معاف کر دوں گا، مجھے اس شخص سے شدید ترین نفرت ہے اور اس سے وابستہ ہر رشتے، ہر تعلق، ہر چیز سے بھی نفرت ہے، اس ملک، اس شہر، اس فلی، اس گھر سے نفرت ہے جہاں وہ رہتا ہے سانس لیتا ہے، اس کی اولاد سے نفرت ہے جس نے میرا اور

میری ماں کا حق چھینا۔“ وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا، اس کے الفاظ نہیں تھے آگ کے انگارے تھے، جو ایک ایک کر کے صراح کے دل میں پوست ہوتے جا رہے تھے، ہر انگارے کی پیش، جلن اور حرارت پہلے سے بڑھ کر تھی۔

”نفرت یہ اتنا بھروسہ نہیں کرتے میرے دوست! نفرت تو محبت کے ایک ہی وار سے پھل جاتی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔“ اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی تھی، آنکھوں کی اوپری سطح بھی کیلی ہوئی تھی۔

لیکن اسے یہ سب برداشت کرنا تھا وہ جانتا تھا حسان دل کا برا نہیں جس کی تربیت نازنین جیسی پاکیزہ ہستی نے کی ہو وہ شخص دل کا یا کردار کا برا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو محبتوں کو ترسا ہوا انسان ہے، محبتوں کی غروی نے اسے سب سے بدظن و بدگمان کر دیا ہے، جب اسے اتنی ساری محبتیں، چاہتیں ملیں گی اتنے سارے خوبصورت رشتے ملیں گے، ہر رشتے کا اعتماد، پیار، مان اور بھروسہ ملے گا تو یقیناً اس کی ہر گھٹی، ہر محرومی خود بخود ہی ختم ہوتی چلی جائے گی۔

لیکن اس وقت وہ نفرت اور بدگمانی کی انتہا پر تھا، ابھی اس نے رشتوں کی چاشنی کو محسوس نہیں کیا تھا، ابھی اس کا اعتماد بحال نہیں ہوا تھا، ابھی تو اس کے اندر محرومیاں سج رہی تھیں، ابھی تو اس کا وجود محبتوں کو ترسا ہوا تھا، ابھی اگر وہ اسے سب کچھ سچ بتا دیتا تو وہ بھی بھی اس کا یقین نہ کرتا، اتنے سالوں کی نفرت اور بدگمانی اس کے چند الفاظ کے جواہر سے ختم نہیں ہو سکتی تھی۔

اس لئے اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا وہ حسان کو پاکستان بھیجے گا، صراح عبد الرحمن بنا کر، جب وہ اپنی محبتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا، اتنے جانے والوں کو پائے گا، رشتوں کی نازی اور دلچسپی کو محسوس کرے گا تو حقیقت جانے بغیر بھی قائل ہو جائے گا کہ یقیناً اس کا باپ دھوکے

باز، فراڈیہ اور نفس کا مارا ہوا نہیں ہے، وہ کسی کی عزت نفس اور کردار کو مجروح کر کے اس پہ اپنی زندگی کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔

اور ویسے بھی اسے نازنین کا قرض چکانا تھا، اس کی امانت کی حفاظت کرنی تھی، حسان کے رویے کے اندر تبدیلی لانا تھی، اسے محبت کرنا سکھانا تھا اور اس کے لئے اسے اپنا فیصلہ بالکل صحیح لگا تھا اور وقت کے عین مطابق تھی۔

”تم نے بھی وہ زندگی گزاری ہو جو میں نے گزاری ہے تو پھر تم سے اس فلسفے کا مطلب پوچھوں گا۔“ وہ گہرے طنزیہ کاٹ دار لہجے میں بولا۔

”تو کیا یہ سب جاننے کے بعد ہمارا رشتہ ختم ہو جاتا ہے؟“ صراح نے بہت دکھ سے اسے دیکھا تھا، اس کے الفاظ ہی نہیں لہجے میں بھی ٹپ تھی۔

”اگر تم میرے راستے میں آنے کی کوشش کرو گے تو پھر میں اس رشتے کا پاس نہیں کروں گا۔“ وہ بد لحاظی سے گویا ہوا تھا۔

”اور اگر میں خود تمہیں بدلہ لینے کا ایک موقع فراہم کروں تو؟“ اس کی آفر پر اس نے بے حد چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے ابھن بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اگرچہ تم اس وقت بدگمانی کی انتہا پر ہو، لیکن پھر بھی میں کہوں گا کہ میں تمہارے لئے بہت اچھے اور نیک جذبات رکھتا ہوں اور ایسے ہی اپنے والد اور گھر والوں کے لئے بھی، لیکن تمہاری نفرت ختم کرنے کے لئے یا اپنے لفظوں میں تم کہہ لو کہ بدلہ لینے کے لئے میں تمہیں ایک موقع فراہم کروں گا۔“ اس کا لہجہ کھرا اور صاف تھا، جمع اور بناوٹ سے پاک۔

”میں ابھی بھی نہیں سمجھا، تم مجھے کیسا موقع فراہم کرنا چاہتے ہو۔“ وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

”دیکھو میں تمہیں موقع دیتا ہوں کہ تم پاکستان جاؤ لیکن حسان احمد نہیں صراح عبد الرحمن بن کر وہاں رہو کتنی مدت؟ یہ تم خود طے کرو گے، تمہارے دل کے اندر جو جو حسرت ہے نفرت کی یا انتقام کی وہ تم پوری کر لینا، لیکن اگر تم نہ کر سکتے تو تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔“ صراح کے انداز میں سچ تھا۔

”دیری گڈ۔“ حسان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”دیکھ لینا بعد میں پچھتانا مت۔“ اس نے پہلے ہی اسے باور کروا دیا، اس کے خیال میں صراح نے اپنی ازلی سادگی اور بیوقوفی کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہت بڑا لیکن بہت غلط قدم اٹھایا تھا۔

”میں جن کے پیچھے بہت سی دعائیں ہوں وہ پچھتا نہیں کرتے۔“ وہ خود اعتمادی سے بولا۔

”ٹھیک ہے لیکن میری بھی ایک شرط ہے کہ تم درمیان میں کوئی انٹرفیر نہیں کرو گے۔“ ان کا کوئی جواز ہی نہیں تھا اور خوشی راضی ہو گیا۔

”بالکل نہیں کروں گا، بلکہ میرا رابطہ کسی سے نہیں ہوگا، سوائے تمہارے۔“ وہ فوراً مان گیا تھا، اسے حسان کے اتنی جلدی رضامند ہونے کی توقع نہیں تھی، لیکن لگتا تھا۔

تقدیر کو اسی طرح منظور تھا جیسی معاملہ اتنی آسانی سے طے ہوتا جا رہا تھا، یقیناً نازنین کی دعائیں رنگ لارہی تھیں۔

”رائٹ، میں بھی خود ہی تم سے رابطہ کروں گا، تم نہیں کرو گے۔“ وہ بولا۔

”ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ صراح نے کندھے اچکا تے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں تین ماہ میرے لئے کافی ہوں گے اپنے ٹارگٹ کو اچھو کرنے کے لئے۔“ وہ اپنے ذہن میں پلان ترتیب دیتا سوچ کے بولا۔

”امی، ابو نے پھر لوگوں پر اعتماد اور بھروسہ کرنا شروع کر دیا ہے پہلا غم ہم بھولے نہیں ہیں کہ یہ نئے کرائے دار رکھ لئے ہیں۔“ وہ طلعت بیگم سے کب سے بحث کے جاری تھی اور وہ اسے دبے دبے لہجے میں سرزنش کے جاری تھیں مگر عنائزہ کی زبان اگر نان اسباب چلتی تو روکنے والا کوئی نہ ہوتا تھا یاں البتہ اختر علی کو دیکھ کر وہ ضرور خاموش ہو جاتی تھی وہ بھی اس لئے کہ وہ اس کے باپ تھے۔

ناولٹ

اسی وقت اتر کے آتا ہے جب میں صحن دھوری ہوتی ہوں یا مشین لگاتی ہوتی ہے۔“ صحن میں بیڑھیوں کے نیچے پانی کی موٹر تھی وہ اسے بند کرنے جھاڑو ایک طرف رکھ کر مڑی تو اسی وقت سمیل اپنے دانٹوں کی نمائش کرتا اوپر سے اترتا عنائزہ نے اسے خونخوار نگاہوں سے گھورا مگر اس کو کوئی پروا نہ تھی۔

”اوہ سوری مجھے نہیں پتہ تھا آپ صفائی کر رہی ہیں۔“ سمیل نے شرارت سے آنکھیں گھمایاں عنائزہ نے دوپٹہ اٹھایا اور شانوں پر ڈالا۔

”تمہاری آنکھیں تو تھی نا واپس اوپر بھی جا سکتے تھے نہ دیکھ کر۔“ وہ اس کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار تھی۔

”عنائزہ کیا بدتمیزی ہے۔“ طلعت بیگم کو



اس کی تنگ مزاجی کبھی کبھی فکر میں مبتلا کر دیتی تھی جسے کسی کی پرواہ ہی نہ تھی۔

”دیکھا آئی کتنی بھدار ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے مسٹر ڈکٹروں میں ملبوس غصہ سے انگارہ بنی عنانزہ کو دیکھا۔

”واپس اوپر آ جاؤ آدھے گھنٹے سے پہلے نیچے نہیں آنا۔“ وہ اسے شہادت کی انگلی اٹھا کر اشارے سے اوپر جانے کا اشارہ کر رہی تھی اسی وقت شازل بلیک پیٹ پر اسکا کی بلیو کاشن کی پلین شرٹ میں ملبوس تیزی سے سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا، عنانزہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”وہ اصل میں مجھے ضروری جانا ہے ورنہ میں خود احتیاط کرتا ہوں کہ آپ جس وقت صحن کی صفائی کر رہی ہوں میں نیچے نہ آؤں۔“ وہ وضاحت دیتے ہوئے بولا، اس کی بارعب شخصیت سامنے ایک لمبے کوہ کنفیوژ ہوئی لیکن پھر فوراً اعتماد بحال کرتی بیزاری سے اسے دیکھنے لگی۔

”ارے بیٹا! آ جاؤ تم کوئی بات نہیں۔“ طلعت بیگم کو وہ بے ہی بہت پسند تھا۔

”آئی! امی کی طبیعت کچھ خراب ہے اگر آپ ایک چکر اوپر کا لگا لیں تو مہربانی ہوگی۔“ شازل نے جھکتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں، تم بے فکر ہو کر کام پر جاؤ میں ابھی جاؤں۔ ہوں ان کے پاس۔“ سبزی بنانے کے بعد وہ ٹرے اٹھائے کچن میں جا۔

”ہمارا گھر آخری مرا“

ہم جلد فٹ ہو جائیں گے۔

سنارہا تھا جبکہ وہ دائرے سے پانچ صاف رنے میں مشغول تھی۔

☆☆☆

”امی آج کھانا بہت مزے کا ہے۔“ سمیل ستائشی انداز میں بولا، شازل خاموشی سے کھا رہا

تھا آج کا ذائقہ اسے بھی بالکل انگ ہی لگا تھا۔

”آج ذائقہ سنارہ آگئی تھی میں تو دوائی کھا کے۔“ امی نے اپنی مرضی سے سب کچا کھا ہے۔ وہ فریج سے پانی کی بوتل نکال کے لائیں اور سینٹرل ٹیبل پر رکھ دی۔

”امی دیے عنانزہ باجی ہر کام بڑی دل جمعی سے کرتی ہیں۔“ باسل بھی تعریف کئے بنا نہ رہ سکا۔

”تم آج بھی لیٹ اٹھے ہو۔“ شازل کھانے سے فارغ ہوا اور ٹی وی آن کر لیا تین کمروں کا اوپر کا پورشن تھا ایک کمرہ تو ڈرائنگ روم کی طرح سیٹ کر لیا تھا ایک میں شازل سو رہا تھا دوسرے کمرے میں امی اور باسل اور سمیل سو تے تھے پھر صرف چھ ماہ تو ہی انہیں گزارنے تھے اس کے بعد انہیں اپنے نئے مکان میں شفٹ ہو جانا تھا جو آج کل زیر تعمیر تھا۔

شازل نے آٹھ سال امریکہ میں گزارے تھے وہ تو ابو کی پچھلے سال ڈچھ ہوئی تو اسے واپس آنا پڑا اس طرح باری ذمہ دار اس پر ہی آگئی تھی۔

”آپ کو پتہ ہی ہے ایگزیم کی وجہ سے مجھے کمبائن اسٹڈی کے لئے عمار کے پاس جانا پڑتا ہے۔“ وہ تو جہہ پیش کرنے لگا۔

”تم کل رات بھی ایک بجے آئے تھے۔“ وہ دونوں بھائیوں کا خیال بھی رکھتا تھا اور ان کی ہر طرح کی خبر گیری بھی رکھتا تھا۔

”وہ عمار اور میں سی دیو چلے گئے تھے۔“ اس نے منمننا کے بتایا شازل نے اسے گھورا اسے ویسے بھی اتنی رات کو ایسی جگہوں پر جانا فطری پسند نہ تھا۔

”کل تو چلے گئے آئندہ نہیں اتنی رات گئے جانا۔“ اس نے وارننگ دی، سمیل برتن اٹھا کے

کچن میں رکھنے جا رہا تھا کہ اسے شرارت سوچھی۔

”امی برتن دھوانے بھی عنانزہ باجی کو بلا لیں۔“ سمیل نے شوخی سے کہا۔

”وہ ہماری نوکر نہیں ہے مجھے تو پہلے ہی اتنی شرمندگی ہو رہی ہے بے چاری بچی اتنا کچھ کر کے گئی ہے مجھے تو خبر بھی نہ ہوئی۔“ انہوں نے سمیل کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”تو پھر آپ بھائی جان کی شادی کا سوچئے، کب تک میں ڈش واشنگ کرتا رہوں گا۔“

شازل نے نگاہ اٹھا کے اسے دیکھا تو وہ لب بھینچ کر رہ گیا باسل کی ہنسی نکل گئی۔

”فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔“ جواباً جھاڑ ملی تھی۔

”ٹھیک تو کہہ رہا ہے جیسے ہی ہم اپنے گھر میں شفٹ ہوں گے فوراً تمہاری شادی کر دوں گی، کوئی پسند ہے تو تینا دو، پھر نہ کچھ کہنا۔“ امی تو مصمم ارادہ باندھ چکی تھیں۔

”میں نے منع تو نہیں کیا بس تھوڑا انتظار تو کر لیں۔“ اس کی سوچوں میں کافی دنوں سے عنانزہ کا سزا پایا لہرانے لگا تھا وہ صاف گواہ رنگ مزاج لڑکی اس کے دل کو اچانک ہی بھاگئی تھی وہ خود حیران تھا۔

”بھائی میرے ٹیوشن کا بھی مسئلہ ہے۔“ سمیل کچن سے نکل کر بولا۔

”میں نے عنانزہ سے کہا ہے وہ پڑھا دیا کرے گی مگر خبردار جو تم نے اسے تنگ کیا تو۔“ امی نے کہا۔

”داعی وہ راضی ہوگئی ہیں۔“ اسے یقین نہ آیا۔

”امی فیس ضرور پوچھ لیجئے گا۔“ شازل نے یاد دلانا ضروری سمجھا۔

”فیس کی میں نے بات کی تو ناراض ہوئے گی تھی، کہنے لگی کہ وہ سمیل کو بھائی کی طرح سمجھتی

ہے، میں بھی خاموش ہوگئی اب کیا کہتی۔“

”کوئی گفٹ وغیرہ دے دیں گے۔“

”اچھا مجھے جانا کب ہوگا۔“ سمیل تو سن کے ہی خوش ہو گیا کہ وہ پڑھانے کو تو راضی ہوئی۔

”کہہ رہی تھی پانچ بجے سے سات بجے تک پڑھائے گی تم پابندی سے کل سے چلے جانا۔“ وہ تنبیہ کرنے لگیں۔

”امی وہ تو اس سے اتنا خار کھاتی ہیں پڑھانے پر کیسے راضی ہوگئی ہیں۔“ باسل کو تو چیرا لگی ہوئی وہ اکثر ان کے آنے جانے پر چڑتی تھی اور اکثر دونوں کو جھاڑ بھی دیتی تھی۔

”نفاست پسند ہے ہر کام کو ترتیب سے کرتی ہے اور پھر تم دونوں بھی تو اسی وقت نیچے اترتے ہو جب وہ صحن دھو رہی ہوئی ہے۔“ وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ کیوں کہہ رہا تھا اور اکثر وہ دونوں کو اسی وقت ڈانٹتی تھی، شازل کو جانے کیوں اس کی تنگ مزاجی پر ہی نہیں لگتی تھی اس کے ہر انداز میں سادگی ہی لگتی تھی جو صاف گوئی سے بات کرتی تھی یہی بات اسے منفرد بناتی تھی۔

☆☆☆

”افتخار کے تینوں بیٹے بہت عزت کرتے ہیں میری اور دیکھو شازل نے کیسے ساری ذمہ داری اٹھائی ہے۔“ اختر علی کو اپنے مرحوم دوست کے تینوں بیٹوں کو دیکھ کر رشک آتا تھا کیونکہ اللہ نے انہیں اولاد نہ دی تھی مگر وہ اپنی چاروں بیٹیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔

”آج افتخار زندہ ہوتا تو کتنا خوش ہوتا کہ اس کا بیٹا کیسا ذمہ دار ہو گیا ہے۔“ عنانزہ ان کے لہجے کی عرووی بھی نوٹ کر رہی تھی اور محسوس بھی کر رہی تھی۔

”ابو میں کیا آپ کی بیٹے سے کم ہوں دیکھیے گا ساری ذمہ داری میں اٹھاؤنگی اور بھی

دیکھیے گا ساری ذمہ داری میں اٹھاؤنگی اور بھی

بھی آپ کو اور امی کو تنہا نہیں چھوڑ دیتی۔“ اس نے لاڈ سے کہتے ہوئے ان کے شانے سے سر نکا دیا جب سے اس کی ممکن ٹوٹی تھی اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ساری زندگی ابو اور امی کا سہارا بن کے رہے گی ابونے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”بیٹی باپ کے لئے ایک فرض ہوئی ہے اور اسے ادا کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ یہ سنت رسول ہے۔“

”ابو آپ سے میں کہہ چکی ہوں مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔“ وہ تو ضد باندھے بیٹھی تھی طلعت بیگم اس کی ضدی طبیعت سے نالاں تھیں۔

”زیادہ بک لک کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں ساری عمر کوئی گھر میں نہیں بیٹھانا ہے۔“ طلعت بیگم نے اندر آتے ہوئے اس کے خیالات خاصی ناگواری سے سنے اور اسے سرزنش کی۔

”اگر میں شادی نہیں کروں گی تو دنیا کے کام نہیں رک جائیں گے اور پھر میں کیا اپنی بہنوں کو دیکھتی نہیں ہوں کیسی پریشان رہتی ہیں آپنی الگ بیٹیوں کے طعنے سنتی ہیں کہ ان کے بیٹا کیوں نہیں ہیں اور فائزہ باجی ذرا خوش حال ہیں تو ان کی جیٹھانی صاحبہ نے جینا دو بھر کیا ہوا ہے تین بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں گزارہ کر رہی ہیں اور وہ ملیحہ اس کی ساس انہیں تو ہدایت دے اللہ، اوپر سے اس کا شوہر فراز جانے کیوں اکڑ رہتا ہے، مجھے بھی انہیں سمجھیں لوں میں ڈالنا چاہتی ہیں۔“ وہ تو نان اسٹاپ شروع ہو گئی اور وہ بھی اپنے ابو کے سامنے طلعت بیگم نے تو سر ہی پیٹ لیا۔

”کیسی زبان چل رہی ہے دیکھ رہے ہیں آپ کا بھی لیاظ نہیں کر رہی ہے۔“

”تم بھی تو شروع ہو جانی ہو پیار سے بھی سمجھایا جاتا ہے۔“ انہوں نے اپنی بیٹیوں پر بھی

کی ہی نہ تھی اور نہ قائل تھے۔

”امی مجھے ہی ڈانٹتی ہیں کبھی جو میری بات سمجھنے کی کوشش کی ہو۔“ وہ اختر علی کی حمایت پاتے ہی افسردہ ہو گئی اور کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں بچے تخت پر بیٹھ گئی آنکھوں میں ڈھیروں پانی تھا جو سوسوں کر کے بہا رہی تھی، شازل نے کسی کے رونے کی آواز سنی تو بے ساختہ ٹیرس سے نچے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا نیوب لائٹ کی روشنی میں پورا صحن روشن تھا وہ گلابی لان کے کپڑوں میں اپنے دراز بالوں کی چوٹی آگے کسے سوسوں کر رہی تھی۔

”امی آپ سن لیں مجھے شادی نہیں کرنی ہے کبھی بھی نہیں۔“ جسے ہی طلعت بیگم باہر آئیں اس نے سر اٹھا کے چیخ کر کہا۔

”ذرا آہستہ بولو، باپ کا خیال نہیں ہے تو اوپر والوں کا خیال کروں جو ان لڑکوں والا گھر ہے۔“ وہ اسے سخت لہجے میں ڈانٹ رہی تھیں مگر اس پر تو جیسے کسی بات کا اثر ہی نہ ہوتا تھا۔

”سنئے ہیں تو سن لیں مجھے کسی کی پرواہ نہیں اور ہاں اگر اب کوئی میرے لئے پرپوزل آیا نہ اس کی خیر نہیں ہوگی۔“ غصے میں بولتی پیر پختی اندر چلی گئی شازل کے ہونٹوں پر تبسمی مسکراہٹ دوڑ گئی اس لمحے تو وہ اور پیاری لگی۔

☆☆☆

”السلام علیکم!،“ سمیل نے زور دار فریاد سلام جھڑا وہ تخت پر پڑے کپڑوں کی تہہ لگا رہی تھی صبح ہی مشین لگا کے سارے گھر کے کپڑے دھوئے تھے۔

”علیک السلام!“ آج ذرا سلیقے سے جواب دیا گیا، کیونکہ دودن سے وہ پڑھنے آ رہا تھا تو اس کو اندازہ ہوا وہ شرارتی ضرور تھا لیکن تمیز ہرگز نہیں۔

”آج مجھے آپ سے میٹھس سیکھنا ہے

کیونکہ کل ٹیٹ ہے اور میری تیاری بالکل نہیں ہے۔“ وہ چیخ کر ٹیٹ کے تخت کے قریب لے آیا۔

”تم کا پی وغیرہ ریڈی کرو میں یہ کڑے اندر رکھ آؤں۔“ وہ کپڑے اندر لے جانے لگی تھی جب تک سمیل بک کھول چکا تھا اتنے میں مین گیٹ پر دستک ہوئی تھی وہ بک رکھ کر دروازہ کھولنے چلا گیا جہاں شازل کھڑا تھا۔

”سمیل کون آیا ہے؟“ وہ بولتی ہوئی باہر آئی مگر شازل کو دیکھ کر جھجک کے رک گئی جواب میں اس نے عنانزہ کو سلام کر ڈالا۔

”پلیز آپ اپنی طرف کار دروازہ استعمال کیا کریں۔“ مروت تو ذرا نہ برتی تھی، شازل کو رات کا منظر یاد آ گیا جب وہ رو رہی تھی۔

”لیکن عنانزہ باجی دروازہ تو میں نے کھولا ہے۔“ سمیل جھٹ بولا۔

”تم سے پوچھا، تم بیٹھو اور کام کرو۔“ اسے ڈبٹ دیا۔

”آپ تو شادی کے بعد اپنے میاں کو ڈانٹتی رہیں گی۔“ سر جھکائے شوخی سے لقمہ دیا وہ بھنا کے اس کی جانب گھولی۔

”کھڑے ہو جاؤ اور اٹھاؤ اپنی کتابیں مجھ سے پڑھنے آتے ہو یا مجھ پر طنز کرنے۔“ اس کی کتابیں اٹھائیں اور بازو سے پکڑ کے کھڑا کیا سمیل تو بوکھلا گیا شازل ایک گڑ بڑایا کیونکہ غصہ میں وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔

”محترمہ میں سوزی کرتا ہوں اس کی طرف سے، پلیز اسے ایک سیو زکریں۔“

”یہ کچھ بھی بکواس کرے گا آپ سوزی کرتے رہیں گے۔“ وہ شازل کی بارعب شخصیت کے آگے بڑھے پر اعتماد اور غرور انداز میں بولی کہ وہ خفیف سا ہوا۔

”اگر حالات ایسے ہی ہوں تو کرنا تو پڑے

گا۔“ لہجہ معنی خیز تھا۔

”حالات کسے حالات؟“ وہ سمجھی نہیں سمیل کی ہنسی چھوٹ گئی جبکہ شازل بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ روکی، اگر وہ اس کی ہونق صورت کے سامنے نکل گئی تو وہ اسے بھی نہیں چھوڑے گی۔

”جی میرا مطلب ہے کہ سمیل کچھ شرارتی ہے لیکن بد تمیز نہیں ہے۔“ وہ آہستہ کی بولا عنانزہ نے بغور اسے دیکھا، بلیو جینز اور بلیو ہی جینز کی شرٹ میں وہ بے حد چارمنگ اور ہنڈسم لگ رہا تھا۔

”کیا بھائی بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“ سمیل نے شرارتی اور معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ جھینپ گئی۔

”شٹ اپ۔“ وہ ڈانٹ کے اندر چلی گئی۔

”بھائی جان بتائیے یہ چلے گی آپ کے ساتھ مطلب اگر انہیں میری بھانجی بنادیں تو بری تو نہیں ہیں۔“ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

”یار ڈانٹتی بہت ہے سوچ لو اپنی نہیں چلے گی بلکہ اس ہٹلر کی چلے گی۔“ شازل کو تو خود وہ پہلی نظر میں پسند آئی تھی۔

”کوئی بات نہیں آپ بھی تو کم نہیں ہیں اپنی چلاتے ہیں۔“ وہ جھٹ بولا۔

”تمیز سے زیادہ پھیلنے کی نہیں ہو رہی ہے۔“ شازل نوراً اپنے رتبے کا خیال آیا تو وہ معتبر بن گیا۔

”سنوٹم لوگوں نے جو بھی باتیں کرنی ہیں نا اوپر جا کے کرو۔“ عنانزہ اندر سے باہر آتے ہوئے بولی، شازل تو جزبز ہو گیا جبکہ سمیل نے اپنی بیٹی کی نمائش کی تو عنانزہ نے کتاب اس کے سر پر دے ماری، وہ ہی کر کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”کتنا کام باقی رہ گیا ہے بیٹا گھر کا ابھی۔“

امی نے اس سے پوچھا جو بیڈ پر دراز کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا۔
 ”اور کے پورشن میں فرش کی فینٹنگ ہو رہی ہے ابھی کچھ پن کی کینٹ وغیرہ بھی تیار ہونے والی ہیں دو ماہ تو لگیں گے۔“ کتاب اس نے سائیڈ پر بیڈ پر الٹ کے رکھی اور خود اٹھ کے بیٹھ گیا۔

”مجھے گھر کے مکمل ہونے کا انتظار ہے تاکہ پھر تمہاری بھی فکر کروں۔“ وہ بیڈ پر بیٹھی تھیں شازل نے مسکرا کے ان کے دونوں ہاتھ اپنے گرم اور مضبوط ہاتھوں میں تھامے۔

”امی اتنی جلدی بھی کیا ہے میں نے آپ کو منع تو نہیں کیا ہے نا ابھی گھر مکمل ہونے دیں پھر اس طرف بھی سوچ لیں گے۔“

”میں چاہتی ہوں کہ ہمیں تو بات وغیرہ شروع کروں۔“ انداز پر سوچ تھا۔

”ہے پھر کوئی نظر میں آپ کے۔“ وہ ان کا عندیہ لینے لگا کہ وہ اب کیا کہتی ہیں جبکہ وہ اپنی پسند سے ابھی آگاہ نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

”میری نظر میں ابھی تو کوئی نہیں ہے۔“
 ”پھر چھوڑیے جب نہیں ہے تو بعد میں سوچیں گے یہ بتائیے آپ نے بلڈ پریشر کی ٹیسٹ لی یا نہیں۔“ وہ موضوع بدلنے لگا۔

”کھالی ہے میں نے لیکن شازل مجھے تم اب ٹالو نہیں بیٹا تمہاری شادی کی عمر ہو چکی ہے اپنے دوست اسعد کو ہی دیکھو دو بچوں کا باپ بن گیا ہے۔“ انہوں نے اسعد اس کا کلاس فیلو پانچ سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔

”آئے اسعد اور اس کی بیوی کہو گی کہ وہی تمہارے لئے کوئی لڑکی دیکھے میں بیمار کہاں دیکھوں گی اور نہ مجھ میں ہمت ہے کہ جا کے دیکھوں۔“ جب سے افتخار احمد کا انتقال ہوا تھا وہ خود بہت کمزوری ہو گئی تھیں ان کی یاد ان کے دل

سے کسی لمحے جاتی ہی نہیں تھی۔

”آپ اپنے پاس ہی نظر دوڑائیے۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا، امی نے چونک کر اسے دیکھا کہ وہ سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے مگر اس وقت شازل کی نگاہ جھکی ہوئی تھی۔

”آس پاس کہاں نظر دوڑاؤں اگر ہے تمہاری نظر میں جلدی بتاؤ مجھے۔“ وہ تو جیسے بے تاب ہی ہو گئیں کیونکہ شازل کے لہجے میں کچھ لگا تھا۔

”اخترا نکل کی عنائزہ باجی کیسی رہے گی۔“ اندر داخل ہوتا سمیل خوشی سے بولتا بزرگانہ انداز میں دونوں کو ہی چونکا گیا۔

”عنائزہ؟“ امی حیرانگی سے بولیں۔
 ”ارے امی! عنائزہ باجی ایک دم پرفیکٹ ہیں ہر کام وقت پر کرنے والی اور پتہ ہے امی بھائی کو تو تحفوں میں سیدھا کر دیں گی۔“ اس نے چٹکی بجا لی۔

”ارے اس طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا۔“ وہ تو سن کے ہی خوش ہو گئیں کہ ان کا مسئلہ منٹوں میں حل ہوا تھا سمیل نے فخر سے اپنے کالر اکڑائے۔

”میں کل صبح ہی بھابھی سے بات کرتی ہوں۔“

”امی..... امی پلیز ابھی ایسی کوئی بات نہ کریں کم از کم ہم اپنے گھر میں شفٹ ہو جائیں۔“ شازل تو گھبرا گیا۔

”مجھے تو اب بالکل نہیں رکتا یہ میں تو پہلی فرصت میں کرونگی کہ عنائزہ کا ہمیں اور رشتہ نہ ہو جائے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔“

”ای آپ کو پتہ ہے عنائزہ باجی کی پہلے بھی مگنی ہو چکی ہے۔“

”ہاں یہ مجھے پتہ ہے اور پھر وہ لوگ ہی لالچی اور کمینے تھے ہیرا لڑکی ہے ہر کام میں طاق

ہے اتنی سمجھ دار ہے۔“ وہ تو اس کی خوبیوں پر قصیدہ گوئی کرنے لگیں شازل مسکراتے لگا۔

”امی خیال سے زبان چلانے میں بھی طاق ہیں۔“ سمیل نے اب ہانکنا شروع کیا۔

”بکے جانا اور تم بس رہے ہو ایک پھٹریوں نہیں لگاتے۔“ امی کو تو غصہ آ گیا کہ اس نے ایسی بات کہی کیوں اور شازل بس رہا تھا۔

”امی میں تو آپ کو آگاہ کر رہا ہوں اور پھر دیکھئے ہمارا اپنا گھر اتنا بڑا ہو گا کہ یہ تو صفائیاں کرتی رہیں گی یا ہمیں ڈانٹتی رہیں گی سمیل ادھر نہیں بیٹھو بائیں یہاں جوتے نہیں رکھنا، انوہ آپ کیا کرتے ہیں دیکھ نہیں رہے ابھی واپس لگایا ہے

میں نے یہ بھائی وہ آپ سے کہیں گی۔“ سمیل نے شوخی سے عنائزہ کی نقل اتاری، شازل کا بے ساختہ قہقہہ اس کی پسندیدگی کی سند دیتا امی کو سر شاہد کر گیا۔

☆☆☆

آج نیچے پورشن میں بڑا شور ہو رہا تھا شازل سمجھ گیا تھا کہ اخترا نکل کی تینوں بیٹیاں اپنے بچوں سمیت آئی ہیں کیونکہ پندرہ دن میں ہر انوار کو وہ آتی تھیں۔

”بھائی جان آج تو رات تک خوب آوازیں آئیں گی اور ساتھ ہی عنائزہ بھابھی کی چیخ و پکار۔“ بائیں ڈرائنگ روم میں آیا جہاں وہ کمپیوٹر پر بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا۔

”بھابھی؟ ہوش میں تو ہو۔“ شازل نے حیرانگی کے ساتھ ٹوکا۔

”وہ ہم دونوں نا ابھی سے بھابھی کہنے کی عادت ڈال رہے ہیں تاکہ بعد میں مشکل نہ ہو۔“ سمیل ایسے بولا کہ جیسے رشتہ شازل سے طے ہو گیا ہو دونوں صوفے پر پھیل کے بیٹھ گئے تھے۔

”اگر سن لیا نا اس نے دماغ ٹھکانے لگا دے گی۔“ وہ مانیٹر پہ نگاہیں مرکوز کیے کی بورڈ پر

مسلسل انگلیاں چلاتا ہوا کام کر رہا تھا۔
 ”سمیل نکل آپ کو ہماری آئی بلا رہی ہیں۔“ عنائزہ کا بھانجا اسے بلانے آیا تھا۔
 ”اچھا آتا ہوں۔“ وہ مسکرایا اور فوراً اٹھ کر نیچے پہنچ گیا۔

”سنو سمیل جلدی سے ایک کلو ٹماٹر ہرا دھنیہ پودینہ اور ہاں چھوٹی والی ہری مرچیں ایک پاؤ لادو۔“ عنائزہ نے اسے پیسے اور لست تھائی۔

”عنائزہ یہ تو بعد میں بھی تمہارے حکم مانا کرے گا۔“ لمبے نے معنی خیزی سے کہا اس کے بڑھتے قدم رکے اور تھکے چوتھوں سے گھورانا بھی کی کیفیت میں اسے دیکھا۔

”بعد میں کیا مطلب ہے؟“
 ”لگتا ہے امی نے ابھی تک تمہیں بتایا نہیں ہے، ہمیں مشورے کے لئے تو بلایا ہے ابونے۔“
 ”کیسا مشورہ؟“ عنائزہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پھر پوچھا۔

فائزہ او مارہ بھی اندر آ گئیں عنائزہ نے اب آئی کو بغور دیکھا جو مسکرا رہی تھیں۔

”عنائزہ تمہارے لئے شازل کا پریپوزل لے کے آئی تھیں آئی۔“

”کیا پریپوزل میں نے کہا بھی تھا امی سے مجھے شادی ہی نہیں کرنی۔“ سن کے ہی وہ تو چراغ یا ہو گئی مارہ کی فہمائش نگاہوں نے دیکھا اور اس کے زبردستی پکڑتے بیڈ پر بیٹھا۔

”یہ بے وقوفوں والی باتیں تم بچھلے دو سالوں سے کر رہی ہو اب اتنا اچھا رشتہ ہے یہ شازل کا اور پھر سب سے بڑھ کر ابو کے دوست کا بیٹا بڑھا لکھا ہے، اچھا خاصا اپنا بزنس بھی ہے اور کیا چاہیے؟“

”مارہ باجی آپ بھول گئیں پچھلے بار بھی ابو نے دھوکہ کھایا تھا اپنے ایک دوست کے کہنے پر ہی میری مگنی کی تھی یاد ہے آپ کو۔“ وہ سخی سے

بولی، کیونکہ جب بھی وہ سب یاد آتا تو اسے غصہ ہی آتا اور پھر مٹکی ٹوٹنے کے بعد تو اس نے رشتہ داروں جبکہ اپنی بہنوں کے گھر تک جانا چھوڑا ہوا تھا لوگوں کی طرح طرح کی باتوں کی وجہ سے۔
”وہ تمہارے قابل ہی نہ تھا۔“ ماثرہ نے بھی سمجھایا۔

”ماثرہ باجی مجھے شادی ہی نہیں کرنی ہے ابو اور امی کا سہارا بن کر رہنا ہے۔“

”تم جو سوچ رہی ہو وہ سب غلط ہے ابو اور امی کی تم ذمہ داری ہو اور پھر وہ دونوں تمہیں اپنے گھر بسا دیکھ کر خوش ہوں گے۔“ لمیچہ نے بھی مدبرانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تم زیادہ مجھ سے بڑی بننے کی کوشش مت کرو، مجھ سے چھوٹی ہو اور چھوٹی ہی رہو۔“ اس نے لمیچہ کو ٹوڈاٹ ڈیا وہ جزبہ سی ہو گئی۔

”اچھا اچھا بس کرو تم دونوں کی پھر لڑائی شروع ہو جائے گی اور ہاں عنائزہ شازل اچھا لڑکا ہے خوش رہو گی اس کے ساتھ۔“

”مجھے شادی ہی نہیں کرنی ہے امی اور ابو کو بتا دیجئے گا اور شازل احمد کی تو بس وہ خبر لوں گی کہ یاد رکھے گا کہ ایسا سوچا بھی کیوں؟“ اس کی توپوں کا رخ شازل کی طرف ہو گیا تئیں بہنوں نے تاسف سے اسے دیکھا جو بات کو سمجھ ہی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

شازل کی امی سارہ بھابھی نے دو تین بار جواب کا پوچھا مگر طلعت بیگم نے کچھ دنوں کی اور مہلت مانگی تھی وہ سمجھتی بھی تھیں کہ عنائزہ کی وجہ سے وہ تذبذب کا شکار ہیں۔

”امی کتنے دن ہو گئے ہیں آنٹی نے ابھی تک کوئی رضا مندی ہی نہیں دی۔“ باسل بھی انتظار سے اکتا گیا کیونکہ شازل کا پرنسپل دیئے پندرہ دن سے اوپر ہو گئے تھے۔

”اتنی جلدی کوئی لڑکی والا جواب نہیں دیتا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”امی آپ کو نہیں پتہ یہ عنائزہ بھابھی ہی روڑے اٹکار رہی ہوں گی۔“ سمیل بھی بولا۔

”میں تم دونوں نے بھابھی کیوں کہنا شروع کر دیا ہے ابھی کوئی بات طے تو نہیں ہوئی سن لی نا کسی نے اچھا نہیں لگے گا۔“ امی نے دونوں کو ہی سرزنش کی۔

”امی آپ اطمینان رکھیے جواب ہاں میں ہی ہو گا ہم تو بس بھابھی ہی نہیں گئے۔“ سمیل بلیک پینٹ پر ڈیپ مہرون شرٹ میں ٹکھرا کھرا اپنی کتابیں اٹھا کر عنائزہ سے پڑھنے جانے کے لئے تیار تھا۔

”تم روز پڑھنے جاتے ہو وہ سیدھے منہ تم سے بات تو کرتی نہیں۔“ باسل نے اس کی تیاری کو طائرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”میں بھی اپنے نام کا ایک ہی ہوں انہیں زبردستی بیٹھا لیتا ہوں پھر مجبوراً انہیں پڑھانا پڑتا ہے۔“ وہ کہتا ہوا نکل گیا تھا نیچے آیا تو دیکھا کافی خاموش تھی۔

”آنٹی وہ عنائزہ باجی کہاں ہیں۔“ ان کے سامنے بھابھی کہنے سے اجتناب برتا۔

”عصر کی نماز پڑھ رہی ہے۔“ وہ اختر علی کے کرتے کے بن ٹانگ رہی تھیں، سمیل برآمدے میں رکھی چیئر پر بیٹھ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا کچھ ہی دیر میں وہ بلیولان کے پرنسڈ کپڑوں میں بیزاری صورت بنائے آ گئی۔

”السلام و علیکم بھابھی صاحبہ۔“ شرارت سے دہلی دلی آواز میں سلام کیا۔

”تمہارا سر توڑ دو گی اگر تم نے بھابھی کہنا بند نہیں کیا تو۔“ وہ وارننگ دیتی ہوئی اس کے سامنے والی چیئر پر بیٹھ گئی۔

”یہ تو طے ہے میں بھابھی کہنا چھوڑوں گا

نہیں اور دیکھئے گا اسی سال ہی ہم آپ کو رخصت کر کے لے جائیں گے، ہمارا گھر بس کپلیٹ ہونے والا ہے۔“

”میری مرضی کے بغیر کیسے رخصت کروا سکتے ہو۔“ وہ بھی غصے سے گویا ہوئی، کچھ دنوں سے اس کا سامنا شازل سے بھی نہیں ہو سکا۔

”آپ کی مرضی سے ہی کروائیں گے ہمارے بھائی کروڑوں میں ایک ہیں اتنی قدر کریں گے آپ کو کہ آپ حیران رہ جائیں گی۔“ اس نے معنی خیزی سے کہتے ہوئے کن انکھوں سے عنائزہ کی صورت دیکھی جو غصہ کی وجہ سے تنہا رہی تھی۔

”زیادہ الٹی سیدھی ہانکنے کی ضرورت نہیں۔“

”آنٹی..... آنٹی۔“ سمیل نے طلعت بیگم کو دیکھتے ہی آواز لگائی جو کچن میں جا رہی تھیں۔

”دیکھیے آنٹی آپ جلدی سے ہاں کر بھی دیجئے بھائی جان آپ گئے دیکھے بھالے ہیں۔“

”زیادہ میری امی کو پٹانے کی ضرورت نہیں ہے جب میں راضی نہیں تو کیسے جواب دیں گی وہ۔“ وہ آنکھیں نکال کے بولی مگر سمیل کو جیسے اس کے بھڑکنے کی پرواہ ہی نہ تھی۔

”بیٹا تمہارے انکل ہی اسے سمجھائیں اسے میری تو یہ سنتی نہیں۔“ وہ افسردگی سے گویا ہوئیں انہیں عنائزہ کی رات دن فکر رہتی تھی وہ سمجھا سمجھا کے تھک سی گئی تھیں جو اپنا نقصان کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

”میں نے بھابھی کو ہاں میں جواب دے دیا ہے کیونکہ شازل سے بہتر میں کوئی اور رشتہ نہیں مل سکتا ہے۔“ اختر علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”پہلے جو کچھ میری وجہ سے ہوا اس کا مالامال مجھے آج بھی ہے بیٹا میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں، شازل اچھا بچہ ہے۔“

”پلیز ابو آپ کیوں کرتے ہیں ایسی باتیں میں آپ دونوں کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ ان کے گلے سے لگ گئی وہ اپنے ابو کو احساس محرومی میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”میں تمہیں دور کب کر رہا ہوں بلکہ شازل بیٹے کی وجہ سے تم تو ہمیشہ قریب رہو گی۔“ وہ اسے بڑے نرم لہجے میں سمجھا رہے تھے اور وہ لب کاٹ رہی تھی کتنی کوشش کی لاکھ انہیں منع کیا لیکن ابو نے آنٹی کو رضامندی دے دی تھی، انہوں نے اس کا ہاتھ چوم لیا خود بھی آندیدہ ہو گئے تھے عنائزہ کچھ زیادہ ہی حساس تھی اس لئے بھی اس کی فکر رہتی تھی وہ ہر بات گہرائی سے سوچتی تھی۔

صبح سے لے کر رات ہو گئی وہ کمرے سے ہی نہ نکلی، طلعت بیگم نے بھی اسے نہ چھیڑا، مگر پھر شازل بھوک لگی تو کچن میں کس کے چائے بنانے لگی، اتنے میں طلعت بیگم بھی وہی آ گئی اور بولیں۔

”اپنا ایک جوڑا نکال کر دے دو جو صبح ڈنک کا ہو بھابھی ناپ مانگ رہی ہیں تمہارا۔“ وہ جو سر جھکائے چائے پینے میں مصروف تھی ترنخ کے بولی۔

”جب رشتہ طے کر دیا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں، اپنی مرضی سے دے دیں۔“ کپ سنگ پر رکھ کر وہ تیزی سے کچن سے نکلی مغرب ہو چکی تھی برآمدے کی ساری ٹائیں چلائیں اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تو چونک گئی۔

”کھولو دروازہ تمہارے ابو ہونگے مغرب کی نماز پڑھنے گئے تھے۔“ طلعت بیگم نے اسے کہا وہ اپنا سرمی آچل شانوں پر درست کرتی دروازے تک آئی کھولا تو دیکھا سارے شازل کھڑا

تھا۔

”السلام وعلیکم!“ شازل نے سلام کیا۔
مگر وہ دانت پیس کے اسے گھورنے ہی لگی
اونچا لمبا ڈسنگ سا شازل ایک لمحے کو پرل سا ہو
گیا اور اس کا سرخ چہرہ دیکھ رہا تھا۔
”علیکم السلام تو کہہ دیں۔“

”مجھ سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت
نہیں ہے دیکھئے گا آپ کا میں جتنا دھڑک رہی
کیا سمجھ رہا ہے مجھے۔“ وہ تو پھٹ پڑی۔
”میرا قصور تو بتائیے مہترمہ۔“ وہ مبہم سی
مسکراہٹ لئے گویا ہوا۔

”سارا قصور ہی آپ کا ہے۔“ وہ چڑھ
دوڑی پھر اس کے پیچھے ابو کو کھڑے دیکھ کر گھبرا کر
اندر چل گئی شازل الگ جھینپ گیا انہیں سلام و
دعا کرنے کے بعد وہ تو اوپر چلا گیا عنائزہ اندر
بیٹھی کھڑی رہی۔

رات کو آئی اس کے کپڑوں کا ناپ بھی
لے گئی تھیں، تینوں بہنیں بھی ہفتہ کو آگئی تھیں ان
کے بھی بازاروں کے چکر لگنے لگے تھے۔

”عنائزہ میرے ساتھ کل پارل چلنا۔“ مازہ
نے اسے دیکھا جو فرآن پاک کی تلاوت کرنے
کے بعد اسے جزدان میں رکھ رہی تھی۔

”کیوں جاؤں۔“ ازلی ہٹ دھرمی عود کر
آئی۔

”ہر بات پر بحث مت کیا کرو تم کل ظہر کی
نماز کے بعد تیار ہو جانا۔“ مازہ نے سوچ لیا تھا
کہ اب وہ اس کی ایک نہیں سنے گی بلکہ ہر کام
ڈانٹ کے اور زبردستی ہی کروائے گی کیونکہ کسی
اور کے تو قابو میں نہیں آتی تھی۔

☆☆☆

سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ عنائزہ بھی
حیران تھی شازل کی امی زبردست قسم کے بڑے
اعلیٰ ڈریس نکاح پر لے کر آئی تھیں رخصتی انہوں

نے اپنے نئے مکان میں شفٹ ہونے کے بعد
رکھی تھی۔

”بھائی جان ایسا کچھ کریں کہ رخصتی آج ہی
کروالیں۔“ سمیل کو کچھ زیادہ ہی بے تاب تھی پھر
دونوں بھائی خوش بھی بہت تھے کہ عنائزہ ان کی
بھابھی بننے جا رہی تھی۔

”کیا کچھ ایسا کروں۔“ شازل آف وائٹ
قمیض شلوار میں ملبوس بے حد ڈینٹ لگ رہا تھا
امی نے تو باقاعدہ اس کی نظر اتاری تھی۔

”زیادہ بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں
ہے ویسے ہی وہ بہت پریشان ہے۔“ امی نے
دونوں کو ہی سرزش کی شازل ڈرینگ ٹیبل کے
آئینے کے آگے کھڑا خود پر پر فیمو اسپرے کر رہا
تھا۔

”ایک تو ہم اپنے ہیرو جیسے بھائی کو ہمیشہ
کے لئے دے رہے ہیں اس پر بھی پریشان ہیں
کیوں سمیل۔“ باسل نے تائیدی انداز میں اسے
دیکھا تو سمیل نے جھٹ سر ہلایا۔

”وہ کیا اس پر قبضہ جما لے گی ارے وہ بھی
اس گھر کا فرد بننے آ رہی ہے خبردار جو اس سے
بوکواس کی۔“

”بھائی جان، امی تو پہلے ہی عنائزہ بھابھی
کی دیوانی ہیں اب دیکھتے ہیں کہ آپ کا کیا حال
ہوتا ہے۔“ باسل نے حسب عادت شرارت کی۔

”تم لوگ الٹی سیدھی باتوں میں پڑے رہو
جلدی کرو شازل مہمان آگے ہیں، جلدی تیاری
مکمل کرو۔“ امی بھی اسکاٹی بلیو جارجٹ کے
چکن سوٹ میں بے حد نفیس لگ رہی تھیں آج ان
کی بھی فکر کم ہو گئی تھی کہ بڑے بیٹے کا نکاح ہو رہا
تھا۔

امی کے جلدی جانے پر وہ تینوں امی اور
چند خاص عزیز واقارب کی ہمراہی میں نیچے آگئے
پورے صحن اور برآمدے میں ہی مہمانوں کے

بیٹھنے کا انتظام رکھا تھا مولوی صاحب کو اسعد لے
آیا تھا کچھ ہی دیر میں نکاح کی کاروائی شروع ہو
گئی تھی۔

اتنے میں پھر فائزہ اور مازہ کے شوہر آگئے
تو شازل مودب انداز میں بیٹھ گیا وہ اس سے
باتیں کرنے لگے اسعد بھی ان کی باتوں میں حصہ
لے لیتا تھا، ڈنر بھی خاصا زبردست تھا اختر علی
نے اس چھوٹے سے فنشن میں بھی کوئی کسر نہ
چھوڑی تھی تصویریں اور مودی کا سلسلہ چل نکلا
عنائزہ کمرے سے نکلے کو تیار نہیں تھی میرون فل
موتی ستاروں سے کھرے کپڑوں میں میک اپ
اور طلائی جیولری میں حسین پری ہی لگ رہی تھی طہ
تو مسلسل پری خالہ کہے جا رہا تھا۔

”عنائزہ کیا حرکت ہے چلو سب ہی انتظار
کر رہے ہیں۔“ فائزہ نے زبردستی اس کا ہاتھ
پکڑا اور کھڑا کرنا چاہا۔

”آپنی مجھے نہ تصویریں بنوانی ہیں نا
مودی۔“ وہ اگر گئی، شازل کا سامنا نہیں کرنا چاہ
رہی تھی۔

”آئی میں تو کہتی ہوں کہ ابو سے کہیے کہ
اس کے ساتھ ہی رخصتی بھی کر دیں خواہ خواہ یہ
مسکے کھڑے کر لی رہے گی۔“ سی گرین کپڑوں
میں لیجہ اندر چلی آئی وہ بھی جھنجھلائی تھی اس کی
فضول ضد کی وجہ سے جو کسی کی نہیں مان رہی تھی یہ
بھی عنائزہ کا احتجاج ہی تھا۔

”تمہارا تو بس چلے تو یہی کر دینیں جارہی
میں جا کر کہہ دیں سب سے میرے سر میں درد
ہے۔“ وہ تینوں بہنیں غصے میں آگئیں پھر سامنے
شازل کی امی کو دیکھ کر وہ شرمندہ سی ہو گئی وہ
مسکراتی ہوئی آئیں۔

”آج تو تم اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ یہ
لہجہ بھی تم پر اچھا لگ رہا ہے چلو آؤ جلدی سے
میرے ساتھ تصویر بناؤ اور ذرا میرے بیٹے کا بھی

خیال کر لو وہ ایک جھلک تو تمہاری دیکھنے کا حق
رکھتا ہے۔“ انہوں نے پیار بھرے لہجے میں کہا
اور عنائزہ کی پیشانی جوم کی پھر وہ مزید کچھ نہ
بولی، چوہنشن ہی ایسی تھی ان کی ہمراہی میں باہر آ
گئی ایک سائیڈ پر چھوٹا سا اسٹیج بھی بنایا ہوا تھا
اسے شازل کے پہلو میں بیٹھا دیا اس کے وجود
سے بھی بھین پر فیمو اور کجروں کی مہک شازل کو
حواسوں پر چھپائی گئی، پھر وہ ایک رپورٹ کی
طرح سب کرنی جا رہی تھی، خاموشی سے مودی
بھی بنوانی اور تصویریں بھی، طلعت بیگم اور اختر
علی نے تشکر بھرا سانس بھرا تھا، سمیل، باسل اور
اسعد کا ہنسی مذاق ہو رہا تھا اور وہ جھینپتی ہوئی بیٹھی
تھی۔

☆☆☆

شازل نے رات دن کی کوششوں سے اپنے
گھر کو جلد مکمل کروانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی
یہ بھی اسی کا حکم تھا کہ وہ اب خاصی تھک چکی ہیں
گھر میں وائٹ واش ہو چکا تھا گھر سیٹ کرنا
مشکل مرحلہ تھا اور یہ سب امی کے بس کا تو نہ تھا
اسعد کی بیوی کے ڈیوڑی قریب تھی وہ بھی نہیں آ
سکتی تھی۔

”یہ اتنا سایان میں کیسے کرو گی یہ سب۔“ وہ
تو پریشان ہو رہی تھیں۔

”وہ آپ کی بہو ہے نہ تو بلائے اسے ہاتھ
بنائے آئے۔“ شازل شیو بنا رہا تھا اس کی آج
اہم میٹنگ تھی پھر دودن کے لئے اسے اسلام آباد
بھی جانا تھا اتنے کام تھے کہ شازل بھی ہلکا ہٹ
کا شکار تھا۔

”پہلے تو کبھی کبھار آ جاتی تھی اب تو بلانے
سے بھی نہیں آتی ہے۔“ وہ افسردگی سے گویا
ہوئیں۔

”کسے نہیں آتی بلکہ آج میں بلا کے لاتا
ہوں۔“ شیو کرنے کے بعد اس نے آفسر لوشن لگایا

بلک ٹراؤزر پر وائٹ شرٹ گلے میں تولیہ ڈالے وہ کمرے سے نکلے لگا۔

”ارے رک جاؤ وہ اپنے کام کر رہی ہوگی میں خود کر لوگی بیکنگ، پائل یونیورسٹی سے آنے والا ہے۔“ وہ اسے روکنے آگے بڑھی تھیں، جانتی تھی کہ عنازہ شازل کی وجہ سے بھی نہیں آئے گی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بلائے میں حرج نہیں ہے۔“ وہ یہ کہہ کر میز صیحاں اتر گیا عموماً وہ نماز کے بعد قرآن پاک پڑھتی تھی شازل نے اکثر دیکھا تھا تخت پر بیٹھی ملتی تھی۔

”ارے شازل بیٹا آؤ آؤ“ طلعت بیگم داماد کو دیکھ کر نہال ہی ہو گئیں، وہ جل سا ہو گیا پھر ایسی بے تکلفی کب بھی ہمیشہ ان سے اور اختر علی سے ادب کے دائرے میں ملتا تھا۔

”وہ اصل میں آئی امی کی کچھ طبیعت خراب ہے اگر وہ عنازہ کو بھیج دیں تو مہربانی ہو گی۔“ قدرے توقف کے بعد جھجک کے بولا۔

”ارے مہربانی کی کیا بات ہے بیٹی ہے وہ بھابھی کی وہ نہیں خیال کرے گی تو کون کرے گا۔“ وہ مسکرا دیں شازل جھینپ کے رہ گیا۔

”عنازہ..... عنازہ!“ انہوں نے یک بیک دو آوازیں دیں۔

”آئی ہوں امی!“ اندر سے اس کی بڑی فریش آواز آئی تھی، وہ سی گرین کاٹن کے کپڑوں میں سائیڈ پر دو پٹہ ڈالے بڑی مین سی باہر آئی مگر شازل کو دیکھ کر وہیں رک گئی۔

”جاؤ اوپر تم بھابھی کی طبیعت خراب ہے کچھ کام ہے وہ گردو جا کر۔“ امی اسے دیکھتے ہی بولی۔

”امی ابھی میں ابو کے کپڑے پر لیں کر رہی تھی۔“ وہ منمنائی۔

”بعد میں کر لینا جاؤ جلدی۔“ وہ حکم دے

انداز میں بولیں۔

شازل مسکراہٹ چھپاتا ہوا مڑ گیا عنازہ نے دانت پیسے اس کی چوڑی پشت کو گھورا، کیسے دھڑلے سے وہ اسے بلانے چلا آیا تھا بڑائی ہوئی میز صیحاں چڑھ رہی تھی کہ اسی وقت شازل نے شرارت کی اور دو میز صیحاں اتر کر اس کے قریب پہنچ گیا وہ تو بوکھلائی گئی، آج تو اس کے دیکھنے کا انداز ہی بدل گیا تھا۔

”نکاح کے بعد آپ کچھ اترانے نہیں لگی ہیں۔“ دیوار پر دونوں ہاتھ ٹکائے اس کے گرد حصار باندھ لیا۔

”کیا حرکت ہے ہٹائیے ہاتھ۔“ وہ تو غصہ میں آ گئی کیونکہ اس نے میز صیحوں کے درمیان روک لیا تھا کوئی آ بھی سکتا تھا۔

”اگر نہ ہٹاؤں تو کیا کر لیں گی۔“ عنازہ کی پرفسوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں وہ بے بسی سے لب کھلنے لگی چہرہ کی رنگت بھی سرخ ہو گئی۔

”میں جان سے بھی مار دوں گی اگر میرے ساتھ کوئی اپنی سیدھی حرکت کی تو۔“ اپنا اعتماد بحال کرنے لگی مگر شرم و گھبراہٹ سے ہاتھوں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔

”پھر کیا خیال ہے رخصتی نہ کروالی جائے زیادہ آسانی رہے گی جان سے مارنے میں۔“ متنی خیز سے لہجے میں بولا۔

”بات سیں۔“ ”میں نے یہ نکاح صرف اپنے والدین کی خوشی کے لئے کیا ہے ورنہ مجھے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”کوئی بات نہیں ساتھ رہ کر ہو جائے گی آزمائش شرط ہے۔“ وہ اس کی طرف جھکنے ہی والا تھا کہ وہ اسے پیچھے دھکیلتی ہوئی نیچے واپس چلی گئی۔

”بدتمیز لوفر گھٹیا انسان کیا سمجھ رکھا ہے مجھے

کہ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں۔“ کمرے میں آ کے اتنا بڑائی کہ ایک ایک چیز کو دل کر رہا تھا کہ تم نہیں کر دے۔

”دیکھتی ہوں کیسے رخصتی کرواتے ہو، امریکہ میں کیا کیا کرتے ہونگے۔“ ذہن تو منفی سوچوں کے رخ پر چلا گیا تھا، ایک گرہ سی بڑھ گئی تھی جو شاید اس کی آئندہ زندگی کے لئے بھی ٹھیک نہ ہو اور ارامی سے کہا تو وہ نہیں یقین کریں گے کہ نہیں وہ تو پہلے ہی برا بھلا کہیں گی اس کی سوچ پر بہت سوچ و بچار کے بعد اس نے ملیحہ سے مشورہ کیا، مگر جواب میں ملیحہ نے اسے خوب سنا۔

”میری زندگی کا معاملہ ہے میں تو ضرور چیک کرونگی آخر بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ کہیں اور بھی چکر چلا چکے ہیں تو مجھے بہت غصہ آئے گا۔“

”سوچ لو ایسا نہ ہو کہ شازل بھائی کو خبر ہو گئی تمہیں الٹا نہیں منانا پڑ جائے۔“ وہ اسے آگاہی بھی دے لگی مگر وہ عنازہ ہی کیا جو ٹھان لیا اور سوچ لیا کر کے ہی چھوٹی تھی سو اس نے نئی سم خریدی تاکہ وہ شازل کے موبائل پر کال کرے گی اور دیکھے گی کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔

”عنازہ ایک بار پھر سوچ لو کیونکہ تم یہ بہت بڑی بے وقوفی ہو گی تمہاری اور یہ بات بھی تم یاد رکھو بھی بھی پر کتنے پر بہت اپنے بھی اپنے نہیں رہتے۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے میری جان تو چھوٹے گی کیونکہ مجھے شادی ہی نہیں کرنی تھی۔“ وہ موبائل میں سم لگا رہی تھی۔

”یہ جو تم بغیر سوچے سمجھے بولتی ہو نا مجھے غصہ آتا ہے۔“

”مجھے بھی اس وقت تم پر بہت غصہ آتا ہے جب تم اپنی قابلیت جھاڑتی ہو یہ ذہن میں رکھا

کر دو کہ مجھ سے چھوٹی ہو۔“ فوراً ہی اپنے بڑے ہونے کا رعب بھی جھاڑا۔

”بنتی رہو بڑی مگر کام بڑوں والے نہ کرنا۔“ وہ بھی منہ بناتی ہوئی کمرے سے نکل گئی عنازہ بڑے آرام سے بیڈ پر دونوں پاؤں سمیٹ کے بیٹھ گئی اور شازل کا نمبر ملایا دل دھڑ دھڑ بھی کر رہا تھا ہاتھ بیروں سے کپکپاہٹ بھی ظاہر ہو رہی تھی مگر یہ اس کی زندگی کا معاملہ تھا دوسری طرف سے ریو کر لی گئی کال۔

”ہیلو شازل احمد!“ لمبیر اور سنجیدہ آواز پر اس کی آواز نہ نکل سکی۔

”ہیلو..... ہیلو۔“ جھنجھلاتی ہوئی آواز نے عنازہ کو چونکا دیا۔

”جی وہ مجھے صنوبر۔“ بات کر جلدی میں بھی سوچا۔

”سوری یہ کسی صنوبر کا بستر نہیں ہے۔“ لائن کٹ کر دی۔

”اوتھہ فون پر کیسے کھڑوس بنے ہوئے ہیں نہ میں بھی کاٹھ کا لٹو بنایا تو دیکھے گا۔“ اسے تو بدلہ لینے کی بھی ضد سوار تھی جو حرکت شازل نے کل میز صیحوں پر کی تھی۔

”پلیز پلیز لائن کٹ نہ کیجئے گا نمبر بھی ملایا گیا تھا۔“

”دیکھئے مس جب میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ کوئی صنوبر نہیں ہوتی ہیں اس نمبر پر۔“ بے زاری اور اکتاہٹ سے جواب دیا۔

”وہ نہیں ہے تو کیا ہوا آپ تو ہیں نا کیا بات نہیں کر سکتے ہیں۔“ لہجے میں تنگ سوئے اسے اپنی آواز کے سحر میں جکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔

”میں اگر بات کر بھی لوں تو اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔“

”کیا پتہ آگے چل کے ہو جائے۔“ عنازہ

خاصے محتاط انداز میں بول رہی تھی تاکہ کسی انداز سے وہ پہچان ہی نہ لے۔
 ”ایسا کیجئے رات کو آپ مجھے کال کیجئے گا ابھی تو میں اپنے آفس میں بڑی ہوں۔“ شازل نے اس کی ہلکی اور محتاط آواز کے باوجود پہچان لیا تھا اس کے علاوہ ملیجہ نے شازل کو سب بتا دیا تھا کہ وہ اسے چیک کرنا چاہ رہی ہے سو وہ پہلے سے ہی اس کے فون کا منتظر تھا۔
 ”ویسے آپ اپنا خوبصورت سا نام بتائیں گی۔“

”سویرا کہتے ہیں مجھے۔“ کچھ اٹھلا کے گویا ہوئی۔
 ”او کے سویرا جی رات کی تنہائی میں باتیں ہوں گی بائے۔“ لائن کٹ کر دی گئی، عنانزہ نے مکہ فضا میں لہرا کے یا ہو کا نعرہ بلی آواز میں نکالا تاکہ کسی کو آواز نہ چلی جائے اور خوشی سے گنگنائے لیٹ گئی۔

☆☆☆

رات کو جلدی کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد عشاء کی نماز بھی پڑھ لی تاکہ بے فکری اور اطمینان سے وہ بات کر سکے گی امی اور ابو جلدی سونے کے عادی تھے گیارہ بجے تک تو لازمی سو جاتے تھے، وہ اپنی بیڈ کی رائٹ سائیڈ کی دراز سے موبائل نکالنے لگی بیڈ کی بیک کراؤن سے ٹیک لگا کے بیڈنگنی بارہ تو بج ہی چکے تھے نمبر پر نہیں کر رہی چچی بھی دل کی دھک دھک جانے لگی پڑھ جاتی تھی شازل کا سوچ کے ہی وہ خود حیران تھی کہ آخر اسے ہو کیا جاتا ہے۔
 ”میں شازل اسپینک۔“ اس کی گہیر آواز پر عنانزہ نے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کی

”اسلام علیکم! کیسے ہیں؟“

”علیکم السلام کیا ہوں تو آپ کی اتنی

پیاری مدد بھری آواز سننے کے بعد تو دل ٹھکانے پر ہی نہیں ہے۔“ شازل نے لہجے کو خمار آلود بنا لیا۔

”جھوٹ اچھا بول لیتے ہیں۔“ اس نے تسخراڑ لیا۔
 ”جھوٹ تو میں بالکل بولتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ جو رشتہ جوڑا جائے تو خلوص نیت اور خلوص محبت سے جوڑا جائے۔“
 ”کس سے جوڑ رہے ہیں رشتہ؟“ وہ ہنسی کے ساتھ گویا ہوئی۔

”آپ سے جوڑ رہا ہوں سویرا جی!“
 ”اونہہ کھل کے آگئی نا اصلیت لڑکی کی آواز سننے ہی پھسل گئے۔“ دانت پیس کے سوچا موبائل کو کان سے ہٹا کے اسے ٹھورا جیسے وہ شازل ہی ہو۔
 ”ہاں تو سویرا جی کیا خیال ہے رشتہ بنائیں گی میرے ساتھ۔“
 ”کک..... کیسا رشتہ؟“ وہ گڑبڑائی بھی کہ جانے کون سے رشتہ کی بات کر رہے گا۔

”ظاہر ہی بات ہے دوستی کا کیونکہ کہتے ہیں دوستی کے بعد ہی آگے بڑھا جاتا ہے ورنہ دوستی کے بغیر تو کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا۔“ شازل معنی خیزی سے بولا وہ بھی اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا۔
 ”اچھا پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ کیا کرتی ہیں۔“
 ”کال میں نے کی ہے یا آپ نے؟“

”آپ نے کی ہے۔“ وہ ہنسا۔
 ”پھر میں پوچھوں گی کہ آپ کیا کرتے ہیں؟“

”میں چلیے اپنا تعارف خود ہی کروانا ہوں شازل احمد نام ہے والد صاحب پچھلے سال وفات پا چکے ہیں دو چھوٹے بھائی ہیں اور میری

امی ہیں آج کل ہمارا گھر بن رہا ہے بلکہ بن چکا ہے شفٹ ہونے والے ہیں میرا نکاح ہو چکا ہے گزشتہ ایک ماہ پہلے۔“ اس نے ایک بھی جھوٹ نہ بولا اور سب سچ ہی بتایا تھا۔

”کیا نکاح ہو چکا ہے پھر بھی آپ مجھ سے بات کر رہے ہیں۔“ عنانزہ حیرت سے بولی۔
 ”کیوں اس میں اتنا چوکنے کی کیا بات ہے آپ بھی تو کر رہی ہیں۔“ وہ اس کا چونکنا سمجھ رہا تھا۔

”لیکن میرا تو نہیں ہوا نکاح۔“ روانی میں ہی نکل گیا۔

”واہ امیزنگ۔“ قہقہہ لگایا۔
 ”پھر کیسے کیا میں اپنا پر پوزل بھیج دوں سویرا جی۔“ اسے چڑانے لگا۔

”شٹ اپ آپ کو شرم نہیں آتی ایسی بات کرتے ہوئے، جو نکاح شدہ ہو کر مجھے پر پوز کر رہے ہیں۔“ وہ غصے میں آگئی۔
 ”بالکل بھی نہیں، ایک نکاح کے بعد کیا دوسرا نکاح نہیں ہو سکتا۔“ وہ جوابا بولا۔

”مجھے نیند آرہی ہے میں سونے لگی ہوں اب۔“ اسے اور کچھ نہ سوچا فون بند کا بہانہ کر دیا۔

”میری نیند آڑا کر آپ کیسے سو سکتی ہیں۔“ وہ اسے تنگ کرنے لگا۔
 ”میں کل کر دی گئی آپ کو پھر کال۔“ اس نے جان چھڑائی۔

”محترمہ میں کیسے دل کو سمجھاؤں۔“
 ”جی دماغ تو درست ہے آپ کا۔“ وہ تو مشتعل ہو کر چیخنے لگی۔

”آپ بہت فضول باتیں کرتے ہیں مجھے آپ کی نیچر بہت چل گئی ہے اس لئے آئندہ میں آپ کو بھی کال نہیں کروں گی۔“ اس کا دل بے حد خراب ہوا، وہ بھی اور مردوں کی طرح نکلا جو

لڑکی دیکھ کر اپنا ٹریک بدل لیتے ہیں۔
 ”لیکن میں اب آپ کا چچا ساری زندگی چھوڑنے والا نہیں ہوں ابتداء آپ نے کی ہے۔“ وہ مضبوط اور اٹل لہجہ میں اسے جتانے لگا تو عنانزہ بدحواس باختہ ہو کر لائن ہی کٹ کر دی ایسا لگا کہ شازل آس پاس ہی ہو۔

☆☆☆

ان کا گھر مکمل ہو چکا تھا شازل نے ایک ہفتے کے اندر اندر ساری شفٹنگ مکمل کر لی تھی کچھ مدد عنانزہ، ماثرہ اور ملیجہ نے آکے کر وادی بھی گھر بھی سیٹ ہو گیا تھا اب شازل کو اپنے بٹروم کے لئے فرنیچر پسند کرنا تھا وہ چاہ رہا تھا کہ اگر عنانزہ اپنی پسند سے لے تو زیادہ اچھا ہے، مگر مسئلہ یہ تھا کہ عنانزہ سے ڈائریکٹ نہیں کہہ سکتا تھا ایسے میں ملیجہ ہی بہترین راز داں لگی۔

”شازل بھائی آپ بے فکر ہو جائیے میں کچھ ناسمجھ کرتی ہوں عنانزہ کو آپ کل پک کر لیجئے گا۔“

”ملیجہ وہ مان تو جائے گی ناں۔“ شازل اس کی ضدی طبیعت سے مجھی واقف تھا۔
 ”کیوں نہیں مانے گی امی اور ابو سے کہوں گی تو دیکھیں گے گا ابو کا کہا تو وہ مال ہی نہیں سکتی ہے۔“ ملیجہ نے اسے اطمینان دلایا تھا۔

وہ مطمئن سا ہو کر شام کو گھر جلدی ہی چلا گیا تھا امی مغرب کی نماز لاؤنج میں ہی پڑھ رہی تھیں بڑا کشادہ بیٹھے بنوایا تھا بڑا سا پورچ پھر داخل ہونے کے لئے گلاس ڈور بڑا سا گوریڈور سامنے ہی لاؤنج اور گلاس ڈور کے رائٹ سائیڈ پر خوبصورت سا ڈرائنگ روم لیکن وہ بھی ڈریکوریٹ ہونے سے رہ گیا تھا کیونکہ یہ سب بھی اس نے عنانزہ کی پسند پر چھوڑا تھا لاؤنج کے ایک سائیڈ پر بڑا سا ہال کمرہ اس میں ایک صوفہ سیٹ پڑا تھا اور سامنے میٹرہیاں جاری تھیں اس

کے ساتھ ہی ڈانٹنگ ٹیبل تھی ہال کمرے کے لیفٹ پر بڑا اور کشادہ سا امریکن چین جس میں سب کچھ جدید اسٹائلش تھا ہال کمرے کے رائٹ پر امی کا بیڈ روم اور اس کا بیڈ روم تھا اوپر کے پورشن کو بھی بالکل نیچے کی طرح ہی بنوایا تھا باسل اور سمیل کا بیڈ روم اسٹڈی روم اور بڑا سالونج تھا۔

”کیا بات ہے آج جلدی آگئے۔“ امی نے دعا مانگنے کے بعد جائے نماز تہہ کی اور تخت پر لیٹ کے رکھی۔

”جی وہ ہاں بس کچھ تھکن ہو رہی تھی۔“ چونک کے انہیں دیکھا۔

”پھر کل عنازہ کو لے کر فرنیچر پسند کرنے جا رہے ہوتا۔“

”جی انشا اللہ راضی ہو جائے کیونکہ میں نے ملیر سے تو کہہ دیا ہے۔“ وہ اپنا موبائل چیک کرنے لگا جس پر عنازہ کی ہی کال آ رہی تھی مگر اس نے کٹ کر دی تھی۔

”میں نے آج بھابھی سے فون پہ کہہ دیا ہے وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ بیج دیں گی۔“

”آپ نے آئی سے کہہ دیا۔“ وہ خوش ہو گیا۔

”وہ فون کریں گی پھر تم جانا اسے ساتھ لے کر ہاں کچھ کپڑوں کی شاپنگ بھی کر لینا اپنی مرضی و پسند سے دن ہی کتنے ہیں شادی میں عید اچھی کے بعد میں نے سوچا ہے کہ رخصتی کی تاریخ لے لوں گی۔“ وہ ارادہ کر چکی تھیں کہ مزید دیر نہیں کر سکی کیونکہ ان سے بھی اتنے بڑے گھر میں اکیلے نہیں رہا جا رہا تھا اب۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ عنازہ کی پھر کال آئی تو وہ رسیو کرتا ہوا باہر پورچ میں نکل گیا تھا چھوٹا سالان جہاں وائٹ ملبی سی روشنی ہو رہی تھی وہ چہل قدمی کرنے لگا عنازہ کی مسکور کن آواز

اس کے دل کے تار ہل رہی تھی۔

”آج کیسے یاد کر لیا آپ نے، ورنہ تو آپ نے ہمیں ڈس پارٹ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“ شرارتی لہجے میں بولا۔

”یہ کہنے کے لئے یاد کیا ہے کہ اگر آپ نے آئندہ میرے نمبر پر کال کی تو بہت برا ہوگا۔“ وہ تو چڑھ دوڑی۔

”دیکھئے ابتداء آپ نے کی ہے میں تو اب باز آنے والوں میں سے نہیں ہوں تہیہ کر لیا ہے کہ ساری زندگی آپ کے ساتھ گزارا رہے۔“

”شٹ اپ آخری بار کہہ رہی ہوں آئندہ اس نمبر پر کال نہیں کرنا۔“ وہ موبائل آف کر چکی تھی مگر وہ کہاں باز آنے والوں میں تھا وہ تقریباً روزانہ ایسے دو تین مرتبہ کال کرتا تھا مگر وہ رسیو نہیں کرتی تھی، وہ یہ سب صرف اسے تنگ کرنے کے لئے کرتا تھا۔

”مسز عنازہ شازل تم نے مجھے سمجھا کیا ہے کوئی ٹین اٹیج لاگا، دیکھنا کیسے تمہیں میں سیدھا کرتا ہوں۔“ وہ سوچتا ہوا اندر آ گیا تھا۔

اتنے میں باسل اور سمیل بھی آگئے تو گھر میں کچھ پچھل چکی شازل اپنے کمرے میں چلا گیا تھا وہ دونوں ہال کمرے میں بی بی وی لگا کے بیٹھے ہوئے تھے۔

”امی انکل سے آپ نے رخصتی کی ڈیٹ لے لی۔“ سمیل کو تو اتنی جلدی تھی کہ عنازہ فوراً یہاں آجائے۔

”ہاں کی ہے میں نے بات، انشا اللہ عید کے بعد رخصت کروالیں گے ہم اسے۔“ یہ سن کر وہ دونوں خوشی سے دھمال ڈالنے لگے۔

☆☆☆

اختر علی کے کہنے پر وہ بددلی سے شازل کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوئی مگر ملیر کو تو اس نے ویسے بھی خوب سنائی تھی اور بخ اور فان کل

کے کنٹراسٹ کاٹن کے ریشم کی کڑھائی کے سوٹ میں تیار وہ سادگی میں بھی بہت پیاری لگ رہی تھی شازل نے تین بجے اسے یک کرتا تھا عنازہ کا دل الگ دھک دھک کر رہا تھا اور کچھ برا بھی ہو رہا تھا شازل کی فون پر گنگنکو کی وجہ سے تین بجے وہ آگیا تھا مگر اتنی جگت میں تھا کہ دو گھڑی بھی نہ بیٹھا عنازہ جھجکتی ہوئی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر خاموشی سے بیٹھ گئی شازل بڑی خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا بیک سیٹ پر آف وائٹ شرٹ میں ڈیٹنٹ سا لگ رہا تھا۔

”بیڈ روم کا فرنیچر میں چاہ رہا تھا کہ آپ اپنی مرضی سے لیں۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

”جب سارے کام اپنی مرضی سے کیے ہیں تو اس کا بھی کیوں تردد کیا۔“ طنز سے باز نہ آئی شازل نے نگاہ تر جمی کی اور اس کا تپا ہوا چہرہ دیکھا۔

”آخر آپ مجھ سے اتنا ناراض کیوں رہتی ہیں۔“ گاڑی وہ سائیڈ پر روک کے اس سے باز پرس پر اتر آیا عنازہ گڑبڑا سی گئی۔

”مجھے شادی ہی نہیں کرنی تھی۔“

”مجھ سے نہیں کرنی تھی یا کسی اور سے کرنی تھی۔“ اس نے جان بوجھ کے بات کو دوسرا رنگ دیا اسی وقت چونک کر عنازہ نے دیکھا۔

”مجھے آپ سے ہی نہیں کسی سے بھی نہیں کرنی تھیں۔“ زور دے کے جتایا۔

”لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کسی اور کو پسند کرتی ہیں اور میں تو بے خبری میں مارا گیا تا کہ کم آپ مجھے تو بتا دیتی۔“ وہ لہجے میں سنجیدگی اور ناگواری لئے گویا ہوا عنازہ تو شٹاپ ہی گئی، یہ تو لینے کے دینے پڑھ گئے تھے۔

”آپ کیا الٹی بات کر رہے ہیں؟“

کا قائل ہوں کیونکہ مجھے دو غلے لوگ سخت برے لگتے ہیں بھی آپ۔“

”میں کسی کو بھی پسند نہیں کرتی۔“ وہ روہانی ہو گئی۔

”میں نہیں مان سکتا کیونکہ آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے میں تو تمام تر سچے جذبوں سمیت آپ کو چاہا تھا مگر میں آپ کے غصہ اور گریز کی وجہ شرم سمجھا مگر یہ تو مجھے اب علم ہوا ہے کہ آپ کسی اور کو پسند کرتی ہیں۔“ وہ الٹا اسے ہی پھنسا رہا تھا عنازہ کے چہرے کے تو رنگ ہی اڑنے لگے کیونکہ وہ اتنا سنجیدہ اور غصہ میں نظر آ رہا تھا کہ عنازہ کی تو حالت خراب ہوئے گی۔

”میں کسی کو بھی پسند نہیں کرتی ہوں میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

”اب آپ چاہے کتنے سچ بولتی رہیں لیکن مجھے آپ کی کسی بھی بات پر یقین نہیں ہے اور نہ آئے گا۔“ گاڑی اس نے پھر سے اسٹارٹ کی۔

”مجھے گھر چھوڑ دیں نہیں جانا مجھے آپ کے ساتھ کہیں بھی۔“

”میں پاگل نہیں ہوں اور نہ ہی بے وقوف ہوں کے ہر بات آپ کی مانو جس کام کے لئے آپ کو لایا ہوں وہ تو کرنا ہی ہے نا۔“ معنی خیزی سے سخت لہجے میں بولا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے آپ کے ساتھ شاپنگ کرنے کا سنا آپ نے۔“ شازل نے بس ایک اچھٹی نگاہ عنازہ کے غصے سے تنے چہرے پر ڈالی اسے ترس بھی آیا مگر وہ کچھ تو سبق دینا ہی چاہتا تھا جو اس کے سچے اور محبت بھرے دل کو نظر انداز کر رہی تھی۔

”میری امی کو تو آپ نے اپنی جالا کی سے پھنسا لیا ہے ان کا آڈر ہے کہ ساری گھر کی تزئین و آرائش ان کی بہو کی پسند سے ہو۔“

”بس بہت ہو گئی ہے کتنی میری تضحیک

کریں گے آپ کو اختیارات مل گئے جب ہی
رشتہ کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“ بھرائی ہوئی آواز
نکلی۔

”اب دیکھئے گا آگے آگے میں اس رشتہ کا
اور کتنا فائدہ اٹھاتا ہوں مرزا شازل احمد۔“ اس
کے ایک ایک لفظ میں استحقاق و رعب تھا عنائزہ
پینے لب پہنچ لئے جیسے کچھ نہ بولنے کی قسم کھائی
تھی۔

گاڑی وہ تیزی سے دوڑاتا شاپنگ سینٹرل
میں آ گیا اپنی پسند سے ساری شاپنگ کرائی
عنائزہ اس کے ساتھ میکا کی انداز میں چلتی رہی
تھی، فریجپر کی مارکیٹ میں بھی وہ خود ہی فریجپر
پسند کر رہا تھا مگر رائے اس کی بھی لے رہا تھا۔

”مجھ سے کیا پوچھتے ہیں ادھر بھی اپنی
چلیے۔“ تب کے گویا ہوئی، شازل کے ہونٹوں
پر ہنس مہمسی مسکراہٹ در آئی مگر شازل کو اسے تنگ
نہ کرنے میں مزہ آنے لگا تھارات کو نو بجے وہ اس
کے گھر پہ چھوڑ کر جا رہا تھا جیسے ہی وہ گاڑی سے
اتری وہ نور ابولا۔

”سنئے جسے پسند کرتی ہیں اس کا نام مجھے کل
تک بتا دیجئے گا۔“ وہ یہ کہہ کر زن سے گاڑی لے
اڑا تھا عنائزہ کے توجہ میں لگتا تھا کہ جان ہی نہ
ہو وہ پتہ نہیں کسی لڑکی سمجھنے لگا تھا۔

☆☆☆

دو دن ہو گئے تھے وہ بے حد پریشان تھی کسی
کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا سمجھ بھی نکالی ہوئی
تھی تاکہ شازل کی کال ہی نہ آئے اتوار آیا تو
تینوں بہنیں صبح سے ہی آگئی تھیں مگر تینوں عنائزہ
کی خاموشی دیکھ کر منتظر سی ہو گئی تھیں ملیہ نے ہی
اس سے وجہ پوچھی۔

”دیکھا میں نے کہا تھا انہی آنتیں لگے نہ
پڑ جائیں اب بھگتو۔“ اس نے سب کچھ سچ بتا
دیا۔

”ایک تو میری جان پر بنی ہے تم اور مجھے
طعنے دے رہی ہو۔“ وہ رونے لگی۔

چاروں دوپہر کے کھانے کے بعد کمرے
میں جمع تھیں، طلعت بیگم اور اختر علی، شازل کی
طرف گئے ہوئے تھے کیونکہ اس کی امی کی طبیعت
خراب تھی۔

”آپنی مجھے یہ بھی ڈر لگ رہا ہے کہ اگر
شازل کو پتہ چل گیا کہ میں ہی سوڑا ہوں
تو؟؟؟“

”اچھا ہے پتہ چل جائے تمہاری عقل تب
ہی ٹھکانے لگے گی آخر تم نے انہیں سمجھ کیا رکھا
ہے۔“ ملیہ کو تو عنائزہ کی حرکتوں پر پہلے ہی غصہ
تھا۔

”کیا تم دونوں بحث میں لگ گئی ہو۔“ مازہ
نے دونوں کو ہی سرزنش کی۔

ملیہ اپنی بیٹی کو دیکھنے کے بہانے کمرے
سے نکل گئی شازل کو بھی تو خبر دینی تھی کہ عنائزہ
کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے لیکن فون سیٹ
لئے وہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

”شازل بھائی آپ کی ایک دوز نے کام
کیا ہے لڑکی لائن پر آگئی ہے۔“ ملیہ کو خوشی تھی کہ
عنائزہ شازل کی شرافت اور خودداری کی قائل ہو
گئی تھی۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ آج انکل آنٹی کہیں
کوئی شکایت تو لے کر نہیں آگئے میری کہ میں نے
عنائزہ سے مس بیہو کیا۔“

”امی، ابو اس معاملے سے لاعلم ہیں اور
ہاں آئی اور جو کو بھی نہیں پتہ ہے میں نے آپ کو
جیت کی خوشی سنانے کے لئے فون کیا تھا۔“

”شکر یہ ملیہ تمہارا تم نے میرا ساتھ دیا ہے
رخصتی ہو جائے اس کے بعد زبردست سی پارٹی وہ
بھی ولیمہ کے علاوہ کچی ہے۔“ وہ بھی بہت خوش
تھا کہ عنائزہ کے دل میں کم از کم اس کے لئے بھی

منجائش تھی اور باقی کی منجائش وہ بعد میں پیدا کر
لے گا، عنائزہ کچھ بے اعتبار سی تھی کیونکہ جو کچھ
اس کے ساتھ ہو چکا تھا وہ سب اسے ایسا کرنے
پر مجبور کر رہا تھا، لیکن شازل کو یقین تھا کہ وہ بہت
جلد اس کے دل میں اپنا اعتبار قائم کر لے گا۔

☆☆☆

رمضان عبادتوں میں گزر رہا تھا مگر عنائزہ
کی عبادتوں میں اور بھی شدت آگئی تھی تہجد کے
وقت آٹھ کبھی وہ خوب رو رو کے دعا مانگتی تھی کہ
اس سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے وہ معاف کر دے
اور شازل کا دل اس کی محبت سے بھر دے جو کل
تک اس سے چڑتی تھی شادی کے نام پر غصہ آتا
تھا آج وہی اپنی اس شادی کو بچا رہی تھی کہ وہ
ٹوٹ نہ جائے وہ شازل کے سچے جذبوں سے
بھی واقف ہو گئی تھی کہ اس دن شاپنگ کرنے جا
رہی تھی تو کسے گاڑی میں بیٹھ کر اپنی محبت و
پسندیدگی عیاں کر گیا تھا لنتی ندامت ہوئی تھی خود
پر غصہ بھی آیا تھا۔

جمعہ کے دن افطار پر ابو نے سب کو ہی بلایا
تھا عنائزہ کچن میں مصروف تھی تینوں بہنیں بھی آئی
ہوئی تھیں گھر میں ایک رونق سی لگ گئی تھی۔

”بھابھی صاحبہ کیا کیا بنا لیا ہے۔“ سمیل
کچن میں چلا آیا عنائزہ اچھل ہی گئی ذہن تو اس کا
کہیں اور ہی تھا۔

”اوہ آپ تو ڈر گئیں۔“ وہ مسکرایا۔
”تم اور تمہارے بھائی دونوں سے مجھے ڈر
ہی لگنے لگا ہے۔“ وہ سارے برتن سیٹ کر کے
کاؤنٹر پر رکھ رہی تھی۔

”میرے بھائی تو اتنے سیدھے ہیں کہ کیا
بتاؤں۔“

”سمیل ایسا کر دیتا ہی دو۔“ فائزہ آپنی نے
سنا تو وہ بھی مسکرا کے بولیں۔
”اگر میں نہ بھی بتاؤں تو ان کی سادگی اور

شرافت تو خود بولتی ہے اب یہی دیکھئے کب سے
بھائی جان ڈرائنگ روم میں انکل سے باتیں کر
رہے ہیں مگر چاہئے کے باوجود بھی ایک بار باہر
نکل کے کہیں آئے کہ عنائزہ بھابھی کو ایک نظر
دیکھ ہی لیں۔“

”بس کرو یہ شرافت نامہ۔“ عنائزہ نے
گھورا۔

”آزمائش شرط ہے مگر اس کے لئے آپ کو
آزمانا پڑے گا۔“

”میں نے تو یہ کی انہیں آزمانے کی چلو تم
باہر اذان میں کچھ ہی ٹائم ہے۔“ عنائزہ کو وقت
گزرنے کا احساس ہوا تو سمیل کو کچن سے باہر
نکالا، جلدی جلدی دسترخوان برآمدے میں ہی
لگایا خاصا اہتمام کیا تھا افطار پر چٹاڑل سر جھکائے
اسکاٹی بیلو کاشن کے کلف زدہ میض شلوار میں
چارمنگ لگ رہا تھا سب ساتھ ہی افطار کے لئے
بیٹھے تھے عنائزہ کو شازل کی امی نے اپنے ساتھ
بٹھایا تھا شازل بھولے سے بھی اس پر نگاہ نہیں
ڈال رہا تھا افطار کے بعد نماز وغیرہ پڑھی تھی
رات کا کھانا لگنے تک عنائزہ پھر شازل کے
سامنے نہیں آئی تھی، اندر ہی اندر وہ شازل کی
خاموشی پر پریشان تھی۔

رمضان لگتا تھا اس بار بڑی تیزی سے گزرا
تھا کہ عید آئی اور اسے پتہ تک نہ چلا پھر اس کی
رخصتی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں، تینوں بہنیں آئی
رہتی تھیں اپنے بھی کہتی تھیں لیکن یہ عید تو اسے اور
اداس کر گئی کیونکہ عید پر بھی وہ صرف لگتا تھا
مارے باندھے آیا ہے۔

☆☆☆

ادھر عنائزہ نے ضد باندھ لی کہ اسے جہیز
دے میں کوئی کمی نہ کی جائے کیونکہ شازل نے
منع کر دیا تھا کہ کچھ نہیں چاہیے پھر وہ بعد میں
ایسے طعنے نہیں سننا چاہتی تھی کہ میکے سے اسے کچھ

نہیں ملا ہے تینوں بہنیں سمجھا سمجھا کے ننگ آچکی تھیں۔
”تمہیں شادی پر ابو نے دینے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی اس پر بھی تمہاری ساس نے کتنی باتیں بنائی تھیں بھول رہی ہو تم۔“ وہ تالیف سے الجھ ہی پڑی۔

”میری ساس میں اور تمہاری ساس میں بہت فرق ہے ان کی ایسی سوچیں نہیں ہیں وہ تو چاہتیں ہیں کہ تم جلدی ان کے گھر آؤ اور گھر کو سنبھالو جو تمہارا ہے۔“

”میں نے ابو سے کہہ دیا ہے کہ ہر چیز ہونی چاہیے بعد میں تمہیں نہیں پتہ یہ شازل صاحب کب بدل جائیں اور مجھے جانتے رہیں۔“ اپنی وارڈروب کی وہ صفائی کر رہی تھی۔

”شازل بھائی کو تم کب سمجھو گی کہ وہ کس پنجر کے ہیں کیونکہ میں یا کوئی اور بھی تمہیں یقین دلائے گا کہ وہ ایسے نہیں ہیں ویسے تم اس کی مانو گی تھوڑی۔“ بیڈ پر اس کے پڑے کپڑوں کی تہہ بنانے لگی۔

ادھر شازل کی امی نے عنانزہ کی بری میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی اسعد اور اس کی بیوی مریم آ جاتے تھے دو ماہ کی ان کی بیٹی بھی پھر مریم شازل کی شادی کی تیاریوں میں وقت نکال کے آ ہی جاتی تھی۔

☆☆☆

”بقر عید کا بھی چاند نظر آیا بھی چھ دن ہو گے ہیں آج سے ایک ہفتے بعد تمہاری شادی ہے۔“ امی حساب کتاب لگا کے پیشی ہوئی تھیں ان کی شدید خواہش تھی کہ بقر عید پر ان کی بہو ان کے ساتھ ہو۔

”ولیمہ میں نے عید کے دو دن بعد کا رکھا ہے کیونکہ قربانی وغیرہ کی وجہ سے کافی ٹھکن ہو جائے گی مہمانوں کا بھی آنا جانا ہو گا۔“ شازل

نے پروگرام بتایا۔

”آج تم اسعد اور مریم کو بلا لو تا کہ ساری بری کی پینک مریم دیکھ لے گی تو پرسوں تو عنانزہ یاپوں بیٹھے گی تو بری بھی ساتھ چلی جائے گی کوئی کمی پیشی ہو گی تو مریم بتا دو دے گی۔“ وہ خاصی تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

”میں فون کر دوں گا یہ باسل اور سمیل کدھر ہیں۔“ رات کے اس پہر جبکہ دس بج رہے ہیں خاموشی شازل کو اچنبھے میں مبتلا کر گئی۔
”سمیل تو اوپر ہے پڑھ رہا ہے سمسٹر ہونے والے ہیں نا اور باسل کسی دوست کی طرف گیا ہے۔“

”امی باسل کو کہہ دیا کریں کہ بارہ بجے سے پہلے گھر آ جایا کرے۔“ وہ انہیں یاد دلانے لگا اسے خود بھی رات کو دیر تک باہر رہنا بھی پسند نہ تھا پھر اٹھ کر وہ اپنے کمرے میں وہ آ گیا تھا بڑا سا کشادہ جدید انداز میں ڈیکوریت کیا ہوا تھا درمیان میں جہازی سائز بیڈ دروازے کھڑکیوں پر دبیز مہرون اور فان کلر کے کنفراسٹ پردے والے ٹوال کارپٹ جدید ڈیزائن ٹیبل جو کہ بیڈ کی رائٹ سائڈ پر بھی ایک کونے میں صوفے وغیرہ سیٹ کئے ہوئے تھے سارا کچھ اس نے عنانزہ کی پسند سے ہی لیا تھا، وہ آنکھیں بند کر کے اس کی موجودگی کو محسوس کرنے لگا۔

شادی میں دو دن رہ گئے تھے وہ مایوں کے زرد گونا کناری کے سوٹ میں خود بھی روٹی ہوئی سرسوں لگ رہی تھی ماں، باپ کا آئین چھوٹنے کی اور پھر شازل کو فیس کرنے کی بھی ٹینشن بھی تھیں ہر وقت لبوں پر یہی دعا رہتی تھی کہ شازل اسے معاف کر دے اس نے انجانے میں جو اس کے ساتھ حرکت کی ہے، اس نے یہ سوچ بھی لیا تھا کہ اسے نئے رشتے کی بنیاد جھوٹ سے نہیں رکھے گی بلکہ شازل کو ساری حقیقت بتا دے گی

چاہے وہ اسے کتنا برا بھلا کہے، شازل کے گھر سے اس کی مہندی اور بری آچلی تھی گھر میں ایک رونق سی لگی ہوئی تھی اپنے کمرے میں وہ کم صم سی پیشی باہر سے آئی آوازوں کو بھی سن رہی تھی۔

”مایوں کے کپڑوں میں آپ تو بہت پیاری لگ رہی ہیں شادی والے دن تو شازل بھائی حواس ہی کھودیں گے۔“ مریم نے شرارت میں کہا عنانزہ نے چھینپ کر سر اور نیچے جھکا لیا۔
”ہماری بھابھی اتنی ڈراؤنی تو نہیں ہوگی شادی والے ان کے بھائی جان حواس کھودیں۔“ سمیل دائیں کرتا شلوار میں ملبوس ہاتھ میں کیمرو لئے اندر ہی آ گیا۔

”بھابھی جی چہرہ تو دیکھائیے۔“ وہ شوخ و شرارتی لہجہ میں بولتا اس کے سامنے آ گیا۔

”سمیل یہ تو اچھی بات نہیں ہے تم اندر کیسے آئے۔“ عنانزہ نے اسے ٹھکی سے ہی کہا مکر وہ بیڈ پر بالکل عنانزہ کے سامنے بیٹھا تھا۔

”میں دروازے سے اندر آیا ہوں اور تصویریں کھینچ کے ہی جاؤں گا۔“ وہ اڑیل وضدی تو پہلے ہی تھا ایک بات کے پیچھے پڑ جائے کر کے چھوڑتا۔

”ہاں سمیل تم کچھ نچو میں خود تمہیں بلانے والی تھی۔“ مریم نے اس کی پشت پر ہلکی دی۔

”تمہیں تو بعد میں بتاؤ گی۔“ سرکشی میں اس نے سمیل سے کہا۔

بچوں کی شور و پکار میں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کون کیا بول رہا ہے عنانزہ کو شازل کی امی نے خوب دعائیں دی تھیں اور ڈھیروں پیار کیا رات کو جب سب فارغ ہو کہ سونے کے لئے لیٹے تو وہ ملیحہ سے بولی۔

”ملیحہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ ملیحہ کو اس کی صورت پر ترس بھی آ رہا تھا کہ حقیقت بتا دے کہ شازل کو پہلے ہی خبر ہے شازل نے تو سختی سے

منع کیا تھا کہ ذرا بھی اشارہ نہیں دینا۔
”کس بات سے؟“ وہ مسکرائی۔
”تمہیں نہیں پتا؟“ وہ باقاعدہ رونے والی ہو گئی۔

”آئی اسے آپ ہی سمجھائیے۔“ ملیحہ اکتا کر اندر آئی فائزہ سے کہا جو کچن سمیٹ کے اندر آئی تھی۔

”پہلے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کچھ نہیں ہو گا شازل سمجھ دار ہے، خدا را اب وہاں جا کے کوئی بے وقوفی نہیں کرنا۔“ ملیحہ اسے بدبرانہ انداز میں سمجھایا وہ سر جھکائے سستی رہی تھی۔

”اور پھر جہاں اتنے پیار کرنے والے اور محبت کرنے والے لوگ ہوں تو کوئی فکر کی بات اور پریشانی کی بات ہی نہیں ہے تم اپنا رویہ اچھا رکھنا شازل کا دل جیتنے کی کوشش کرنا، تم نے سمجھ داری سے حوصلہ و ہمت سے کام لیا تو ایک کامیاب زندگی گزارو گی۔“

”پھر بھی ملیحہ میں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔“ ندامت زدہ رہ کے ہو رہی تھی شازل کے سچے جذبوں کی ناقدری کر رہی تھی۔

”تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو چلو یہ تو اچھی بات ہے تم اب فکر نہ کرو اور اسے آپ کو فریش رکھو۔“ اسے گلے سے لگالیا ملیحہ جانتی تھی وہ بچپن سے ہی حساس تھی ہر بات کو گہرائی سے محسوس کرتی تھی۔

☆☆☆

بقر عید آ رہی تھی تو بازاروں میں بھی رونق بڑھ گئی تھی شازل نے بھی قربانی کے لئے گائے اور دو بکرے لئے تھے انہیں پوربچ میں باندھا گیا تھا باسل اور سمیل کی ذمہ داری تھی کہ انہیں چارہ وغیرہ وقت پر دیں۔

”کیا ہے بھائی جان اپنی شادی کے

دوسرے دن لے آئے ان کو بھی۔“ سمیل خاصا بھنایا ہوا تھا کیونکہ مسلسل صفائی بھی اسے ہی کرنی پڑ رہی تھی۔

”شادی کے تیسرے دن بقر عید ہے اور دوسرے دن تم لوگوں کو ہوش ہوگا کوئی۔“ امی نے ڈائمنڈ نیبل پر لکھانا شروع کر دیا تھا، مریم کو انہوں نے پہلے سے ہی رہنے بلا لیا تھا تاکہ کچھ ان کی مدد بھی کر سکے۔

”یار شازل تم نے اپنی شادی عید کے قریب غلط رکھی ہے۔“ اسعد نے مسکراتے ہوئے کہا وہ چیز کھکا کے بیٹھ رہا تھا گرے میض شلوار میں ہلکی بوھی ہوئی شیوا سے اور سوہرا اور ڈیمنٹ بنارہی تھی۔

”اچھی بات ہے دو قربانیاں ہو رہی ہیں ناں ایک میری دوسری جانوروں کی۔“ اس نے شوحی سے کہا امی نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”خیر کا کلمہ نکالا کرو ساتھ حیرت کے تمہاری شادی ہو۔“

”دیکھو بارات زیادہ لیٹ نہیں کرنی، وقت پر پہنچنا ہے تمہیں تاکہ جلدی فارغ ہو جائیں۔“ امی نے سب کو ہی یاد دلایا۔

”ہم تو جلدی تیار ہو جائیں گے بھائی جان کی تیاریاں کچھ خاص قسم کی ہوں گی ان سے ہی کہیے۔“ باسل کو شرارت سوچھی تھی سب ہی مسکرا دیے۔

مہمانوں کو بھی جلد آنے کی تاکید کی تھی مغرب ہوتے ہی امی نے تو شور مچا دیا تھا کہ شازل ہال کمرے میں آ جائے، مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام باہر لان میں تھا، شازل آف وائٹ شیروانی میں شہزادہ ہی لگ رہا تھا باسل اور سمیل نے لپک کے اسے گلے لگایا تھا امی نے جھٹ نظر اتاری تھی، بارات دس بجے تک میرج گارڈن روانہ ہوئی تھی بارات کا استقبال اختر علی

نے پر تپاک انداز میں کیا تھا۔

عنازہ ڈیپ ریڈ کلر کے لہنگے میں طلائی جیولری اور میک اپ میں بڑی خوبصورت لگ رہی تھی شازل کی نگاہوں نے اس کے منگنی حسین کو ایک نظر دیکھا، اس کی آج چھب، ہانڑالی تھی اس کے وجود سے گزرتے اور پر فیوم کی جھین جھین مسکور کن مہک شازل پر عجیب سرو طاری کر رہی تھی پورا وقت وہ اسی کے نصائر میں رہا مودی تصویر ڈنر سب سے فارغ ہونے کے بعد رخصتی کا شور ہوا تھا۔

عنازہ کو لگ رہا تھا کہ وہ آج مکمل طور پر کسی اور کی ہو گئی ہے دل کی دھڑکنوں کا شوکانوں میں گونج رہا تھا، ماں باپ اور بہنوں کی دعاؤں کے سائے تلے وہ رخصت ہو کر شازل کے گھر آ گئی، اسے ہال کمرے میں بڑے صوفے پر بیٹھا دیا تھا ایک نگاہ ترچھی کر کے گھر ضرور دیکھا جو اتنا خوبصورت تھا کہ عنازہ کو خود پر رشک ہی آیا کہ وہ اس گھر کی فرد ہے اب۔

”یار سمیل! گائے اور بکرے شور کر رہے ہیں انہیں چارہ وغیرہ دیا۔“ اسعد کو کب سے ان کی آوازیں آرہی تھیں۔

”وہ بھائی کے گھر آنے کی خوشی میں شور کر رہے ہیں۔“ باسل نے قہقہہ لگایا امی بھی ہنسنے لگیں جبکہ شازل مہمانوں کو رخصت کر کے گلاس ڈور کھول کے اندر آچکا تھا عنازہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”باسل جانوروں کو پانی پلاؤ اور چارہ وغیرہ ڈالو کچھ بھی نہیں ہے۔“ شازل نے فوراً یاد دلایا۔ ”سامنے ان کی دلہن بیٹھی ہے انہیں گائے بکروں کی فکر ہے۔“ باسل نے بے ساختگی سے کہا شازل جھینپ گیا اور باسل کے سر پر چپٹ لگائی، اسعد نے ناظم دیکھا دونے گئے تھے۔ مریم عنازہ کو لے کر کمرے میں جا رہی تھی

باسل اور سمیل پورچ چلے گئے تھے امی کو عشاء کی نماز اور شکرانے کے نواکل بھی ادا کرنے تھے، سو وہ بھی شازل کو کمرے میں جانے تک کہتی اٹھ گئیں اور اسعد کو بھی تاکید کی وہ لوگ بھی اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں۔

☆☆☆

وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی درمیان میں بند تھا اس پر اصلی پھولوں سے نئی تیج، ڈرائنگ نیبل میں اس کا عکس نمایاں ہو رہا تھا دروازے کے رائٹ سائیڈ پر واش روم تھا بیڈ کی لیفٹ پر بڑی بڑی گلاس وینڈو جس پر دبیز پردے پڑے تھے کمرے میں۔

نومبر کا پہلا ہفتہ تھا موسم کافی اچھا ہو گیا تھا، اسی وقت شازل ایزی سے میض شلوار میں ملبوس بھاری قدموں سے اندر آیا عنازہ نے جھپٹ نگاہ جھکالی مردل کی دھک دھک اودھم مچا رہی تھی۔

”السلام علیکم! شوح سا انداز تھا۔“

عنازہ نے سر ہلا کے جواب دیا مگر نگاہ اٹھانے کی تاب ہی نہ تھی۔

”کیسے کمرے کی سینک پسنڈ آئی یا نہیں۔“ وہ بیڈ کے قریب ہی آ گیا۔

”سب کچھ ٹھیک ہے بلکہ بہت اچھا ہے۔“ وہ سر جھکائے بس اتنا ہی بولی، شازل کی نگاہ تو اس کے حنائی خروٹی ہاتھوں پر ٹپک گئی تھی پھر نگاہ نے کچھ اور سفر کیا تو چہرہ پر اس ہلا کی معصومیت نظر آئی کہ وہ اس کے پہلو میں ہی نیم دراز ہو گیا عنازہ لب بھیج کر رہ گئی۔

”آپ نے ابھی تک نگاہ تک تو اٹھائی نہیں ہے سب کچھ ٹھیک کہاں سے ہو گیا اور اچھا کہاں سے لگ رہا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”جیسے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ ڈرتے ڈرتے وہ گویا ہوئی، شازل کی بات اس نے نظر انداز ہی کر دی تھی۔

”مجھے پتہ ہے کیا کہنا چاہتی ہوں۔“ نورانی ٹریک بدلا۔

عنازہ نے چونک کر دیکھا کہ وہ سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا تھا وہ اس کے بغور دیکھنے پر چہرے پر پھونک مار کے بولا۔

”اب اتنا بھی خوبصورت نہیں ہوں محترمہ گھورے جا رہی ہیں۔“

”جی وہ تو میں.....“ وہ شرم سے سرخ ہی پڑ گئی۔

”دیکھو عنازہ میں سب کچھ جانتا ہوں تم سویرا بن کے کال کرتی تھیں۔“

”کیا؟“ وہ تو حیرت زدہ رہ گئی۔

”آپ سب جانتے تھے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔“ وہ خود کوند امت کی عین گہرائیوں میں گرتا

ہوا محسوس کر رہی تھی شازل اسے وارنٹی اور پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”اس لئے کچھ نہیں بولا کہ لڑکیوں کی عقل کا خانہ خالی ہوتا ہے انہیں لاکھ کوئی کچھ بھی سمجھائے وہ سنتی ہی نہیں ہیں وہ کرتی اپنے من کی ہی ہیں اس لئے سوچا کہ کچھ آپ ہمیں چیک کر رہی ہیں تو ہم بھی بے وقوف بن کے مزے لے لیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بول رہا تھا اور عنائزہ کی تو نگاہ ہی نہیں اٹھ رہی تھی۔

”آپ کو ذرا بھی مجھ پر غصہ نہیں آیا۔“ حیرت و انبساط میں ڈوب کے وہ گویا ہوئی۔
”بالکل بھی نہیں آیا بلکہ پیار آ رہا ہے اجازت ہو تو کر لوں۔“ لہجے میں شرارت سموائے اس کے قریب جھکا تو عنائزہ حواس باختہ سی ہو گئی۔

”وہ میرے نزدیک آتے آتے حیا سے ایک دن سمٹ گئے۔“ شوخی سے گنگنایا تو کانوں کی لوؤں تک سے سرخ ہو گئی۔

”عنائزہ میں نے آج تک نہ کسی کو اس نظر سے دیکھا اور نہ ہی سوچا، تم وہ واحد لڑکی ہو جسے دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ یہ لڑکی جو بناوٹ و تصنع سے پاک ہے جس کا اندر تک اجلا ہے جو نا صرف صاف گو ہے بلکہ عادات بھی اس کی بڑی پیاری ہیں تو کیوں نہ اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیا جائے جس نے شازل احمد کو اپنی سادگی اور معصومیت سے جیت لیا ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔

”تو پھر فون پر بے وقوف کیوں بناتے رہے اگر جان گئے تھے تو۔“ شکوہ پھیلا۔

”بلجی نے کہا تھا کہ آپ نے کچھ نہیں بتانا عنائزہ کو اپنی تسلی کر لینے دیں۔“
”کیا؟ بلجی ملی ہوئی تھی آپ سے؟“ سن

کے غصہ ہی آیا مگر پھر اس نے شکر بھی کیا کہ اچھا ہوا جو اس نے بتا دیا ورنہ تو آج پتویشن اور ہوتی۔

”جی وہ میری اور آپ کی ہمدرد تھی۔“ اس نے چوڑیوں سے بھری کلائیوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑا۔

”اب ساری باتیں اور شکایتیں ختم کر دو اور جلدی سے محبت کا اقرار کرو۔“

”جی جی۔“ وہ تو اچھل ہی گئی حیرانگی سے آنکھیں پھیل گئیں۔

”جی جناب اب باری آپ کی ہے۔“ وہ ہنسا تو عنائزہ نے حلقے سے گھورا، تجس پر شوخیاں سوار ہو رہی تھیں اور وہ اطمینان سے مسکرا دی۔

☆☆☆

اگلے دن عنائزہ کو تینوں بہنیں لینے آئی تھیں ولیمہ ان کا بقرہ عید کے تیسرے دن تھا اس لئے سب اطمینان سے بھی تھے رات کو شازل اسے واپس گھر لینے آیا پر مل کپڑوں میں وہ بھی سنویری سیدھی شازل کے دل کے تاروں کو ہلا گئی تھی دوسرے دن عید تھی، عنائزہ کو سب کچھ نیا اور کتنا اچھا لگ رہا تھا اگلی صبح اٹھتے ہی اس نے کچن سنہال لیا تھا امی نے منع بھی کیا تھا۔

”آئی اب یہ سب میری ذمہ داری ہے۔“ اس نے امی کو شانوں سے پکڑا اور باہر ہال کمرے میں لا کر بیٹھا دیا تھا شوکنگ پنک کپڑوں میں وہ خاصی دلکش لگ رہی تھی، امی کی بلائیں لیتے نگاہیں تھک رہی تھیں۔

”کل ہی تم رخصت ہو کر آئی ہو ولیمہ بھی نہیں ہوا ہے۔“ وہ شرمندہ ہونے لگی تھیں کہ عنائزہ کو کام کرنا پڑ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہوتا رہے گا آپ بس یہ کریں کہ دیکھیں کہ قربانی ہو گئی ہے تو میں سالن

وغیرہ بنانے کی تیاری کر لوں۔“ وہ کینٹ کھول کر سارے مصاحفوں کے ڈبے باہر نکال کر کاؤنٹر پر رکھنے لگی تھی جب اسے سب سنہالنا ہے تو آج ہی سے ابتداء کیوں نہ کر دے۔

”آخا، آج تو ہماری بھابھی کے تصرف میں آ گیا ہے کچن ضرور مزے دار سا کچھ کھانے کو ملے گا۔“ سمیل گوشت وغیرہ لے کر اندر آیا تھا۔

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا پڑی اور اس کی فرمائشیں نوٹ کرنے لگی، تھوڑی دیر تک گھر سے امی ابو اور تینوں بہنیں اپنے اپنے شوہروں سمیت آ گئے تھے ایک روٹی ہی لگ گئی تھی پورا دن باسل اور سمیل نے گوشت پانٹنے میں گزارا تھا رات کو دس بجے جا کے سب کو کچھ فراغت ملی بارش ہو جانے کی وجہ سے موسم بھی سرد ہو گیا تھا لیکن عید کی وجہ سے ابھی کچھ باہر گھما بھی ہی تھی۔

”میری بھو کا ابھی ولیمہ بھی نہیں ہوا ہے اسے کام کرنا پڑ گیا۔“ امی کو شرمندگی سی ہونے لگی مگر عنائزہ نے مسکرا کے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔

”کس کتاب میں لکھا ہے کہ ولیمہ سے پہلے داہن کچن نہیں سنہال سکتی ہے۔“ شازل نے اس کے پر اعتماد اور جھکتے چہرے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا جو کتنی مطمئن ہو گئی تھی اس کی ہر امی میں کہ اس نے یہاں کی ہر چیز کو ابھی سے سمجھنا شروع کر دیا تھا نئی داہنوں کی طرح کوئی نازخہ نہ دیکھا تھا۔

”آپ کی شادی اور عید مفرد ہی رہے گی۔“ سمیل نے شوخی سے کہا۔

”کیونکہ ہماری بھابھی ہیں ہی مفرد سی۔“ باسل نے تائید کی۔

سب لوگ رات کے کھانے کے بعد چلے گئے تو عنائزہ نے کچن سمیٹا باسل اور سمیل سارا دن کے تھکے تھے اسے اپنے کمروں میں چلے گئے

تھے، فارغ ہو کر وہ بھی اپنے کمرے میں چلی آئی، جس وقت کمرے میں آئی شازل منتظر نگاہوں سے بیڈ پر نیم دراز تھا، عنائزہ پر مل کپڑوں اور لائٹ سے میک اپ میں تھکی تھکی بھی نظر آئی تھی دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا تھا۔

”وہ آپ کے دوست اسعد نہیں آئے اور مریم بھابھی۔“ اسے یاد آیا تو پوچھا۔

”کمرے میں آتے ہی تم نے صرف یہی بات سوچی ہے۔“ اس نے حلقے سے پوچھا، کہ وہ تو کسی حسین جملے کا انتظار کر رہا تھا۔

”نہیں اور بھی سوچی تھی کہ آپ سونا گئے ہوں۔“ معصومیت سے بولی۔

”آج عید کا دن ہے اور گلے ملنے کا دن ہے۔“ اس پر پھر شوخی سوار ہونے لگی، عنائزہ تو بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی۔

”پھر کیا ارادہ ہے۔“ شازل نے شرارت کی، وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی، شازل نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامے اور بولا۔

”عنائزہ! میری دعا ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں اور میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں۔“ وہ ایک جذب سے بولا۔

”میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ وہ جواب بولی۔

”دینا بھی نہیں چاہیے۔“ وہ ہنسا اور عنائزہ کو اپنی محبت کے حصار میں جکڑ لیا بھی نہ جدا کرنے کے لئے وہ کتنی سادہ اور معصوم تھی کہ اسے یہ خبر ہی نہ تھی کہ کوئی اس کی سادگی پر مرعہ مٹا ہے وہ کوئی اور نہیں شازل احمد ہے، عنائزہ کو لگا کہ خوشیاں ہمیشہ کے لئے اس کے آئینن میں اتر آئیں ہیں۔

سیاہ کولتار سڑک پر ان کی گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں تھی، اپنے غصے کو کنٹرول کرتا ونگڈ سکرین پر نظریں جمائے بڑی سنجیدگی سے ڈرائیو کر رہا تھا، سفیدی مائل چہرہ غصے کی بدولت اس وقت گلابی مائل ہو رہا تھا، گہری سیاہ آنکھوں میں الجھنوں کی کئی تحریریں تھیں جو رگم تھیں۔

اس نے ایک اچھتی نظر بے حس و حرکت بیٹھی منال پر ڈالی تھی، جو مکمل بے نیازی سے بیٹھی باہر کے نظاروں میں یوں گم تھی جیسے اس سے اہم کام کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، اس کی اس بے نیازی نے فراز کو مزید تباہ ڈالا تھا، مگر وہ اس سے اپنا غصہ بھی اس پر نہیں نکال سکتا تھا، اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف جو تھا۔

ان کی شادی کی خوشی میں فراز کے بیٹھ فریڈ حسن نے اس کے کپل کو ڈنر پر انوائٹ کیا تھا اور جب یہ انوائٹیشن اس نے منال کے سامنے رکھا تو اس نے ڈنر پر جانے سے صاف انکار کر دیا، مگر وہ بھی اپنے نام کا فراز احمد تھا زبردستی کسی نہ کسی طرح اسے تیار کر کے ریسٹورنٹ لے گیا تھا جہاں حسن اور اس کی سسر پہلے سے ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، منال کی خاموشی کو فراز نے تو محسوس کیا تھا سو کیا تھا مگر حسن کی سسر سے بات کرتے ہوئے وہ جس طرح روڑ ہوئی تھی اس نے فراز کو شدید شرمندگی سے دوچار کر دیا تھا، تب ہی منال کی خرابی طبیعت کا بہانہ کرتا وہ جلد ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور گاڑی

مکمل ناول



میں بیٹھنے سے لے کر اب تک اس نے منال سے کوئی بات نہیں کی تھی، مگر وہ بھی ایک نمبر کی ڈھیت تھی فراز کے مزاج کی برہمی کا اس پر قطعی اثر نہ ہوا تھا۔

گاڑی گھر کے گیٹ کے آگے کھڑی کرتے ہی اس نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا تھا جس پر چوکیدار نے فوراً گیٹ کھول دیا تھا۔

”اتنی جلدی آگئے ہو تم لوگ۔“ نصرت جو اب تک جاگ رہی تھیں اس لئے ان کو اتنی جلدی واپس آتا دیکھ کر بولیں اور وہ جوش بد غصے سے تپا ہوا تھا ماں کو سامنے دیکھ کر خود پر کٹرول کرتا ہوا بولا۔

”جی امی! اچھو کی آفس میں بھی آج کافی کام تھا، اس لئے تھکاؤ کی وجہ سے میں نے زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ وہ رساں سے بولا، جس بے نیازی کا مظاہرہ وہ تمام راستے کرتی آتی تھی اسی بے نیازی سے وہ ان ماں بیٹے کے قریب سے گزرنی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی اور اس کی اس حرکت کو نظر انداز کرتا وہ پھر سے نصرت جہاں کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

”چلیں پھر اب ہم سب لوگ گھر آگئے ہیں، اس لئے آپ بے فکر ہو کر سو جائیے۔“ فراز نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے چوم کر کہا اور پھر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا، ابھی اسے اس سنگدل کی بھی کلاس لینی تھی جو نجانے کیوں دن بدن اتنی خود سر ہوتی جا رہی تھی۔

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا وہ باغی حسینہ شاور لینے کے بعد پنک کاٹن کا سادہ سا سوٹ پہنے واش روم سے باہر آئی تھی اور اسے دیکھتے ہی اس کے اندر پھر سے چنگاریاں سی بھرنے لگی تھیں، کوٹ صوفے پر اچھاٹا اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہ اس کی جانب بڑھا تھا اور اگلے

ہی بل ایک جھٹکے سے اس کا رخ اچانک جانب موڑا تھا اس نے۔

اس کے جھٹکے بالوں کی بے شمار لٹیں فراز کے چہرے سے ٹکرائی تھیں جن سے ٹپکتا پانی اس کے گریبان سے ہوتا ہوا سینے میں جذب ہو گیا تھا، اس قاتل ادا کے دفتر پر کھڑے پر نظر پڑتے ہی اگرچہ کہ ایک بل کو فراز کو خود پر قابو پایا مشکل ہو گیا تھا مگر اگلے ہی بل وہ سر جھٹکتا اس کے دونوں کندھے اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے بولا۔

”تم خود کو کیا سمجھتی ہو منال بیگم ہاں بولو۔“ سخت جارحانہ انداز میں اس نے پوچھا۔

”چھوڑیں مجھے۔“ تکلیف کی شدت سے اس نے بلبلاتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں جواب دو مجھے، جانتی ہو آج مجھے تمہاری وجہ سے کتنا سبکی کا احساس ہوا ہے۔“ اس کے جارحانہ تیوروں میں کی نہ ہوئی تھی۔

”تو پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے۔“ منال نے تنہی سے کہا۔

”نو..... نیور منال بیگم، تمہیں اگر چھوڑنا ہی ہوتا تو پھر اتنے جتن کر کے میں تمہیں حاصل ہی نہ کرتا اور اس بھول میں تم رہنا بھی مت کہ میں تمہیں زندگی کے کسی موڑ پر چھوڑ دوں گا۔“ انگلی اٹھا کر اسے وارن کرتا وہ قطعی پن سے بولا۔

”آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے فراز احمد کہ اسے جتن نہیں کہتے بلکہ زور زبردستی کہتے ہیں جو کہ آپ نے مجھ سمیت میری ساری فیملی کے ساتھ کیا ہے۔“ وہ بھی اپنے نام کی منال تھی جنائے بغیر نہ رہی۔

”مجھے اطلاع دینے سے پہلے اپنی معلومات میں بھی اضافہ فرما لو کہ جسے تم زبردستی دے رہی ہو وہ زبردستی نہیں بلکہ سرحدِ عقلمندی تھی۔“

فراز نے طنز سے کہا پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

”تم نے شاید سنا ہو گا کہ پھرے دریا پر بند باندھنا عقلمندی ہوتی ہے ورنہ وہ پھر دریا اتنی تباہی و بربادی لے کر آتا ہے کہ اسے کئی نسلیں یاد رکھتی ہیں اور میں نے بھی اسے پھرے دریا کے سامنے بند باندھنے کی عقلمندی کی تھی، کیونکہ میں اپنی آنے والی نسلوں کو اپنی تباہی و بربادی کی کوئی داستان سنانا نہیں چاہتا تھا۔“

”اور اب جو داستان آپ اپنے آنے والی نسلوں کو سنائیں گے وہ کیا آپ کی جرأت کی داستان ہوگی۔“ منال نے مسخر سے کہا۔

”تو اور کیا؟“ فراز نے پر زور انداز میں کہا۔

”ہاں چاہے اس جرأت کے مظاہرے میں کسی کی زندگی بھی کیوں نہ داؤ پہ لگ گئی ہو۔“ منال کے لہجے میں مسخر بدستور موجود تھا۔

”کس کی..... کس کی زندگی داؤ پر لگ گئی ہے۔“ وہ انجان بنتے ہوئے بولا، دونوں ہاتھ منال کے کندھوں پر اور نگاہیں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”میری..... میری زندگی داؤ پہ لگائی ہے فراز احمد آپ نے۔“ منال نے احتجاجاً کسمسا کر کہا، لہجے میں ہلکا سا جارحانہ پن اتر آیا تھا۔

”اودہ آئی سی۔“ فراز نے اس کے کندھوں پر سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہونٹ کیڑتے ہوئے کہا۔

”منال بیگم میں نے جو قدیم اٹھایا تھا کیا اس میں تمہاری مرضی شامل نہیں تھی۔“ بنور اس کا چہرہ چاہتے ہوئے اس نے سوال پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ اس کی جانب سے رخ موڑتے ہوئے منال نے دبے دبے لہجے میں جواب دیا تھا اور اس کے اس انداز نے فراز احمد کے دل میں ڈھیروں اطمینان بھر دیا تھا، تب ہی اس کے

کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ سے اس کا رخ اپنی جانب موڑا تھا۔

”ادھر میری آنکھوں میں دیکھ کر جواب دو۔“ ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

منال جانتی تھی کہ وہ اس کی طرف دیکھ کر بات کرنا تو دور کی بات وہ اس کی طرف دیکھ کر بات سن بھی نہیں سکتی تھی مگر پھر بھی ہمت کرتے ہوئے اس نے اس کی جانب دیکھنا چاہا تھا، گہری پر شوق بولتی نظروں سے وہ بنور اس کا ہی جائزہ لے رہا تھا، تب ہی اس نے اپنی نظروں کا زاویہ فوراً بدل ڈالا۔

”چھوڑیں مجھے فراز احمد، آپ سے ان فضول باتوں میں کوئی بھی نہیں جیت سکتا، اس لئے مہربانی کریں اور لائٹ آف کر دیں مجھے سخت نیند آرہی ہے۔“ خود سے خائف ہوتی وہ جھنجھلا کر بولی تھی اور ساتھ ہی اس کے ہاتھ جھٹکتی صوفے پر جا کر نہ صرف لیٹ گئی تھی بلکہ چادر بھی تان لی۔

”ہاں جانتا ہوں دوسروں کی نیند اڑا کر محترمہ خود بہت سکون سے سونے کی عادی ہیں۔“ فراز نے جل کر طنز کیا اور پھر ڈریسنگ روم سے کپڑے چنچ کر کے اپنے بیڈ پر آکر لیٹ گیا، کچھ دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد بھی نیند نہ آئی تو بے چینی سے اٹھ بیٹھا، اس سنگدل مجبورہ کے نرم گرم وجود کی نرمیوں کو محسوس کرنے کے لئے دل بری طرح چل رہا تھا، بے ایمانی پر دل اکسار ہا تھا اسے، مگر وہ اتنا کمزور نہ تھا اور نہ ہی نفس کے گھوڑے پر سواری اس کا شیوا تھا، اس لئے بانی کے دو گلاس پی کر تنک آکھوں پر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

رحمان احمد اور صفیہ بیگم کو خدائے بزرگ،

برتر نے دو بیٹوں سے نوازا تھا، بڑے بیٹے کا نام انہوں نے فیاض احمد اور چھوٹے بیٹے کا ریاض احمد رکھا تھا، اپنے دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت میں انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، ان کی زندگی پرسکون جھیل کی مانند گزر رہی تھی ہاں مگر صفیہ بیگم کو ایک بیٹی کی شدید خواہش تھی مگر شاید خدا کو یہ منظور ہی نہ تھا، اس لئے نہ وہ دوبارہ ماں بنیں اور نہ ہی ان کی یہ خواہش پوری ہوئی، ان کی یہ خواہش دیکھ کر اکثر رحمان احمد انہیں سمجھاتے تھے کہ۔

”جب تم ان بیٹوں کی شادیاں کر کے بہوئیں گھر میں لے آؤ گی تو وہ ہی تمہاری حقیقی بیٹیاں ہوں گی۔“ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی بہت جلد کر دی تھی، فیاض احمد نے جیسے ہی تعلیم کو خیر باد کہہ کر اپنے بابا کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کیا صفیہ بیگم نے اپنے ملے والوں میں اس کے رشتے کی بات چلا دی اور پھر جلد ہی لڑکی پسند کر کے اس کی شادی کر دی، نصرت جہاں گھر میں بہو بن کر کیا آئیں انہیں تو حقیقی معنوں میں بیٹی مل گئی، نصرت جہاں کے مزاج میں نرمی کے ساتھ ساتھ صبر و تحمل بھی تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ ساس کے دل پر راج کرنے لگیں، اوپر نیچے کے بچوں فرزا احمد، عیاض احمد اور حنا نے ان کی زندگی مکمل کر دی تھی، اسی دوران صفیہ بیگم کے چھوٹے بیٹے ریاض احمد کی بھی شادی ہو گئی تھی، ریاض احمد نے اس سلسلے میں اپنی کلاس فیلو ثریا بیگم کا نام لیا تھا جس پر صفیہ بیگم چپ ہو گئیں اور پھر ثریا بیگم کے آنے کے بعد وہ صحیح معنوں میں ہی خاموش ہو گئی تھیں، ثریا بیگم مزاج کی تیز عورت تھیں، اپنی زندگی میں وہ کسی کی دخل اندازی پسند نہ کرتی تھیں انہیں خود اپنی ذات سے مطلب تھا، کسی دوسرے کے جذبات و احساسات کا ان کے نزدیک کوئی مول نہ تھا، ان

کے گھر میں آتے ہی دونوں بھائیوں کے کاروبار الگ الگ ہو گئے تھے، گھر میں میری تیری ہونے لگی تھی، ریاض احمد کو اللہ نے صرف ایک بیٹی سے نوازا تھا جس کا نام انہوں نے منال رکھا تھا، منال کا زیادہ تر وقت چونکہ صفیہ بیگم کے پاس گزرتا تھا اس لئے اس کے مزاج اور عادات میں اس کی ماں ثریا بیگم کی چھاپ نہ تھی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا، بچے بچپن سے جوانی کی طرف قدم بڑھانے لگے تھے اور ان کے جوانی کی طرف بڑھتے قدم دیکھ کر صفیہ بیگم دل ہی دل میں بہت کچھ سوچے جا رہی تھیں، اپنے اس خاندان کو جوڑے رکھنے کی ان کی دلی خواہش تھی اور وہ جانتی تھیں کہ اس سلسلے میں وہ جو کچھ سوچ رہی تھیں اپنی اس سوچ سے اگر وہ اپنی بڑی بہو کو آگاہ کریں تو انہیں اپنے ہمدردی میں ہاں مگر چھوٹی بہو ان کے کسی بھی فیصلے کو تسلیم نہ کریں، دل ہی دل میں وہ فیصلہ کرتیں وقت کے انتظار میں خاموش ہو گئی تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پہلے منال کا میٹرک کا رزلٹ آیا اور پھر فرزا نے ایف اے میں کامیابی حاصل کی، دونوں بچوں نے چونکہ پوزیشن حاصل کی تھیں اس لئے دادی نے اپنے چہیتے پوتا پوتی کی کامیابی کی خوشی میں ایک چھوٹی سی پارٹی رکھی تھی اور پھر اس پارٹی میں ہی انہوں نے فرزا اور منال کے نکاح کی بات اپنے دونوں بچوں کے سامنے رکھ دی، ان کی بات سن کر سوائے ثریا بیگم کے باقی تمام لوگ بے حد خوش ہوئے تھے، نہیں خوش ہوئی تھی تو صرف ثریا بیگم، کیونکہ وہ اپنی بیٹی کی شادی خاندان سے باہر کرنا چاہتی تھیں مگر اب جہاں سب خوش اور مطمئن تھے وہاں ان کی دل نہ گنتی تھی، اگرچہ کہ انہوں نے بہت زور لگایا کہ نکاح کی کیا ضرورت ہے جب وقت آئے گا سب کچھ کر لیں گے ابھی مگنی کی رسم

کر لیتے ہیں مگر صفیہ بیگم نے یہ کہہ کر ان کو چپ کر دیا کہ نجائے میری اتنی زندگی ہے بھی یا نہیں میں انہیں اس بندھن میں بندھتا دیکھ لوں اور ان کی یہ بات سن کر سب ہی ان کی خوشی میں خوش ہو گئے تھے اور پھر واقعی ان کے نکاح کے کچھ عرصے بعد ہی وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا کہ اس کا نام گزرتا ہی ہے، یہ نہ کسی کے لئے کبھی ٹھہرا تھا اور نہ ٹھہرے گا، بچے اپنے تعلیمی مراحل یکسوئی سے طے کرتے رہے، ایک روڈ ایکسٹنٹ میں فیاض احمد کی ڈیڑھ ہو گئی اور گھر کی ساری ذمہ داری فرزا کے کندھوں پر آ پڑی، کچھ کاروباری دنیا سے ناواقف ہونے کی بناء پر اور کچھ منہجر کے گھیلوں کی بدولت سارا کاروبار ختم ہوتے ہوئے بالکل ہی ختم ہو گیا اور ان کے معاشی حالات ٹھوڑے سے ڈاؤن کیا ہوئے ثریا بیگم دل میں چھپی بات کرنے لگیں، چونکہ ان کی شروع سے ہی فرزا اور منال کے نکاح میں مرضی شامل نہ تھی اس لئے بھی وہ اب اپنے بہانے یہ رشتہ ختم کرنے کے لئے پر توتل رہی تھیں۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو ثریا تم، مرنے والی ہماری ساس کی یہ آخری خواہش تھی اور تم ان کی اس آخری خواہش کو تو احترام کر لو، کیا کمی ہے فرزا میں جو تم یہ رشتہ ختم کرنے کے درے ہو۔“ نصرت جہاں نے دھیمے مگر سلیجے ہوئے کلمے میں کہا، دیواری کی بات سے اگرچہ کہ انہیں بے حد دکھ ہوا تھا پھر بھی خود کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”یہ بھی آپ نے خوب کہی بھابھی اور رہ گئی فرزا میں کمی کی بات تو چلیں آپ اس میں کوئی خرابی ہی بتا دیں۔“ طنز کے تیر برساتیں ثریا بیگم بولیں۔

”ایسا تو نہ کہو ثریا، میرا بیٹا ماشا اللہ پڑھا لکھا

برسر روزگار ہے اور.....“ نصرت جہاں نے وضاحت کرنا چاہی مگر ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ثریا بیگم نے اچک لی۔

”روزگاری بھی بھابھی آپ نے خوب کہی، پرانی ملازمت کرتا ہے، جس میں مالک جب چاہیں فارغ کر دیں، پھر ایسی ملازمت کا بھروسہ بھی کیا، پھر اس کی ملازمت کو شروع ہوئے بھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، ترقی کے چانسز ابھی بہت دور بڑے ہیں۔“

”ایسا نہ کہو ثریا، وہ مالک کائنات جب عطا کرنے پر آتا ہے تو دیر نہیں کرتا، جہاں اس رب نے اس ملازمت کا وسیلہ بنایا ہے وہاں وہ اس کی ترقی کی راہیں بھی نکال دے گا، بس نیت صاف اور عزم پختہ ہونا چاہیے۔“ نصرت جہاں نے پختہ یقین اور بڑے اعتقاد سے کہا۔

”پھر بھی بھابھی ہے تو ملازمت ہی نا، میرے بھتیجے کو دیکھو، ماشا اللہ اپنا کاروبار ہے، کروڑ پتی ہے کروڑ پتی، یہ نوکر چاکر، یہ عیش ہیں۔“ ان کے دل کی باتیں زبان تک آتے آتے بالآخر وہ بات بھی زبان پر آئی گئی کہ جس کی بدولت وہ اپنی بیٹی کا رشتہ یہاں سے ختم کرنا چاہتی ہیں۔

”ثریا تم کہنا کیا چاہتی ہو، ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہارے دل کو ذرا افسوس نہیں ہوتا کہ خدا خواستہ اگر تمہاری بیٹی کو اس طرح کا کوئی داغ لگ گیا تو۔“ اس طرح کی بات کرتے ہوئے نصرت جہاں کے دل کو ہول ہوا تھا مگر ثریا بیگم وہ نجائے کیسی ماں تھی جن کو ایسی بات سوچتے اور کرتے ہوئے ذرا افسوس نہ ہو رہا تھا۔

”داغ کی اس میں کیا بات ہے بھابھی، سب جانتے ہیں کہ بچے ابھی نابالغ تھے جب ان کی دادی نے ان کی زندگیوں کے فیصلے کر دیئے اب اگر بچے سمجھدار ہو رہے ہیں تو جو انہیں اپنی

زندگی کے لئے بہتر لگ رہا ہے وہ وہی کریں گے نا۔“ ثریا بیگم نے ناگواری سے کہا۔

”پہلی بات تو یہ ثریا کہ دونوں بچے اس وقت نابالغ نہیں تھے، ان کی زندگیوں کا فیصلہ اماں نے ان سے پوچھ کر ہی کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ ”چلو میں تمہاری یہ بات مان بھی لوں کہ بچے اس وقت نابالغ تھے مگر اب، اب تو بچے چھوٹے نہیں ہیں نا، تو اب ہی ان سے ان کی مرضی پوچھ لو، مجھے یقین ہے کہ دونوں بچے اس رشتے سے خوش ہیں مگر تم نجائے کیوں خواخواہ ہی۔“ نصرت جہاں اپنی دیورانی کی ہر بات کا جواب بڑے سہاؤ سے دے رہی تھیں، وہ یہ رشتہ کسی طور ختم نہ کرنا چاہتی تھیں۔

”خواخواہ نہیں بھابھی، منال میری اکلوتی اولاد ہے اور میں ماں ہونے کے ناطے مجھے پورا حق ہے کہ میں اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ خود کروں، اس لئے اپنی بیٹی کے لئے جو مجھے بہتر لگے گا وہ میں کروں گی اور اس کے لئے مجھے جہاں تک جانا پڑے گا میں جاؤں گی۔“ ثریا بیگم غصے و خنجر سے بولیں، نصرت جہاں کو ایک نئی پریشانی ایک نئی سوچ دے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کچھ وقت اور آگے کو سر کا تو فراز کو اس کی کمپنی نے اس کی بہتر کارکردگی کی بدولت جی ایم کی پوسٹ دے دی، لیکن جی ہو تو کامیابی خود بخود قدم چومتی ہے، یہی وجہ تھی کہ بہت کم عرصے میں اس نے یہ پوسٹ حاصل کر لی تھی۔

ہاں مگر بھی بھی ثریا بیگم کا مطالبہ اس کا دماغ کھولا دیتا تھا، وہ جانتا تھا کہ اس سلسلے میں اس کے بچا بالکل بے بس ہیں، کیونکہ گھر کے اندر اور باہر صرف اور صرف ان کی چچی ثریا بیگم کی ہی چلتی تھی، اس لئے اس کا اپنے چچا سے بھی بات کرنا بے کار تھا، منال کو وہ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا، اس کے دل کی دھڑکن کا نام منال تھا اسے

دل کی یہی کیفیت اس کی آنکھوں سے جھلکتی تھی اور اس کی آنکھوں سے جھلکتی یہ کیفیت صنیہ بیگم سے پوشیدہ نہ تھی، اسی لئے تو انہوں نے اپنے عزیز از جان پوتے کی خواہش کی تکمیل کا پورا بندوبست کر دیا تھا مگر اب..... ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد پیدا ہونے والے مسائل سے وہ بھی بھی بہت پریشان ہو اٹھتا تھا، اس کی وجہ یہ بھی کہ ثریا بیگم اب ڈھکے چھپے لفظوں میں دھمکیاں دے رہی تھیں، کوٹ میں جا کر خلع لینے سے متعلق اور جب یہ معاملہ دیرے دیرے بڑھنے لگا تب اس نے اس سلسلے میں منال سے بات کرنے کی ٹھان لی، وہ جانتا چاہتا تھا کہ کیا منال بھی وہی سب کچھ چاہتی ہے جو اس کی والدہ چاہتی ہیں یا منال اس سب سے نیکر لاعلم ہے۔

ثریا بیگم کی بے جا پابندیوں کی وجہ سے ہی وہ نہ ان لوگوں سے ملتی تھی اور نہ ہی فون پر کسی قسم کی بات چیت ہوتی تھی اور یہی نقطہ فراز کو پریشان کر رہا تھا، وہ منال کی رائے لئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا، اسی لئے اس نے منال سے ملنے کا وہ وقت طے کیا کہ جس وقت اس کی چچی ثریا بیگم گھر میں موجود نہ ہوں اور اتفاق سے ایسا وقت جلد ہی مل گیا۔

دروازہ منال نے ہی کھولا تھا، اپنے سامنے فراز کو دیکھ کر وہ ایکدم سے گھبرا گئی تھی، سرخ و سفید چہرے پر چا کا گلابی پن اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا، سٹنڈل مجبور پتہ نہیں اس کے دل کی کیفیت سے آگاہ بھی تھی یا نہیں کیونکہ زبان سے اپنی محبت کا اظہار فراز احمد نے آج تک اس سے نہ کیا تھا مگر آج شاید وہ اسی نیت سے آیا تھا۔

”آپ..... وہ ماما..... ماما گھر پر نہیں ہیں۔“ دوپٹے کا کونہ ہاتھوں میں مسکتی وہ بہ مشکل تمام بولی تھی، فراز کی بوکٹی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”میں جانتا ہوں وہ ابھی کچھ ہی دیر قبل شاپنگ کرنے گئی ہیں اور پچا جان یقیناً اس وقت آرام فرما رہے ہوں گے۔“ فراز نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

فریش بلوکلر کے تھری پیس کاٹن کے سوٹ میں اس کی چاندی جیسی رنگت دکھ رہی تھی سرخ و بنر چوڑیوں سے بھری کلاںیاں اس کے حسن کو اور بھی دو آتشہ بنا رہی تھیں۔

”آپ کو کیسے پتا کہ ماما.....“ اس کی اتنی معلومات پر وہ ایکدم سے چونکتے ہوئے بولی تھی اور ابھی سراٹھا کر اس کی جانب دیکھا ہی تھا کہ وہ پہلے سے ہی اس کی جانب بخور دیکھ رہا تھا، دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تھا جس پر منال نے فوراً اپنی نظروں کا زاویہ بدل ڈالا تھا اور اس کی اس ادا نے فراز کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”تم مجھ سے وابستہ ہو منال اور خود سے وابستہ تمام چیزوں کے لئے میں بڑا پوزیو ہوتا ہوں جبکہ تم تو ایک جیتا جاگتا وجود ہو، میری زندگی کا حصہ ہو، پھر تم سے وابستہ چیزوں یا لوگوں سے میں واقف نہیں ہوں گا تو کون ہوگا۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس نے بہت کچھ بتایا تھا، پھر بولا۔

”اگر غلطی سے میں تمہارے دربار حسن میں حاضری دینے آ ہی گیا ہوں تو کیا مجھے یہیں کھڑے رہنے کی سزا دو گی تم۔“

”آ..... آئیے نا، پلیز بیٹھیں۔“ اس کے اتکا کہنے کی دیر تھی کہ وہ ایکدم سے ہوش میں آتے ہوئے بولی اور پھر اس کے بیٹھنے کے بعد بولی۔

”میں آپ کے لئے ٹھنڈا.....“

”آں..... ہاں رہنے دو، مجھے اس وقت مائے تمہارے کسی چیز کی طلب نہیں ہو رہی ہے۔“ فراز نے قدرے شوخی سے کہا۔

”جی۔“ وہ ہونق بنی اس کی کچھ سمجھ میر آنے والی اور کچھ نہ آنے والی گفتگوں رہی تھی۔

”میرا مطلب ہے کہ فی الحال مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے، میں تم سے دو چار ضروری باتیں کرنے آیا ہوں، اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا، تم پھر بعد میں بے شک شرمائی اور گھبرائی رہنا۔“ فراز نے قدرے مذاق اڑانے والے انداز میں اسے چڑایا تھا۔

”جی..... مطلب کیا ہے آپ کا میں آپ کو.....“ اس کی بات نے منال کو واقعی چڑا دیا تھا، تب ہی تو جارحانہ موڈ میں بولنا شروع ہوئی تھی مگر اس سے پہلے ہی فراز نے اسے ٹوک دیا۔

”منال!“ دھیمے مگر مضبوط انداز میں اس نے اسے رکارا تھا اور اس کی آواز و انداز میں نجائے ایسا کیا تھا کہ وہ بے اختیار سر جھکاتے ہوئے اس کے سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

”یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو اور میری بات سنو، کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”آپ کو جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیں.....“ اس نے جربز ہوتے ہوئے کہا مگر اپنی جگہ سے نہ اٹھی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ مجھے ہی تم تک آنا بڑے گا۔“ فراز کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب صوفے پر جا کر بیٹھ گیا، کچھ پل اسی طرح خاموشی سے گزر گئے تھے، وہ جانتا تھا کہ منال اندر ہی اندر خوفزدہ ہے، آج تک وہ دونوں ایک کمرے میں تنہا بیٹھے تھے کجا کہ ایک صوفے پر اکٹھے بیٹھے تھے، اس نے ایک نظر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں رگڑتی منال کی جانب دیکھا تھا اور پھر اگلے ہی پل اس نے اپنے بھاری مضبوط ہاتھ میں اس کے دونوں ہاتھ لے لئے تھے۔

”منال زندگی کی بہت سی سچائیوں اور حقیقتوں میں سے ایک سچائی اور حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور اس حقیقت سے تم انکار کر سکتی ہو اور نہ میں۔“ بات کرتے کرتے وہ ایک پل کو رکا تھا اور اس کے چہرے پر نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔

”یہ بات تم جانتی ہو کہ ہماری دادی اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل ہمیں مضبوط رشتے بلکہ اس مضبوط اور اٹوٹ ڈور سے باندھ گئی تھیں، ان حالات میں تمہاری مرضی کیا تھی میں نہیں جانتا تھا مگر میں دینی ودنی طور پر اس رشتے کے لئے آمادہ تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ دادی نے یہ رشتہ جوڑا ہی میری دلی خواہش پر تھا تو غلط نہ ہوگا کیونکہ میں تم سے محبت کرنے لگا تھا اور تمہاری چاہت مجھے تمہارے حصول کے لئے اکسا رہی تھی۔“ اس کے ہاتھوں کو ہلکے سے دبا کر وہ خاموش ہو گیا اس کی شخصیت کے سحر میں کھوئی، فراز کے خاموش ہونے پر نہ صرف چوٹی تھی بلکہ بے اختیار اس کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی دوسری طرف وہ منال کی جانب متوجہ تھا، دونوں کی نظریں بے اختیار ٹکرائی تھیں اور پھر نظروں ہی نظروں میں دونوں نے بہت کچھ کہہ دیا۔

”منال تمہاری ان جھیل سی آنکھوں کی تحریر تو میں نے پڑھ لی ہے مگر کچھ سوالوں کے جواب مجھے تمہاری زبان سے چاہیں۔“ کچھ لمحوں بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”کیا تم جانتی ہو کہ چچی جان میرے اور تمہارے اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔“ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بہت کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا اور اس کی بات سنتے ہی منال جس طرح سے چوٹی تھی، اس نے فراز پر بہت کچھ واضح کر دیا تھا۔

”نہیں ماما، ایسا نہیں کر سکتیں۔“ دھیمی سی

آواز میں منال نے بڑے یقین سے کہا۔
”تمہارا یقین غلط ہے منال کیونکہ اس رشتے کو ختم کرنے کے سلسلے میں ان کی دھمکیاں مجھ تک بخوبی پہنچ رہی ہیں، ان کے دل اور ذہن میں کیا چل رہا ہے یہ میں نہیں جانتا، ہاں میرے دل اور ذہن میں کیا چل رہا ہے، وہ سب کلیئر کرنے کے لئے ہی میں تمہارے پاس آیا ہوں، تاکہ اس کو سامنے رکھ کر ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔“ فراز نے آخری بات بڑے سکون کے ساتھ دو ٹوک انداز میں کہی تھی اور اس کے اس طرح سے بات کرنے پر منال بولنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی، ماما اکثر آپ لوگوں سے تھا ضرور رہتی ہیں یہ رشتہ ختم کرنے کے بارے میں انہوں نے مجھ سے بھی بات نہیں کی ہے۔“

”تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ فراز نے جرح کے سے انداز میں پوچھا۔

”نہیں لیکن ماما.....“ الجھن کی گہری تحریریں اس کی آنکھوں میں نمایاں نظر آئی تھیں فراز کو تب ہی سرجھٹکتے ہوئے بولا۔

”بہر حال مجھے تم سے جو بات جانتا تھی، وہ میں نے جان لی ہے اور مجھے یہ بات جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ جس راہ پر میں چل رہا ہوں اس راہ کا میں اکیلا مسافر نہیں ہوں بلکہ تم بھی اس راہ پر میرے ہم قدم ہو، میرے لئے کوئی بھی قدم اٹھانے اور فیصلہ کرنے کے لئے یہی بات کافی ہے۔“ فراز نے مسکراتے ہوئے دھیرے سے اس کا نرم و گلابی گال چھوا تھا، جس پر وہ مزید چھوٹی موٹی جھنجھکی ہوئی تھی۔

”اپنی دے مسز منال فراز احمد اب میں چلی ہوں انشا اللہ بہت جلد دوبارہ اپنے اس موجود

رشتے کے ساتھ ملیں گے۔“ اس کے ماتھے پر جھٹکا دھیرے سے اپنے پیار کی مہر ثبت کرتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا، ابھی وہ اس کی آواز کی لمبیرتا اور شخصیت کے سحر سے نکلی نہ تھی کہ وہ جاتے ہوئے مکمل طور پر اسے ہینا بنا کر کر گیا، پیار کی پہلی چاہت، پہلا لمس اور پہلی خوشی ملی تھی آج اسے پھر وہ کیوں نہ ہواؤں میں اڑتی پھرتی، پیار بھی وہ جو شرعی حیثیت سے مکمل طور پر اس کا تھا، لیکن ان سب باتوں سے ہیٹ کر اندر ہی اندر اسے ان سب باتوں کی بھی فکر تھی جو فراز اس سے اس رشتے کو ختم کرنے سے متعلق کہہ گیا تھا اور اس کی پریشانی بجا بھی تھی۔

بہر حال بہت دیر سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے ماما سے اس سلسلے میں ایک بار بات ضرور کرنی چاہیے اور یہی بات سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سننے ہیں پھر چھپ چھپ کر ان کے گھر آتے جاتے ہو انشا جی نا حق جی کو وحشت میں الجھاتے ہو دل کی بات چھپائی مشکل لیکن خوب چھپاتے ہو بن میں دانا شہر کے اندر دیوانے کہلاتے ہو بے کل بے کل رہتے ہو پر محفل کے آداب کے ساتھ آنکھ چرا کر دیکھ بھی لیتے بھولے بھی بن جاتے ہو ”ماما ایک بات پوچھوں آپ سے۔“ ثریا بیگم اپنے نیل فائل کرنے میں مصروف تھیں تب خاموشی سے پاس بیٹھی منال نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

”ہاں پوچھو۔“ منال کی جانب توجہ کیے بغیر انہوں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

”ماما..... وہ..... میں نے سنا ہے کہ آپ میرے اور فراز کے رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔“ اپنی دانست میں منال نے ایک معقول سوال کیا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا یہ سوال اپنے

جواب میں خود کوئی سوال کھڑے کر دے گا کہ جس سے اس کی مشکل میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔
”کیا..... تم سے کس نے کہا۔“ اپنی تمام مصروفیت کو چھوڑ کر اب ان کی تمام توجہ منال کی جانب تھی۔

”میری طرف دیکھو منال، کیا ان لوگوں میں سے کوئی یہاں آیا تھا۔“ منال کو بدستور خاموش دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

”نہ..... نہیں ماما۔“ اس نے یہ مشکل تمام کہا، جھوٹ بولتے ہوئے اس کا لہجہ ایک دم سے لڑکھایا تھا۔

”تو کیا فون.....“ فون کا خیال آتے ہی انہوں نے چوٹکتے ہوئے پوچھا پھر بولیں۔

”کس کا فون آیا تھا..... فراز کا۔“
”ج..... جی۔“ لفظ اس کے گلے میں اٹکنے لگے تھے۔

”اوہ۔“ انہوں نے ہونٹ سیٹھرتے ہوئے کہا۔

”کیا کہہ رہے تھے محترم۔“
”یہی کہ آپ میرا اور ان کا رشتہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔“ منال اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ میری دی گئی وارننگ کا اس پر کچھ نہ کچھ اثر ہو ہی رہا ہے۔“

پرسوںج انداز میں وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولیں ان کی بات سن کر منال کو فراز کی کبھی گئی بات پر خود بخود یقین آتا جا رہا تھا۔

”کیوں ماما، آپ انہیں دھمکیاں کیوں دے رہی ہیں۔“ منال نے پوچھا۔

”کیونکہ میں اس سے تمہارے لئے خلع چاہتی ہوں۔“ ان کی زبان سے ادا ہونے والے ان دو ٹوک لفظوں نے اس کی پوری شخصیت کو ہلا ڈالا تھا، گویا فراز بالکل سچ کہہ رہا تھا۔

”لیکن کیوں ماما، آپ ایسا کیوں کر رہی

ہیں۔ ”وہ ایک دم سے رو ہانسی ہو گئی تھی۔
 ”اس لئے میری جان کہ میں تمہارے
 مستقبل کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر اور اچھے لوگوں
 میں کرنا چاہتی ہوں۔“
 ”وہ لوگ بھی اچھے ہیں ماما اور یہ فیصلہ
 دادی نے کیا تھا تو انہوں نے سوچ سمجھ کر ہی کیا
 ہو گا نا پھر آپ۔“ گہرے دکھ سے اس کی
 آواز بھرا گئی تھی۔

”خاموش ہو جاؤ منال، تم ابھی اتنی بڑی
 نہیں ہوئی ہو کہ اپنے اچھے برے کا فیصلہ کر سکو اور
 رہ گئی تمہاری دادی تو وہ اب اس دنیا میں نہیں
 رہیں کہ میں ان کی خواہش کو ہی لے کر بیٹھی
 رہوں اور اس میں اتنا روتے دھونے کی بھی
 ضرورت نہیں ہے، شاید کوئی جانتی ہو نا فراز سے
 کہیں زیادہ امیر، مازن اور خوبصورت ہے، تم
 جیسی لڑکی تو اس کے گھر عیش کرے کی عیش۔“
 انہوں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا، آنکھوں میں
 دولت کی اندھی ہوس چمکتی دکھائی دی تھی منال کو
 اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی دروازے
 پر تپل ہوئی تھی، ثریا بیگم نے آگے بڑھ کر دروازہ
 کھولا تھا، سامنے لیڈی کانشیل کے ساتھ دو
 پولیس مین کھڑے تھے اور ان کے پیچھے کھڑے
 فراز احمد کو وہ بخوبی پہچانتی تھیں۔

”آپ ثریا بیگم ہیں۔“ ایک کانشیل نے
 آگے بڑھ کر پوچھا تھا اور پھر منال کو برآمد کرنے
 کے بعد باقی کے تمام کاروائی پولیس نے بخوبی کی
 تھی، نکاح نامہ ثریا بیگم کو دکھاتے ہوئے انہوں
 نے فراز احمد کی منکوحہ کو جس بے جا میں رکھنے کا
 دعویٰ کیا تھا۔

اپنے دروازے پر آنے والی پولیس کو دکھ کر
 نہ صرف ثریا بیگم بلکہ منال تک کے ہوش کم ہو گئے
 تھے، فراز احمد نے جو قدم اٹھایا تھا وہ ثریا بیگم کی
 سوچ سے بالکل ہٹ کر تھا، ان کے تو وہم و گمان

میں نہ تھا کہ فراز یہ قدم بھی اٹھا سکتا ہے، وہ تو خود
 فراز کو پولیس اور کورٹ کی دھمکیاں دے رہی
 تھیں، یہ سب کچھ اتنا اچانک اور اتنی تیزی سے
 ہوا کہ ثریا بیگم کو کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کا ہوش نہ
 رہا اور ہوش آیا تب جب لیڈی کانشیل نے
 منال کے ہاتھ فراز کے ہاتھ میں دیتے ہوئے
 کہا۔

”مسٹر فراز ہم آپ کی بیوی منال احمد کو
 آپ کی تحویل میں دیتے ہیں اب آپ اپنی بیوی
 کو لے جاسکتے ہیں۔“

”فراز..... یہ سب کچھ کیا ہے، کیوں تم۔“
 منال کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا
 ہے۔

”تھینک یو منال، میں نے یہ جو کچھ بھی کیا
 ہے یقین مانو یہ تمہارے تعاون کے بغیر ممکن ہی نہ
 تھا، تھینکس آلاٹ۔“ اس کی انجمن اور ٹینشن کو
 سمجھے بغیر فراز نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے
 سرور لہجے میں کہا تھا، کہ کچھ فاصلے پر کھڑی ثریا
 بیگم نے اس کی بات نہ صرف سن لی ہے بلکہ اس کا
 مطلب بھی ان پر اچھی طرح واضح ہو گیا تھا اور
 یہی وہ چاہتا تھا۔

”ماما..... ماما پلیز کچھ کریں، یہ سب کچھ
 اس طرح سے نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ فراز کی
 طرف سے مایوس ہو کو وہ ثریا بیگم کی جانب متوجہ
 ہوئی تھی اور اس کے اتنا کہنے کی دیر بھی کہ ثریا بیگم
 غصے سے گرج اٹھیں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولیں۔

”بس، منال بس، آج یہ جو کچھ بھی ہوا ہے
 اس میں تمہاری رضا شامل تھی یہ جان کر مجھے بہت
 افسوس اور دکھ ہو رہا ہے، آج سے تم میرے لئے
 مر گئی ہو، آج سے نہ میں تمہاری ماں اور نہ تم میری
 بیٹی ہو، آج سے میرا اور تمہارا رشتہ ہمیشہ کے لئے
 ختم ہو گیا ہے۔“ وہ غصے سے گرجتے ہوئے
 خونخوار لہجے میں بولی تھیں اور پھر منال کے چیختے

چلانے کو بے دردی سے نظر انداز کرتیں وہ اندر
 چلی گئی تھیں، روٹی بھتی منال کو سہارا دے کر
 گاڑی تک لاتے فراز کو نجانے کیوں اپنے
 اٹھائے گئے اس قدم پر افسوس ہو رہا تھا۔

وہ یہ سب کچھ اس طرح نہیں کرنا چاہتا تھا،
 مگر دن بدن ملنے والی دھمکیوں اور حالات کو دیکھ
 کر اس نے یہ قدم اٹھا لیا تھا، وہ منال کو کسی
 صورت نہیں کھوٹا چاہتا تھا اور شاید یہ منال کی
 جاہت کی شدت تھی جو وہ اسے پانے کے لئے
 کسی بھی حد تک چلا گیا تھا۔

ابھی تو اور بھی بہت سارے مرحلے باقی
 تھے، گھر جا کر اس نے ابھی اپنی والدہ نصرت
 جہاں کو بھی فیس کرنا تھا، کیونکہ وہ بھی اس سارے
 معاملے سے بے خبر تھیں، فراز نے اپنے اس پلان
 کے بارے میں کسی کو بھی کچھ نہ بتایا تھا۔

☆☆☆

”یہ لیس امی آج میں آپ کی بہو کو رخصت
 کروا کر لے آیا ہوں۔“ گھر میں داخل ہوتے ہی
 فراز نے نصرت جہاں سے کہا۔

اپنے سامنے بیٹے اور بہو دونوں کو ایک
 ساتھ دیکھ کر وہ بھی نہ صرف حیران ہوئی تھیں بلکہ
 کچھ پریشان بھی ہو گئی تھیں اور ابھی وہ کچھ بولنے
 ہی والی تھیں کہ منال ان کے گلے سے لگتے
 ہوئے بے اختیار دو دوئی اور پھر رو رو کر اس نے
 ساری داستان نصرت جہاں کو سنادی، اس کا یوں
 بلک بلک کر رونا فراز کو مزید تکلیف دے رہا تھا،
 دوسری طرف منال کی تمام بات سن کر نصرت
 جہاں بھی تھتھے سے اکھڑ گئی تھیں۔

”فراز یہ تم نے کیا کیا ہے، اتنا بڑا قدم تم
 نے بغیر سوچ سمجھا اٹھالیا۔“

”جی نہیں امی، میں نے جو کچھ بھی کیا ہے
 بہت کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اس کے لئے بھی
 مجھے چچی جان نے ہی مجبور کیا تھا۔“ فراز نے

دوبدو جواب دیا تھا، منال ابھی تک نصرت جہاں
 کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔

”میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ
 اپنے چچا کے گھر پولیس کو لے جاتے ہوئے تم نے
 ایک پل کے لئے بھی کچھ نہیں سوچا۔“ نصرت
 جہاں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”اس سب کے لئے بھی مجھے چچی جان نے
 ہی مجبور کیا تھا، آج اگر گھر کی اور خاندان کی
 عزت بچانے کے لئے میں ان کے گھر پولیس کو
 نہ لے کر جاتا تو آنے والے وقت میں ہماری
 عزت کورٹ پکچریوں میں اچھل رہی ہوتی اور
 اپنی عزت کو بچانے کے لئے ہی میں نے یہ قدم
 اٹھایا ہے۔“ چہرے پر تناؤ لئے وہ غصے سے بولا۔
 ”ثریا ایسا کچھ بھی نہ کرتی، تم کچھ انتظار تو
 کرتے۔“

”اچھا امی پلیز، مجھے جو صحیح لگا وہ میں نے کر
 دیا، اب آپ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے مزید
 ٹینشن نہ دیں، فی الحال چچی جان غصے میں تھیں،
 ایک دو دن تک جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا
 تو میں منال کو اپنے ساتھ لے جا کر ان سے معافی
 مانگ لوں گا۔“ غصے سے دونوں انداز میں کہتا وہ
 باہر کی جانب بڑھ گیا تھا اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس
 کی گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز آئی تھی۔

”ادھر آؤ منال بیٹا، تم ادھر بیٹھو، حنا تم
 جلدی سے جا کر منال کے لئے ٹھنڈا سا شیک
 بنا کر آؤ۔“ نصرت جہاں نے اسے اپنے قریب
 ہی صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی حنا کو
 جو کہ بھابھی کی اس طرح آمد پر بے تحاشا خوش
 اور حیران ہو رہی تھی سے مخاطب ہوئیں۔

”جی امی میں ابھی لاتی ہوں۔“ وہ فوراً سے
 بیشران کے حکم کی تعمیل کے لئے چلی گئی۔

”دیکھو بیٹا پریشان مت ہو، ہم لوگ نہیں نا
 تمہارے ساتھ، تم تنہا بالکل بھی نہیں ہو اور نہ ہی

خود کو بھی تنہا سمجھنا۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں کے پیلے میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے محبت بھرے یقین سے کہا تھا۔

☆☆☆

کچھ دور ہمارے ساتھ چلو ہم دل کی کہانی کہہ دیں گے سمجھنے نہ جسے تم آنکھوں سے وہ بات زبانی کہہ دیں گے پھولوں کی طرح ہونٹوں پہ اک شوخ تبسم بکھرے گا دھیرے سے تمہارے کانوں میں اک بات پرانی کہہ دیں گے اظہار و فائز کیا جانو اقرار و فائز کیا جانو ہم ذکر کریں گے غیروں کا اور اپنی کہانی کہہ دیں گے کچھ دور ہمارے ساتھ چلو

کافی رات تک وہ گاڑی یونہی بے مقصد سڑکوں پر گھماتا رہا تھا اور جب رات گئے گھر واپس آیا تو نصرت جہاں کو جاگتے دیکھ کر کچھ شرمسار سا ضرور ہوا تھا۔

”فراز ادھر آؤ، یہاں میرے پاس بیٹھو۔“ انہوں نے بہت نرمی سے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سوری امی..... میں۔“ اس نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں فراز، غلطی بھی انسانوں سے ہی ہوتی ہے، بڑی بات غلطی ہونا نہیں ہے بلکہ بڑی بات تب ہے جب ہم اس غلطی کو سدھار لیں۔“ انہوں نے بڑے سجاؤ سے کہا پھر بولیں۔

”دیکھو بیٹا منال اس وقت بہت اپ سیٹ ہے جن حالات سے وہ اس وقت گزر رہی ہے

ان حالات میں کوئی بھی لڑکی ہوتی تو وہ اسی طرح بی ہو کرتی اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اس کے ساتھ نہایت نرمی و مہربانی سے پیش آؤ، ان تمام حالات کو کچھ نہ کچھ توری ایکشن ہو گا اس پر اور اس ری ایکشن پر ہمیں بہت حوصلے سے کام لینا ہو گا۔“ اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتیں وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہی تھیں۔

”جی امی جیسا آپ کہیں گی میں دیا ہی کر لوں گا۔“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔

”اور صبح ہوتے ہی منال کی بات اس کی ماما سے ضرور کر دانا ویلے ایک بات تو بتاؤ جس وقت تم منال کو لینے گئے تھے کیا تمہارے چچا گھر پر تھے۔“ انہیں اچانک سے کچھ یاد آیا تھا۔

”نہیں چچا گھر پر نہیں تھے، وہ اچانک ہی امی۔“ وہ بات کرتا کرتا خاموش ہو گیا تھا یوں جیسے اپنے آپ کو کچھ بتانے پر آمادہ کر رہا ہو۔

”فراز جو بات بھی ہے، مجھ سے کہہ دو۔“ انہوں نے اسے حوصلہ دیا۔

”اچانک ہی امی، میں نے یہ جو بھی قدم اٹھایا ہے اسے اٹھانے سے پہلے میں چچا جان کے پاس ہی گیا تھا اور اکیلے میں میں نے ان سے نہ صرف ساری بات کی تھی بلکہ اپنے پلان سے بھی انہیں آگاہ کیا تھا اور وہ اس سب میں میرے ساتھ تھے، مگر ہر بات سے قطع نظر انہوں نے خود کو سامنے لانے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ اگر وہ اس معاملے میں سرعام میرے ساتھ ہم قدم ہوتے تو آپ جانتی ہیں کہ بچی جان نے ان کے ساتھ کیا کرنا تھا، بس پھر اسی لئے انہوں نے مجھے یہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔“ وہ دھیرے دھیرے حقیقت سے انہیں آگاہ کر رہا تھا جس پر نصرت جہاں بھی کافی حد تک مطمئن ہو گئی تھیں۔

”اچھا اب جاؤ تم اپنے کمرے میں، منال کمرے میں آگئی ہے۔“ انہوں نے فکر مندی سے کہا اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

وہ دشمن جاں آج نہ صرف اس کے گھر بلکہ اس کے کمرے میں تھی، یہ خوشگوار احساس ہوتے ہی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھا تھا، اب تک غصے اور اشتعال کی بدولت وہ اس کے متعلق کچھ سوچ ہی نہ پایا تھا، اس نے دروازہ کھولا سامنے ہی وہ اپنے وجود کی تابانیوں سمیت محو خواب تھی، پچھلی دوراتوں سے وہ سونہ پانی تھی دوسرا صبح سے ہونے والے ان حالات و واقعات نے اس کی ہمتیں ختم کر دی تھیں، فراز اس کے قریب چلا آیا ایک بازو سینے پر اور دوسرا ماتھے پر ٹکائے وہ بے سہ سو رہی تھی، اچھے پریشان بال، متورم آنکھیں، شدت گریہ کی بدولت سرخ ہوئی ناک یہ سب کچھ فراز کو اس کے دلی کیفیت سے آگاہ کرنے کو کافی تھے۔

فراز کے لئے یہی بہت تھا کہ وہ جس کے تصور سے اس کی دل کی دنیا آباد تھی آج اس کے جیتے جاگتے وجود سے نہ صرف اس کا کمرہ بلکہ اس کا پورا وجود جھک رہا ہے نرم گرم جذبات کی آما جگہ بنا اس کا دل اسے کسی شوخ جھارت پر اکسا رہا تھا، مگر وہ خود پر ضبط کرتا اس کے قریب ہی لیٹ گیا تھا اور پھر بے اختیار اپنا دایا بازو اس کے بازو پر رکھ دیا، ارادہ اسے جگانے کا غلطی نہ تھا مگر وہ کسی انجانے احساس کے تحت خود ہی چونک کر جاگ گئی تھی اپنے اتنے قریب فراز کو دیکھ کر وہ جس نیڑی سے بیڈ سے اتر گئی اس نے فراز کو شدید شرمندگی سے دوچار کر دیا تھا۔

”آپ..... آپ یہاں۔“ نیند سے بھری گلابی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔

”لیکن یہاں تو میرے پاس حنا تھی۔“ وہ

اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”کیونکہ حنا ہی اسے اس کمرے میں لے کر آئی تھی اور نہ صرف لے کر آئی تھی بلکہ کانی دیر تک اس کے ساتھ باتیں بھی کرتی رہی تھی اور اب جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں حنا کے بجائے فراز کو دیکھ کر اسے شدید حیرت کا جھٹکا لگا تھا، حقیقی معنوں میں وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کمرہ فراز کا ہے، ورنہ وہ بھی بھی اس کمرے میں نہ ٹھہرتی۔“

”دیکھو منال یہ کمرہ اب تک صرف میرا تھا مگر اب یہ کمرہ ہم دونوں کا مشترک ہے اس لئے بالکل ریلیکس ہو کر سو جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“ فراز نے نرمی سے اسے دلاسا دیا تھا۔

”نہیں مجھے یہاں نہیں سونا۔“ اس نے نرو غصے پن سے کہا۔

”میں کہہ رہا ہوں نا منال کو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا، تم ریلیکس ہو کر بیڈ پر سو جاؤ، میں وہاں صوفے پر سو جاتا ہوں۔“ فراز اتنا کہہ کر تکیہ اٹھاتا صوفے پر چلا گیا تھا، تب وہ کچھ دیر تک یونہی کھڑی کچھ سوچتی رہی تھی اور پھر آہستہ سے بیڈ پر لیٹ گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح معمول کے مطابق تھی چونکہ سنڈے تھا اس لئے فراز کی بھی آؤس سے چھٹی تھی، ناشتے سے فارغ ہوتے ہی نصرت جہاں نے فراز کو منال کو ماریٹ لے جانے کا کہہ دیا مگر منال کسی طرح بھی رضامند نہ تھی۔

”منال بیٹا تم اس گھر کی بہو ہو، اگر تمہاری رخصتی صحیح طریقے سے ہوتی تو میں اپنی بیٹی کے لئے دل کھول کر خود شاپنگ کرتی لیکن اب جب یہ سب کچھ اس طریقے سے نہیں ہوا جس طریقے سے ہونا چاہیے تھا اس لئے تم خود فراز کے ساتھ

جا کر اپنی مرضی کی شاپنگ کر لو، میں اپنی بہو کو ہر وقت بے سنورے دیکھنا چاہتی ہوں اور پھر جب میں تمہیں ثریا کے پاس لے کر جاؤں گی تو نبی سنوری خوشحال میری بہو کو دیکھ کر ثریا نہ صرف خوش اور مطمئن ہو جائیگی بلکہ تم لوگوں کو معاف بھی کر دے گی اس لئے ابھی تم نے سب سے پہلا جو کام کرنا ہے وہ اپنے لئے اچھی سی شاپنگ کرنی ہے۔“ انہوں نے رمان سے اسے سمجھایا۔

”لیکن بڑی ماما۔“ جزیز ہوتی وہ کچھ بولنا ہی چاہتی تھی کہ انہوں نے ٹوک دیا۔

”منال کی تمام اپنی بڑی ماما کی یہ بات نہیں مانو گی۔“ انہوں نے چاہت بھری ناراضگی سے کچھ اس طرح کہا تھا کہ اسے بے ساختہ ان کی بات ماننا پڑی اور پھر وہ زبردستی حنا کو اپنے ساتھ لے کر ہی باز آگئی۔

تقدیر کے لکھے کو اس طرح لکھا، سمجھ کر وہ خاموش ہو گئی تھی کہ واہلا بچانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

اس کے نہ نہ کرتے ہوئے بھی فراز اور حنا نے اس کے لئے ڈھیروں ڈرہیز، شوز، پرس، میک اپ کا سامان، چوڑیاں، جیولری اور نجانے کیا کچھ خرید لیا یہی نہیں بلکہ فراز نے اس کے لئے موبائل اور سم بھی خرید لی تھی، خود سے وابستہ رشتوں کے لئے وہ اسی طرح کیسٹرنل رہتا تھا، پھر اب معاملہ تو اس کی عزیز از جان بیوی کا تھا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے موبائل میں سم ڈال کر منال کو پکارا دیا تھا جسے تھوڑے سے پس و پیش کے ساتھ اس نے تمام لیا۔

”ویسے بھابھی آپ اس موبائل سے سب سے پہلی کال کسے کریں گی۔“ حنا نے شوخی سے چپکتے ہوئے پوچھا۔

”اپنی ماما کو۔“ منال بے اختیار بول اٹھی۔

”ہاں تو پھر دیر کیوں کر رہی ہو بیٹا، جلدی سے کال ملاؤ۔“ نصرت جہاں نے خوشدلی سے اس کا حوصلہ بڑھایا جس پر اس نے فوراً کال ملا لی، دوسری طرف تیل جانے لگی۔

”ہیلو۔“ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے کہا۔

”کون ہے؟“ دوسری طرف سے ثریا بیگم نے شاید اس کی آواز نہ پہچانی تھی تب ہی پوچھا۔

”ماما میں..... میں منال۔“ لفظ اس کے گلے میں اٹکنے لگے۔

”کون..... کون منال، میں کسی منال کو نہیں جانتی، اس لئے مہربانی فرما کر دوبارہ یہاں فون کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ انتہائی سنگدل سے انہوں نے کہا۔

”ماما پلیز آپ میری بات تو سن لیں..... میں۔“ ان کے رویے کی سنگدلی نے اسے روہانسا کر دیا، لب بھینچے خاموشی سے اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھا فراز اس کی کیفیت کا بغور جائزہ لے رہا تھا، جبکہ نصرت جہاں اور حنا بھی خاموش بیٹھے اسے نظروں ہی نظروں میں حوصلہ دے رہے تھے۔

”اب کہنے اور سننے کے لئے منال تم نے چھوڑا ہی کیا ہے۔“ انداز ہنوز برقرار تھا۔

”ماما پلیز، میری بات کا یقین کریں میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ روتے ہوئے وضاحتیں دے رہی تھی۔

”سب کچھ کرنے کے بعد اب معصوم بننے کا کوئی فائدہ نہیں ہے منال اتنا دکھ مجھے فراز کے یہ قدم اٹھانے پر نہیں ہوا جتنا دکھ مجھے یہ جان کر ہوا ہے کہ خود میری اپنی بیٹی نے میرا ساتھ چھوڑ کر اس کا ساتھ دیا ہے، اس پلاننگ میں فراز کا ساتھ دینے والے تم خود تھیں۔“ گہرے دکھ اور تاسف کے ساتھ وہ اسے ملامت کر رہی تھیں۔

”آپ یقین کریں ماما..... میں نے ان کا

ساتھ نہیں دیا تھا، یہ جو کچھ بھی کیا تھا انہوں نے خود ہی کیا۔“ شدت جذب سے رونے کی وجہ سے لفظ اس کے گلے میں ہی اٹکنے لگے تھے اور وہ جو بہت خاموشی سے منال کے چہرے کے اتار چڑھاؤ نوٹ کر رہا تھا بے اختیار اس کے قریب آیا تھا اور فون اس کے ہاتھ سے لے کر ایسے کان سے لگا لیا۔

”جھوٹ سراسر جھوٹ، میں تمہاری معصومیت کے دھوکے میں رہی اور تم۔“ دوسری طرف ثریا بیگم کہہ رہی تھیں کہ وہ بول اٹھا۔

”گستاخی معاف چچی جان آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے جو بھی قدم اٹھایا اس میں میرے ساتھ نہ تو منال شامل تھی اور نہ ہی میری بیٹی کا کوئی اور فرد، ان حالات میں مجھے جو بہتر لگا وہ میں نے کر لیا اور اس کے لئے میں آپ سب سے بہت شرمندہ ہوں خاص طور پر آپ سے، ہم آپ کے بچے ہیں، اس لئے پلیز آپ ہمیں معاف کر دیں تاکہ ہم آپ سے ملنے آسکیں۔“ لہجے میں مضبوطی لئے وہ بہت سلجھے ہوئے انداز میں بول رہا تھا، مگر دوسری طرف اس کی اس وضاحت پر ثریا بیگم بالکل ہی بھڑک اٹھیں۔

”مجھے وضاحت دینے کی یا صفائیاں دینے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے، مجھے جو سمجھنا تھا میں نے سمجھ لیا اور جتنا جاننا تھا میں نے جان لیا، ہاں ایک بات میں تم سے ضرور کہوں گی کہ اپنی بیوی کو لے کر غلطی سے بھی میری دلہیز پر قدم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، میری بیٹی منال میرے لئے مر چکی ہے، سنا تم نے۔“ غصے سے گرجتے لہجے میں انہوں نے دو ٹوک بات کی تھی اور پھر فون بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دھری کو دیکھتے ہوئے فراز نے دوبارہ ان سے بات کرنے کی کوشش نہ کی تھی ہاں البتہ منال نے اس طرح کی بے شمار کوششیں کر ڈالی تھیں مگر سب بے سود تھا، شروع شروع میں وہ سخت ست سنا ڈالتی تھیں مگر اب اس کا بغیر دیکھ کر وہ فون ہی نہیں اٹھاتی تھیں، ہاں اس تمام عرصے میں اس کی اپنے والد ریاض احمد سے کئی بار بات ہوئی تھی اور انہوں نے اسے پیار سے حوصلہ اور تسلی دیتے ہوئے اتنا ضرور کہا تھا کہ۔

”تم سب کچھ وقت اور حالات پر چھوڑ دو، انشاء اللہ سب کچھ بہتر ہو جائے گا۔“ اور ریاض احمد کی کئی گئی اس بات نے اسے واقعی بہت حوصلہ دیا تھا تب ہی وہ سب کچھ وقت اور حالات پر چھوڑ کر کافی حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔

اس کا رویہ تقریباً سب لوگوں کے ساتھ ہی اچھا تھا، حنا سے کافی فریڈ شپ ہو گئی تھی اکثر وہ اس کے ساتھ کچن میں بھی تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دیتی تھی، عیاض سے بھی گپ شپ تھی، موڈ ہوتا تو نصرت جہاں کے پاس بھی بیٹھی رہتی تھی، اگر اس کا رویہ صحیح نہیں تھا تو فراز کے ساتھ صحیح نہیں تھا، ایک کمرے میں رہتے ہوئے وہ دونوں آج بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہی تھے، منال اگلے دن خود ہی سے فراز کے آنے سے پہلے صوفے پر سو گئی تھی اور اب تک وہ صوفے پر ہی سوئی آرہی تھی یہ سب کچھ اگرچہ کہ فراز کے لئے تکلیف دہ مرحلہ تھا، مگر وہ ان رشتے میں ”زبردستی“ کا قائل قطعی نہ تھا، دوسری طرف نصرت جہاں بھی اپنی بڑی اولاد کی اس طرح شادی پر بھی دھی ہو جاتی تھیں ہزاروں ارمان تھے ان کے دل میں اپنے بیٹے اور بہو کے لئے، نہ ان کے بیٹے کو سہرا بندھا نہ کوئی ولیئم، نہ رسم نہ رواج، یہ سب کچھ سوچ کر وہ تھوڑا دھی ضرور ہو جاتی تھیں مگر پھر ان حالات کو جن میں فراز اسے لے کر یہاں آیا تھا انہیں

سوچ کر وہ مطمئن ہو جاتی تھیں۔

فراز اور منال میں نئے نئے لیلے دلہا دلہن جیسا انہیں کچھ بھی تو محسوس نہ ہوتا تھا جب وہ اس بات کا شکوہ فراز سے کرتیں تو وہ ”سب ٹھیک ہو جائے گا“ کہہ کر انہیں خاموش کروا دیتا تھا، ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا تھا منال کو یہاں آئے ہوئے اور اس گزرتے ایک ماہ میں فراز نے نوٹ کیا تھا کہ کبھی کبھی وہ بہت خود سر اور روڈ ہو جاتی تھی اور وہ اس کے اس روڈی انداز کو اکثر نظر انداز کر جاتا تھا مگر آج..... آج جب وہ اس کے میسٹ فرنیچر حسن کی منہ سے اتنے روڈی انداز میں بات چیت کر رہی تھی اس سے فراز کو منال پر شدید غصہ آیا تھا مگر پھر ہمیشہ کی طرح کافی دیر بعد اس نے خود کو نارمل کر لیا تھا۔

☆☆☆

فراز نے جیسے ہی ڈرائنگ روم میں قدم رکھا مترنم کھٹکھٹانا قہقہہ اس کے کانوں میں پڑا تھا، آواز کے تعاقب میں جب اس نے نظر ڈالی تو سامنے ہی وہ دیکھن جاں بڑے آرام سے صوفے میں دھکی بیٹی تھی، اس کے ساتھ والے صوفے پر حنا اور سامنے عیاض بیٹھا تھا جبکہ میز پر رکھی لڈو اور گولیاں دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ یقیناً یہ لوگ لڈو کھیل رہے ہیں۔

”عیاض ویسے آپس کی بات ہے تمہاری چاروں گولیاں اپنے گھر میں بیٹی آرام فرمائی ہوئی کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔“ ایک بار پھر اس کا قہقہہ بلند ہوا تھا، فراز کو یوں لگا جیسے اس کے آس پاس گھنٹیاں بج رہی ہوں، اس نے پہلی بار یوں اسے کھٹکھٹا کر ہتے دیکھا تھا وہ بے خود سا کھڑا اسے دیکھ گیا۔

”ارے فراز بھائی آپ کب آئے۔“ سب سے پہلے عیاض کی نظر اس پر پڑی تھی۔

”جب کسی کی خوبصورت لہری کی جھک

میرے کانوں میں بڑی، میں اسی وقت آیا تھا مگر لہری اتنی خوبصورت تھی کہ میں بے اختیار ہو کر وہیں رگ گیا کہ کہیں اس ہنسنے والی کو میری نظر نہ لگ جائے۔“ قدم اس کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ بے خود سا بول گیا۔

”اوہ آئی سی بھائی، آپ تو لگتا ہے بھابھی کی محبت میں شاعر ہو گئے ہیں۔“ عیاض اپنے بھائی کے شوخ اور شاعرانہ موڈ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

بریف کیس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر نائی کی ٹاٹ ڈھکی کرتا وہ منال کے قریب ہی صوفے میں جھنس گیا اور اس کے یوں پھیل کر بیٹھنے پر منال تھوڑا سا کسمکاسی ضرور تھی جس پر فراز دھیرے سے مسکرا دیا۔

”بھائی آپ کے لئے چائے لاؤں۔“ بھائی کے فریش موڈ نے حنا کو بھی خوش کر ڈالا تھا تب ہی خیال آتے ہی بولی۔

”آف کورس گڑیا، اچھی سی سٹرونگ سی چائے لے کر آؤ، کیونکہ ابھی میں نے تمہاری بھابھی کے ساتھ ایک گیم بھی کر لی ہے۔“ اس کے موڈ کی شوخی و جولانی عروج پر تھی، آج اسے احساس ہوا تھا کہ باہر سے آنے والے تھکے مارے مرد کے لئے گھر میں داخل ہوتے ہی مسکرا کر استقبال کرنے والی بیوی کتنی اہمیت رکھتی ہے، اس کی ساری تھکن، کوفت اور فرسٹریشن منال کے کھلتے قہقہے اور مسکراتے چہرے نے جنم لی تھی۔

”یاہو.....“ اس کی بات پر عیاض اور حنا نے زور سے نعرہ لگایا۔

”نہیں میں اب نہیں کھیلوں گی، مجھے نیند آ رہی ہے۔“ منال نے ساری گولیاں اکٹھی کرتے ہوئے مزید کھیلنے سے انکار کر دیا۔

”ارے یہ کیا بات ہوئی بھابھی، آپ مزید

کھیلنے سے کیوں منع کر رہی ہیں، آپ دیکھنا انشا اللہ آپ ہی جیتیں گی۔“ عیاض نے کہا۔

”پلیز بھابھی، آپ ہماری خاطر صرف ایک گیم کھیل لیں۔“ حنا نے بھی پر زور انداز میں کہا اور پھر ان دونوں نے اسے دوبارہ سے کھیلنے پر مجبور کر دیا، گیم زبردست انداز میں چل رہی تھی کہ فراز نے اس کی ایک گوٹ مار دی عیاض چونکہ فراز کا طرف دار تھا اس لئے خوب کلپنگ کی اس نے۔

”بھابھی پلیز اچھے سے دانے لیں ناں، پلیز بھابھی کوشش کریں، آپ نے فراز بھائی سے جیتنا ہے۔“ حنا چونکہ منال کی طرف تھی اس لئے اسے پر زور انداز میں تاکید کر رہی تھی۔

اسی وقت نصرت جہاں نے اسے آواز دی تو وہ کچن کی جانب بڑھ گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد فراز نے اس کی دو گوٹ گھر بیٹھا دی، پے در پے ناکامی نے منال کو غصے کے ساتھ جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

”بھیا پلیز آپ نے بھابھی کی چاروں گوٹیں ان کے گھر بٹھائی ہیں کیونکہ انہوں نے میرے ساتھ ہی کیا تھا۔“ فون کی مسلسل بجتی ٹیل پر عیاض ڈرائنگ روم میں جاتے ہوئے کہا۔

”نہیں مجھے آپ کے ساتھ نہیں کھیلنا۔“ عیاض کے جاتے ہی منال نے ہاتھ مار کر ساری گوٹیں بکھیرتے ہوئے کہا، جن کے مجبور کرنے پر وہ کھیلنے لگی تھی جب وہ ہی اٹھ گئے تھے، تو پھر وہ گولیاں پھر کچھ دہار بھی رہی تھی اس لئے۔

”کیوں سوٹ ہارٹ، کیا نہیں ہارنا اچھا نہیں لگتا۔“ ایکدم سے فراز نے گوٹیں بکھیرتے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے ہاتھ چھوڑیں۔“ اپنے ہاتھوں کو چھڑوانے کی جدوجہد کرتے ہوئے اس نے کہا،

لہجے میں ہارنے کا دکھ اور شرمندگی تھی۔

”میں بھی تو تمہارا ہی ہوں، تو پھر جان حیات میری جیت کو تم اپنی جیت بھی تو سمجھ سکتی ہو نا۔“ اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”پلیز میرے ہاتھ چھوڑیں اور مجھے جانے دیں۔“ وہ ایکدم سے روہاسی ہو گئی تھی تب عیاض کو سامنے سے آتا دیکھ کر اس نے منال کے ہاتھ ہلکے سے دبا کر چھوڑ دیئے۔

”بھائی کون جیتا ہے۔“ فون، نذر کر کے آتے ہی اس نے پوچھا۔

”تمہاری بھابھی جیتی ہیں۔“ فراز نے متبسم لہجے میں اطلاع دی۔

”یہ کیا بھائی، گیم تو آپ جیت رہے تھے پھر بھابھی کیسے جیت گئیں۔“

”تمہارے جانے کے بعد تو تمہاری بھابھی نے اپنے جوہر دکھائے اور ساری گیم پلٹ دی نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔“ فراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور آپ اپنی ہار پر اس قدر خوش ہو رہے ہیں۔“ عیاض نے حیرت سے پوچھا۔

”ارے ہار میں اور وہ الگ الگ تھوڑی ہیں وہ جیت گئی ہے تو کیا ہوا اس کی جیت میری بھی تو جیت ہے۔“ وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

سدھ سورہی تھی اپنے طور پر اس نے سردی سے بچاؤ کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور اسے اس طرح سوتے دیکھ کر فراز کو شدید شرمندگی نے گھیر لیا خود تو آرام دہ بستر پر کبیل لیٹ کر سکون سے سو جانے والے کو بالکل احساس نہ ہوا کہ اس کی نصف بہتر کس حال میں ہے۔

وہ نور اپنے بستر سے نکلا تھا اور پھر کبیل اٹھا کر اس نے منال کے اوپر ڈال دیا، وہ جانتا تھا کہ اس کبیل کے بغیر اسے نیند بالکل نہیں آئے گی مگر آج کی رات تو کسی نہ کسی طرح گزارا کرتا ہی تھا، اس لئے خود وارڈ روم سے بیڈ شیٹ لے کر لیٹ گیا، صبح وہ امی سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ایک اور کبیل نکلاوا لے گا۔

☆☆☆

”منال منال دیکھو کون آیا ہے۔“ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی جب اس کے کانوں سے فراز کی آواز نکل کرانی تھی، اس کی آواز سن کر وہ ایک بل کے لئے تو چوٹی تھی کہ آج آؤں سے وہ اتنی جلدی آ گیا تھا۔

”منال کہاں ہو بھئی، ادھر آؤ دیکھو کون آیا ہے۔“ فراز کی آواز دوبارہ اس کے کانوں سے نکل کرانی تھی مگر وہ نظر انداز کرتی دوبارہ سے کتاب کی ورق گردانی کرنے میں مصروف ہو گئی تھی، اس وقت اس کی بے زاری اور بے نیازی قابل دید تھی۔

”منال..... منال۔“ اس بار اسے پکارنے والے کی آواز بدلی ہوئی تھی مگر بھی مانوس سی اور یہ آواز کانوں میں پڑنے کی دیر تھی کہ وہ بے اختیار چونک اٹھی۔

”پاپا، یہ تو پاپا کی آواز ہے۔“ خوشی وحیرانگی کے لئے حیلے احساسات کے تحت اس نے خود کلائی کی تھی اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم میں چلی آئی، سامنے ہی ریاض احمد

کھڑے اپنی بھابھی اور بیٹی سے مل رہے تھے۔ ”پاپا۔“ آنکھوں میں می لے خوشی سے بے اختیار چپٹی ہوئی وہ ان کے سینے سے جا لگی تھی۔

”پاپا..... پاپا اتنے دن بعد آپ کو میرا خیال آیا ہے، بیوی پاپا ہے جو کچھ بھی ہوا اس میں۔“ کچھ دیر بعد ان کے سینے سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا، آنکھوں سے سیل رواں بدستور جاری تھا۔

”منال بیٹا بس اب تم بالکل بھی نہیں روؤ گی، پچھلے دنوں جو کچھ بھی ہوا سب میرے علم میں ہے، اس لئے سب سے پہلے تو تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔“ انہوں نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے اپنے قریب بٹھالیا۔

”لیکن پاپا ماما بھتی ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے یا انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سراسر میری ایما پر..... پاپا..... ماما۔“ وہ پھر سے رونا شروع ہو گئی تھی۔

”دیکھو منال اگر تم یونی روتی رہیں نا تو میں ابھی واپس چلا جاؤں گا اور پھر تمہارے بلائے پر بھی نہیں آؤں گا۔“ اس بار ریاض احمد نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو منال کو چپ ہونا ہی پڑا۔

”ایسے نہیں جاؤ پہلے جا کر منہ دھو کر آؤ، ایسی رونے دھونے والی میری بیٹی نہیں ہو سکتی۔“ انہوں نے کہا تب وہ اٹھ کر چلی گئی۔

”بھئی کس گاڈ بچا جان کہ اس نے آپ کی بات مان لی ورنہ تو۔“ اس کے جاتے ہی فراز نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے شکر کیا تھا، ورنہ تو منال کا رونا اسے شدید الجھن اور پریشانی میں مبتلا کر ڈالتا تھا، ایسے میں کوئی محبت بھرا مظاہرہ کر کے اسے چپ کروانے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔

”فراز بری بات، تم میری بہو کی شکایت لگا

رہے ہو۔“ پاس بیٹھی نصرت جہاں نے بیٹے کو ٹوکا۔

”کوئی بات نہیں بر خور دار آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی، اس لئے پریشان مت ہو۔“ ریاض احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا اور اسی وقت منال چلی آئی، منہ ہاتھ دھونے کے بعد کافی حد تک فریٹش تو ہو ہی گئی تھی مگر رونے کی وجہ سے آنکھوں کی پلکی سی سوجن اور ناک کی سرخی نے اس کو ایک عجیب سا نکھار بخش دیا تھا۔

”منال یہاں بیٹھو میرے پاس اور میری بات دھیان سے سنو۔“ انہوں نے اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا پھر سر جھکائے کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔

”دیکھو منال، فراز نے ان حالات میں جو بھی قدم اٹھایا یا بالکل صحیح اٹھایا تھا اور مکمل میری رضامندی سے ہی اس نے یہ قدم اٹھایا تھا، چونکہ بیٹا تم ہر اس بات سے بے خبر تھیں جو تمہاری ماں تمہارے سلسلے میں کر رہی تھی، یہ بالکل صحیح ہے کہ تمہاری ماں فراز سے نہیں طلاق دلا کر اپنے بچے سے بیاہنا چاہتی تھی شاید کی جائز ناجائز طریقوں سے کمائی گئی دولت کی چکا چوند کے آگے تمہاری ماں کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں، اس لئے اسے کچھ صحیح اور غلط نظر نہیں آ رہا، جب وہ شاید کے کارناموں سے واقف ہو گئی تب اس کی سمجھ میں آئے گا کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح۔“ وہ ایک بل کے لئے رکے پھر بولے۔

”تمہاری ماں کی جانب سے فراز کو ملنے والی دھکیوں میں جب دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا تو ایک دن فراز کا مجھے فون آیا اور اس نے مجھے باہر ملنے کے لئے بلایا اور اس سے ملنے کے بعد اس نے جو مسئلہ میرے سامنے رکھا درحقیقت میں خود اس سے بے حد پریشان تھا، میں اپنی پیاری

سی بیٹی کو اس پیارے انسان سے چھین کر اس شیطان صفت آدمی کے حوالے بھی بھی نہ کرنا چاہتا تھا مگر بیٹا اس سب کو کرنے کے لئے میرے اندر حوصلہ بھی نہ تھا، کیونکہ تم جانتی ہو کہ ثریا بیگم صرف اپنی من مانی کرنے کا شوق ہے، اس کی ہاں میں ہاں ملائے رکھو تو تمہارا وقت اچھا گزر جائے گا، پچھلے چوبیس سال سے میں بیٹی کچھ کرتا آ رہا ہوں، بیٹا میں اس سے جان چھڑا سکتا تھا مگر میں نے ایسا صرف اور صرف تمہاری وجہ سے نہیں کیا، میں نہیں چاہتا تھا کہ آنے والے وقت میں دنیا کا کوئی بھی انسان تمہیں میری وجہ سے کوئی بات سنائے، اس لئے بیٹا میں اس کے ساتھ کیو و ماثر کرتا رہا، اس نے تمہارے تایا کی نیملی میں آنے جانے سے مجھے منع کیا، اس نے زندگی میں جو جو پانچویں مجھ پر لگائیں، میں اپنے گھر کے سکون اور تمہاری خاطر اس کا پابند ہوتا چلا گیا مگر اس مقام پر جہاں وہ تمہیں میرے اپنوں سے الگ کر رہی تھی وہاں میں خود کو اس کا پابند نہیں بناسکا، در پردہ ہی سہی میں نے وہ کیا جو میرے دل کی خواہش تھی، لوگوں کی نظروں میں بے شک میں ایک بزدل مرد ہوں گا لیکن مجھے اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لئے بزدلی کا یہ طوق گلے میں ڈالنا منظور ہے اکثر سننے میں آتا ہے کہ اپنے بچوں کی خاطر قریبی دینے والی زیادہ تر مائیں ہی ہوتی ہیں مگر بھی سبھی باپ بھی اپنے بچوں کے لئے قربانی دے دیتے ہیں، اس لئے بیٹا اپنے دل میں یہ اطمینان رکھو کہ فراز نے جو کچھ کیا تمہارے پاپا کی رضامندی سے کیا تھا اور غریب میں تمہاری ماما کو بھی لے کر آؤں گا۔“ تمام وضاحت دے کر وہ صوفے کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، یوں جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر لمبی مسافت طے کر کے کچھ دیر سستانے کو بیٹھا ہو جسے ابھی مزید مسافت طے کرنی ہو، گزرے وقت کی

پر چھائیاں ان کے چہرے سے عیاں تھیں۔

گزہرے چوئیں برسوں میں اس نے اپنے دل کا حال بھی کسی پر عیاں نہ کیا تھا مگر آج آج اسے اپنی مجبوریوں کا اعتراف ضرور کرنا تھا، اپنی بیٹی کے اطمینان اور اس کی خوشیوں کے لئے یہ بہت ضروری ہو گیا تھا، نصرت جہاں اپنے دلور کے چہرے پر گزہرے ماہ و سال کی گرد دیکھ کر بہت افسردہ ہوئی تھیں۔

”پاپا..... آپ۔“ وہ جو بہت غور سے باتیں سن رہی تھی، اسکندم بے چینی سے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تھے۔

”افوہ بٹا چھوڑو یہ سب کچھ اور یہ بتاؤ کہ تمہارے پاپا چلیں بار تمہارے گھر آئے ہیں کیا تم اپنے بابا کو چائے پانی کا بالکل نہیں پوچھو گی۔“ ماحول کی شرافت کا کم کرنے کے لئے انہوں نے ہشاش بشاش لہجے میں کہا۔

”اوہ سوری پاپا میں.....“ مارے شرمندگی کے اس نے کہا۔

”مجھے تو لگتا ہے بیٹا کہ تم یہاں کوئی کام وام نہیں کرتی ہوگی ہے نا۔“ اگلے ہی پل انہوں نے پھر کہا۔

”وہ اچھوٹی پاپا۔“

”بری بات منال، یہ گھر ہی اب تمہارا اپنا گھر ہے، یہاں غیروں کی طرح مت رہا کرو اور بھابھی آپ بھی سن لیں، اب آپ کی آرام کرنے کی عمر ہے اس لئے گھر کی ساری ذمہ داریاں بہو کے کندھوں پر ڈال کر بے فکر ہو جائیں۔“ انہوں نے منال کو ملامت کرنے کے بعد نصرت جہاں کی طرف رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

”کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو ریاض لیکن ابھی میں اپنی بچی کے کچھ چاؤ چھیلے تو کرلوں، کام اور ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تو عمر پڑی ہے۔“ نصرت جہاں نے محبت سے منال کو اپنے سے

قریب کرتے ہوئے کہا۔

”اف امی، آپ کب تک اس محترمہ کو بچی بنا کر رکھیں گی، اسے یہ تو بتائیں کہ اب یہ بڑی ہو گئی ہے اس لئے۔“ خاموش بیٹھے فراز نے چڑ کر کہا منال کی بے اعتنائی اسے مسلسل جھجھلاہٹ کا شکار کر رہی تھی۔

”تم چپ رہو، خبردار جو تم نے میری بیٹی کو کچھ کہا، بہت الجھی ہوئی سمجھدار لڑکی ہے یہ۔“ نصرت جہاں نے بیٹے کو گھر کا۔

”خاک سمجھدار ہے یہ۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا تھا، خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا، منال کے فریش موڈ اور مسکراتے چہرے کو دیکھ کر فراز کو پوری کائنات مسکراتی ہوئی لگ رہی تھی، اس کی نظریں ہی نہ ہٹ رہی تھیں منال کے چہرے سے۔

”پاپا..... پاپا آپ کب لے کر آئیں گے ماما کو۔“ ریاض احمد نے جانے کے لئے جب قدم بڑھائے تو منال نے اختیار ہو کر ان سے پوچھا۔

”بہت جلد، انشا اللہ۔“ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر انہوں نے محبت سے بھرپور لہجے میں کہا پھر بولے۔

”تم بس دعا کرتی رہنا کہ اللہ پاک تمہاری ماں کی آنکھوں پر جو پٹی بندھی ہے اسے جلد از جلد اتار دے۔“ وہ کہہ کر کے نہ تھے۔

☆☆☆

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی تم مانگتے پھر دو گے اپنا غرور ہم سے وہ بچن میں پانی پینے کے لئے آیا تھا، سامنے ہی وہ لا پرواہ سے حلیے میں کھڑی نہ صرف خود سے بلکہ اپنے ارد گرد سے بھی غافل تھی اور اسے یوں کھڑا دیکھ کر فراز شعر پڑھے بغیر نہ رہ سکا تھا اور شعر کے معنی و مطلب سمجھتے ہوئے وہ بے اختیار چوکی تھی۔

”وہ آپ باہر چلیں میں کھانا، کھانا لگواتی ہوں۔“ اپنی دانست میں اس نے فراز کو بچن سے باہر جانے کے لئے کہا تھا۔

”کیا تمہیں میری ”طلب“ کا احساس ہے۔“ وہ دھیرے دھیرے چلتا، دیکھی میں چچ چلائی منال کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا، اس کے سانسوں کی پیش منال کو اپنے کندھوں پر محسوس ہو رہی تھی، ہر گزرتے دن کے ساتھ فراز کی ”شدت جذبات“ میں اسے اضافہ ہوتا محسوس ہو رہا تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ وقت دور نہیں ہے جب وہ اس کے جذبات کے آگے ہار جائے گی، ابھی تو وہ کسی نہ کسی طرح اسے ٹال دیتی تھی، مگر ایسا زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتا تھا، کسی بھی مرد کے لئے اپنی خواہش اور خوشی سے زیادہ عرصہ دور رہنا ممکن نہ تھا۔

”وہ..... میں کھانے کی بات کر رہی تھی۔“ فراز کی راہیں تلاش کرتے ہوئے اس نے یہ مشکل تمام کہا، ورنہ فراز کی قربت اس کے حواس گم کرنے کے لئے کافی تھی۔

”میں بھی تو اپنی ”خواہش“ کی بات کر رہا ہوں۔“ لہجہ اور انداز دونوں معنی خیز تھے اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی ”خواہش“ کے اظہار کا کوئی ٹکڑا مٹا کر باہر سے تنہا کی آواز آگئی۔

”بھابھی امی کہہ رہی ہیں کہ کھانا لگا دیں۔“ ”اوہ شٹ۔“ وہ خالی مکہ فضا میں لہراتا ہوا بولا اور پھر وہ جو شکر ادا کر رہی تھیں کی جانب بڑھ رہی تھی اس کے تاثرات دیکھتا ہر نکل آیا۔

”اف بھابھی، یہ..... یہ کوہنے ہیں۔“ سب سے پہلے عیاض نے ڈونٹے میں چچ ہلاتے ہوئے ٹوکا، عجیب عجیب سی شہید کے کوہنے اٹگے میں موجود تھے ان میں سے کچھ ٹوٹ بھی پکے تھے، اس لئے عیاض کا مذاق بنانا یقینی تھا۔

”بری بات عیاض، تمہاری بھابھی نے اتنی

محنت سے تم لوگوں کے لئے کھانا بنایا ہے اور تم ہو کر نقص نکال رہے ہو۔“ انہوں نے بیٹے کو گھر کا۔

”اصل میں بڑی ماما، میں نے یہ پہلی بار بنائے ہیں، کچھ سمجھ ہی نہ آ رہا تھا پہلے سوچا کہ آپ سے پوچھ لوں، مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کی آپ آج مارکیٹ سے اتنا تھک کر آئی تھیں پھر آ کر بچن میں میرے ساتھ لگ جائیں اس لئے میں نے ریسپی دیکھ کر بنا ہے مگر یہ۔“ وہ شرمندگی سے وضاحت کر رہی تھی۔

”افوہ بار، ٹیسٹ تو دیکھو، کیا زبردست ٹیسٹ ہے۔“ اس کی شرمندگی کم کرنے کی خاطر فراز نے نوالا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھائی آپ کو تو واقعی ٹیسٹ لگیں گے، آپ کی ٹیکم نے جو بنائے ہیں۔“ عیاض نے مسکراتے ہوئے اس پر چوٹ کی۔

”تمہیں بھی یقیناً ٹیسٹ لگیں گے جب تم یہ سوچ کر کھاؤ گے یہ میری پیاری بھابھی نے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔“ اس کے چوٹ کرنے پر فراز مزید شوخ ہوا تھا۔

”افوہ بچو، کیا ہو گیا ہے تمہیں، اگر میری بہو کے بنائے گئے کوہنے کسی کو پسند نہیں ہیں تو وہ یہ رات والی دال کھا لے مگر فضول میں میری بہو کے بنائے گئے کھانے میں نقص نہ نکالے۔“ اس سے پہلے کہ وہ دونوں بھائی باقاعدہ چوچ لڑاتے نصرت جہاں نے دال کا ڈونگہ ان کے آگے رکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی کوہنوں کا ڈونگہ اٹھا لیا۔

”یہ کیا امی، میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا بھائی کو چڑانے کے لئے، پلیز آپ یہ ڈونگا ادھر دے دیں۔“ عیاض بیچ لدی سے کہا۔

”اب آئے ہونا راہ راست پر، چلو بچوں سب خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“ نصرت جہاں نے

کہا اور پھر خاموشی سے سب نے کھانا کھایا۔

☆☆☆

”وہ بڑی ماما کہہ رہی تھیں کہ آپ کھانے کے بعد چائے لیتے ہیں اس لئے یہ چائے۔“ کھانا کھانے کے بعد کمپیوٹر آن کیے وہ کوئی ضروری فائل بنانے میں مگن تھا جب منال گرم گرم بھاپ اڑاتا گ ہے چلی آئی۔

جس دن سے ریاض احمد اس سے مل کر گئے تھے اس دن سے وہ اس گھر اور اس گھر کے کینوں سے کافی ٹھل مل گئی تھی، وہ خود سری جودہ اکثر فرائز کے سامنے وہ کر جاتی تھی، وہ بھی اب اس کے رویے میں مفقود ہو گئی تھی، ہیئرٹ گرین شفون کے سوٹ میں ہم رنگ چوڑیاں ڈالے دلکش نقوش لئے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی، اس کے دلکش سراپے میں کھوئی نظریں جب واپس پلٹیں تو ان کی چمک میں حد درجہ اضافہ ہو چکا تھا۔

”صرف چائے ہی لانی ہو یا ساتھ میں اپنی ”چاہ“ بھی لے کر آئی ہو۔“ معنی خیز انداز میں کہہ کر فرائز نے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اور دوسرے سے چائے کا کپ لیتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”وہ میں..... میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ جھجکتے ہوئے اس نے کہنا چاہا۔

”جی کیسے کہیے، ہم تو نجانے کب سے آپ کو ”سننا“ سمجھنا اور محسوس کرنا چاہتے ہیں مگر آپ ہیں کہ ہماری پرواہ ہی نمی کرتیں۔“ انداز لہجہ مزید شوخ ہوا۔

”پلیز فرائز، آپ مجھے پریشان کیوں کرتے ہیں میں ابھی۔“

”مائی سویٹ بائٹ اگر میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا تو پھر کسے کروں گا آئی ایم لودو یوٹم آخر کب تک۔“ اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنی محبت بھری گرمی کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے

اس نے کہا۔

”جب تک ماما یہاں میرے پاس نہیں آ جاتیں، جس طرح آپ کے بڑے آپ کی خوشی میں خوش تھے تو آپ نے یہ قدم اٹھایا، اسی طرح میں بھی یہ چاہتی ہوں کہ میرے بڑے بھی میری خوشی میں خوش ہوں تب میں اس رشتے کی شروعات کروں، میں اپنے بڑوں کی رضا اور خوشی کے بغیر اپنی اس نئی زندگی کی شروعات نہیں کر سکتی، مجھے ڈر لگتا ہے ماما وہ آپ کو دل سے تسلیم نہیں کرتیں اس لئے مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ سب کچھ.....“ بے اختیار ہی اپنے دل کا خوف اس کی زبان پر چلا آیا تھا، تب ہی دھیرے دھیرے اسے تمام حکایت دل اس نے سنا ڈالی۔ جس دن سے وہ لوگ ایک چھت تے رہنے لگے تھے یہ پہلی بار تھا کہ وہ اپنے ”حق و فرض“ پر باقاعدہ بات کر رہے تھے، فرائز کی بڑھتی بے قرار یوں پر بند باندھنا جب منال کو مشکل لگنے لگا تو وہ اس سے دانستہ بات کرنے چلی آئی دوسری طرف اس کی تمام بات سن کر وہ دل ہی دل میں اس کی سوچ اور خواہش سے بہت متاثر ہوا تھا۔

”اوکے میری جان میں اس وقت خوشدلی سے انتظار کروں گا۔“ فرائز نے دھیرے سے اس کے ہاتھ لیوں تک لے جاتے ہوئے اور پھر اپنے یقین کی مہر اس کے ہاتھ کی پشت ثبت کرتا وہ چائے کی جانب متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

ریاض احمد جس وقت آفس سے گھر جا رہے تھے ان کے موبائل پر فرائز کی کال آئی تھی۔

”ہیلو چچا جان اس وقت آپ کہاں ہیں۔“ رسمی سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا۔ ”اس وقت تو میں گھر جا رہا ہوں لیکن بتاؤ، سب خیریت ہے نا۔“ انہوں نے جواب

دیا۔

”جی بالکل خیریت ہے وہ اچھولی میں نے تمام انفارمیشن جمع کر لی ہیں اس لئے جب آپ مناسب سمجھیں اس لڑکی سے مل لیجئے گا، انڈریس میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ فرائز نے تفصیل سے انہیں آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے فرائز، اس وقت تو میں گھر جا رہا ہوں کیونکہ مجھے کافی ٹھکن محسوس ہو رہی ہے اس لئے پھر کسی دن میں اس لڑکی سے مل لوں گا۔“ وہ دونوں اس وقت بہم سے انداز میں بات چیت کر رہے تھے۔

”چلیں ٹھیک ہے، جیسے آپ کو بہتر لگتا ہے کر لیں، اب باقی کا معاملہ آپ کس طرح ہینڈل کرتے ہیں یہ آپ پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔“ فرائز نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر فون بند کرنے سے قبل بولا۔

”بی بریو انکل، آپ کا یہ بیٹا آپ کے ساتھ ہے اس لئے جب بھی میری ضرورت پڑے، بلا جھجک مجھے آواز دے لیجئے گا اوکے بائے۔“ مضبوط لہجے میں انہیں اپنے بھرپور ساتھ کا یقین بخشنا فون بند کر گیا تھا۔

گھر میں داخل ہوئے ریاض احمد نے نوٹ کر لیا تھا کہ آج یقیناً ثریا بیگم کا موڈ آف ہے وجہ کیا تھی اس آف موڈ کی اس سے وہ فطری نا آشنا تھا، اگرچہ کہ تھکاوٹ کے سبب وہ آج جلدی گھر آ گئے تھے کہ کچھ دیر ریست کرنے سے شاید ان کی طبیعت بہتر ہو جائے مگر گھر آنے کے بعد انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ جلدی گھر آ کر ان کی طبیعت بہتر ہونے کی بجائے مزید خراب ضرور ہو جائے گی۔

”کیا بات ہے ثریا بیگم لگتا ہے کہ آج تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ اپنے طور پر انہوں نے اس کا نوڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی

تھی۔

”میری طبیعت کے ٹھیک ہونے یا نہ ہونے کی تمہیں کیوں پرواہ ہونے لگی، تم تو اپنی ہی دنیا میں مگن رہو، تمہاری بلا سے اس گھر میں کچھ ہو یا مجھے کچھ ہو تمہیں کیا۔“ وہ غصے سے پھرے لہجے میں بولیں۔

”اب کیا ہو گیا ہے تمہیں یا پھر یہ ہی بتا دو کہ اس گھر کو کیا ہو گیا ہے۔“ سابقہ انداز میں انہوں نے پوچھا۔

”مجھے یا اس گھر کو جو کچھ بھی ہوا ہے، اس کے لئے تمہیں پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم تو وہ انسان ہو جو سانپ کے گزرنے کے بعد لکیر کو پینٹا تو دور کی بات اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا، دوسرے لفظوں میں تمہاری نظر میں نہ تو سانپ کی اہمیت ہے اور نہ لکیر کی۔“ غصے سے دانت پیستے ہوئے انہوں نے کہا، ان کا اشارہ جس بات کی طرف تھا ریاض احمد اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

”ثریا بیگم بعض اوقات ہماری نظروں کو دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے، سانپ کے بجائے وہ لکیر کسی رسی کی بھی تو ہو سکتی ہے پھر اس لکیر کو پیٹ پیٹ کر اپنا وقت ضائع کیوں کریں۔“ ریاض احمد سادہ سے انداز میں بہت گہری بات کر گئے تھے اور ان کی اس گہری بات نے جلتی پرتیل کا کام کیا تھا کہ وہ بے اختیار بھڑک اٹھیں۔

”تم..... تم ریاض احمد نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہو، تمہارا جھجکا تمہارے دروازے پر تمہاری عزت کی دھجیاں بکھیرنے کے لئے پولیس کو لے کر آ گیا مگر تم یہ کوئی اثر نہ ہوا۔“

”تو کیا کرتا میں، منال اس کی شرعی بیوی تھی۔“ یہ جیسے ہی دی گئی اہمیت ہی تھی کہ وہ آج پہلی بار اس کی طرف داری میں بولے تھے۔

”ہاں یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو، منال اس

کی شری بیوی ہی تو تھی پھر میری کیوں عقل ماری گئی تھی جو میں تم سے یہ آس لگا بیٹھی تھی کہ اس ٹٹ پونجیے سے منال کو طلاق دوانے میں تم میرا ساتھ دو گے۔ میں یہ بات کیوں بھول گئی تھی کہ تمہاری اماں نے یہ رشتہ جوڑا ہی تمہاری رضا مندی سے تھا پھر تم کیوں اس رشتے کو توڑنے میں میرا ساتھ دو گے، پاگل تھی نا میں جو اپنی بیٹی کی بھلائی کے لئے کنویں کے ان مینڈکوں سے رشتہ توڑ کر اپنے لینڈ لارڈ بیٹے سے جوڑنے چلی تھی، ارے مت مار دی گئی تھی میری، جو تم سے اور تمہارے خاندان سے رشتہ جوڑ بیٹھی اسی لئے..... اسی لئے اپنی بیٹی کو ان لنگھوں سے دور رکھنا چاہتی تھی میں اور وہ شاید..... شاید کتنا چاہتا تھا منال کو، اپنی ساری دولت جائیداد منال کے نام کرنا چاہتا تھا مگر تمہاری بیٹی، وہ تو میرے منہ پر کا لک مل کر یہ جاوہ جا ہوئی۔“ ثریا بیگم حسب عادت جو منہ میں آ رہا تھا بولے چلی جا رہی تھیں، بات کا بنگلہ بنانا کوئی ان سے سیکھتا۔

”یہ بھی شکر ہے کہ تمہاری بیٹی کی اصلیت ہم رکھ ل گئی ورنہ میں زور زبردستی سے اسے طلاق دلوں گا شاید سے بیاہ دیتی تو کتنا بڑا دھوکا ہوتا میرے بیٹے کے ساتھ۔“ وہ مزید گل افشائیاں کرتیں بے اختیار ریاض احمد سچ اٹھے۔

”بس ثریا بیگم بس، میری بیٹی کی اصلیت کھلنے پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اگر پریشان ہونا ہی ہے تو اپنے بیٹے کی اصلیت کھلنے پر پریشان ہونا جو دوسروں کو دھوکا دینا جانتا ہے وہ خود کسے کسی کے دھوکے کا شکار ہو سکتا ہے اور اگر اپنے بیٹے کی اصلیت جاننا چاہتی ہو تو آؤ میرے ساتھ، تمہاری روز کی فضول بکواس سننے بہتر ہے کہ میں تمہیں حقیقت دکھا اور بتا ہی دوں تو بہتر ہے، چلو آؤ میرے ساتھ۔“ میز پر سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے ریاض احمد نے دو ٹوک انداز

میں کہا، دوسری طرف ریاض احمد کے تور اور انداز دیکھ کر ثریا بیگم ایکدم سکتے میں آ گئی تھیں، انہوں نے بھی ثریا بیگم سے اوچی آواز میں بات نہ کی تھی اور بلکہ ثریا بیگم نے بھی انہیں اوچی آواز میں بات کرنے ہی نہ دی تھی پھر آج آج انہیں کیا ہو گیا تھا۔

”ثریا بیگم چلو میرے ساتھ۔“ انہوں نے اسی مضبوط لہجے کے ساتھ کہا اور پھر اس کا بازو کھینچتے ہوئے باہر لے گئے، وہ بھی سکتے کی کیفیت میں ان ساتھ چلتی چلی گئیں۔

”یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔“ ایک فلیٹ کے دروازے کے سامنے وہ رکے تھے جب ثریا بیگم نے کہا، جبکہ ریاض احمد اس کی بات کو نظر انداز کرتے دروازے کو ناک کرنے آگے بڑھے تھے۔

”کون؟“ اندر سے آواز آئی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔

”جی فرمائیے۔“ جدیر تراش کے کپڑے پہنے اندر سے ایک لڑکی برآمد ہوئی تھی اپنے سر پہ دو اجنبیوں کو کھڑا دیکھ کر اس نے نہایت شائستگی سے پوچھا۔

”وہ بیٹا کیا ہم اندر آ سکتے ہیں، اکیچو کی ہم یہاں آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں، آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی اس لئے۔“ ریاض احمد نے وضاحت آمیز انداز میں کہا۔

”جی آئیے۔“ دروازے سے سائیڈ پر ہوتے ہوئے اس لڑکی نے کہا۔

”بیٹا وہ مجھے آپ کے شوہر شاید کاظمی سے بات کرنی تھی، اگر وہ اس وقت گھر پر ہیں تو۔“ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد فراز احمد نے کہا، ثریا بیگم اس تمام عرصے میں خاموش بت کا کردار ادا کر رہی تھیں مگر جب ریاض احمد نے ان کے بیٹے شاید کاظمی کا نام لیا تو وہ بے اختیار چونک کر

ریاض احمد کی جانب متوجہ ہوئی تھیں دوسری طرف ریاض احمد بھی اس کا چونکا محسوس کر چکے تھے تب ہی نظروں ہی نظروں میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”شاید کاظمی اب میرے شوہر نہیں رہے اس لئے آپ۔“ جواب دیتے سے اس لڑکی کی آواز ایکدم سے بھرا گئی تھی۔

”کیا مطلب بیٹا ابھی کل تک تو۔“ لڑکی کا جواب ریاض احمد کے لئے بالکل غیر متوقع تھا، تب ہی بے اختیار چونکتے ہوئے بولے۔

”جی کل تک میں ان کی بیوی ہی تھی مگر آج صبح انہوں نے مجھے طلاق دے دی ہے۔“ اپنے آنسو ضبط کرتی وہ بہ مشکل بولی تھی، شاید یہ اس دکھ کی شدت ہی تھی جو اس نے کسی قسم کی کوئی بات ان سے نہ چھپائی تھی۔

”نت نئی لڑکیوں سے پیار کا جال بچھا کر خفیہ شادی کرنا اور پھر اسی خاموشی سے انہیں چھوڑ دینا شاید کاظمی کا مشغلہ ہے، کتنا سمجھا تھا مجھے میرے ماما پاپا نے مگر میں نے ان کی کوئی بات نہ سنی تھی، یہ ان کی بد دعائیں ہی ہیں کہ آج میرے ساتھ یہ کچھ ہوا۔“ آنسو پلکوں کی باڑھ توڑ کر اس کی آنکھوں کے دامن میں جذب ہو رہے تھے۔

”دیکھا ثریا بیگم، یہ معصوم لڑکی اس شاید کاظمی کی کل تک بیوی تھی جس سے تم اپنی بیٹی کو بنانے کے سنے دیکھ رہی تھیں اور آج اس نے اسے طلاق دے دی ہے یقیناً کوئی نیا شکار پھانس لیا ہو گا۔“ ریاض احمد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا، وہ یہاں ثریا بیگم کے بیٹے شاید کاظمی کی اصلیت خود ثریا بیگم پر کھولنے کے لئے اسے یہاں لے کر آئے تھے۔

”جھوٹ..... جھوٹ بولتی ہے یہ میرا بھتیجا ایسا نہیں ہو سکتا، وہ تو میری بیٹی منال سے شدید

محبت کرتا ہے۔“ تمام بات سن کر ثریا بیگم ہتھے سے ہی اکڑ گئی تھیں۔

”ایک منٹ آنٹی۔“ اس لڑکی نے اٹھتے ہوئے کہا، اپنے سامنے ہونے والی بات چیت سے اسے کسی حد تک توازنہ ہو چکا تھا کہ یہ مرد اور عورت اس کے پاس کس سلسلے میں آئے ہیں، اپنی زندگی تو وہ برباد کر چکی تھی کسی اور کی زندگی اگر وہ برباد ہونے سے بچا سکتی ہے تو اسے بچانی چاہیے اور اسی سوچ اور خیال کے تحت ہی وہ اٹھی تھی اور جب واپس ان کے سامنے آئی تو اس کے ہاتھ میں چند تصویریں تھیں۔

”یہ دیکھیں کیا آپ اس شخص کی بات کر رہی ہیں۔“ تصویر ان کے سامنے کرتے ہوئے اس لڑکی نے کہا۔

”ہاں یہ تصویر تو شاید کی ہے اور یہ اس کے قریب بیٹھی لڑکی تم۔“ تصویر پر نظر ڈالتے ہی ثریا بیگم کو زبردست شاک لگا تھا، جس بیٹے کی شان میں وہ ہر وقت زمین آسمان کے قلابے ملائی رہتی تھیں وہ بڑی شان سے اس لڑکی کے بے حد قریب کھڑا مسکرا رہا تھا اور پھر اس لڑکی نے اسی طرح کی مزید کئی تصاویر ان کے سامنے رکھیں، اپنا نکاح نامہ اور طلاق نامہ بھی ثبوت کے طور پر انہیں دکھایا۔

”میں جس وقت اس راستے پر شاید کے ساتھ چل رہی تھی اس وقت میں یہ نہیں کہتی کہ مجھے کوئی سچائی بتانے والا نہ تھا، خود شاید کی پہلی بیوی سے میں ملی تھی، شاید نے اس وقت کئی طرح کے بہانے بنائے تھے، یہ کہ اس کے ماں باپ نے زبردستی اس کی شادی اس لڑکی سے کروادی وہ اس لڑکی کو پسند نہیں کرتا اور یہ کہ وہ محبت تو صرف اور صرف مجھ سے کرتا ہے، اس طرح کے نجانے کتنے بہانے بنائے تھے اس نے اور میں بھی اس کے خوبصورت لفظوں کے جال میں

بھنتی چلی گئی تھی تب ہی تو نہ عقل آئی اور نہ شعور نہ ماں باپ کی عزت کی فکر کی اور نہ سماج کے رویوں اور باتوں کی پرواہ کرے گی، بالآخر ایک دن میرے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو مجھ سے پہلی لڑکی کے ساتھ اس نے کیا تھا وہ ایک دل بھینک امیر عاشق ہے، لڑکیوں کے جذبات سے ٹھیلنے میں بڑا ماہر ہے وہ بچانے لگتی لڑکیوں کی زندگیاں اس طرح تباہ کر چکا ہوگا۔ ”وہ لڑکی جب بولنے پر آئی تو تمام باتیں کھولتی چلی گئی، سحائی اس کے لہجے سے عیاں تھی اور یہ سب دیکھ کر ثریا بیگم تو مارے صدمے کے کچھ بول ہی نہ پاری تھیں۔

”آئی ایم سوری بیٹا، ہم لوگوں نے آکر آپ کا دکھ ہر اک دیا، بٹ ٹھیکس کہ آپ نے ہماری آنکھوں پر بندھا پردہ اتار کر حقیقت تک ہماری رسائی کی۔“ ریاض احمد نے اٹھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر باہر نکل گیا، ثریا بیگم بھی نادمی ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔

☆☆☆

اپنے گھر کے گیٹ پر گاڑی روکتے ہوئے ریاض احمد نے خاموش کم صدمہ نادمی بیٹھی ثریا بیگم پر ایک گہری نظر ڈالی تھی۔

”ثریا بیگم میری بیٹی نے خود پر ہر خوشی حرام کی ہوئی ہے صرف اس لئے کہ اس کی ماں اس سے ناراض ہے۔“ ریاض احمد بولنا شروع ہوئے۔

”تمام حقیقت سے واقف ہونے کے بعد کیا اب بھی تم یہی کہو گی کہ فراز نے کوئی غلط قدم اٹھایا ہے، تمہیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے ثریا بیگم کہ اس نے تمہاری بیٹی کی زندگی برباد ہونے سے بچا دی ہے، حقیقی محبت کرنے والا شوہر تمہاری بیٹی کے نصیب میں لکھ دیا ہے اس نے، ورنہ تمہاری دھکیوں کے بعد منال کو طلاق دینا فراز کے لئے کون سا مشکل تھا مگر نہیں وہ منال سے

جی محبت کرتا تھا تب ہی اس نے منال کے حصول کے لئے ایک غلط قدم اٹھایا جسے بنیاد بنا کر تم نے..... خیر چھوڑ دو یہ باتیں اور یہ بتاؤ کہ اگر تم اپنی سابقہ غلطیوں پر شرمندہ ہو تو میرے ساتھ بلا جھجک اپنی بیٹی کو ملنے جاسکتی ہو یاں اگر تمہیں اسے کیے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے تو بے شک اتر کر اپنے گھر چلی جاؤ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

ریاض احمد نے فیصلہ ان پر چھوڑ دیا اور خوان کے فیصلے کے انتظار میں گاڑی سے باہر دیکھنے لگے، کچھ دیر تک تو انہوں نے ثریا بیگم کے اترنے کا انتظار کیا، مگر جب وہ اس طرح نادمی خاموش بیٹھی رہیں تو انہوں نے گاڑی بھائی کے گھر کی طرف بڑھا دی۔

ماں کے گلے سے لگی وہ کافی دیر تک روتی رہی تھی، بہت سارے گلے شکوے تھے، انجانے میں وہ اپنی بیٹی کی زندگی برباد کرنے چلی تھیں، وہ غفور و الرحیم جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔

”ارے یہ کیا بچا جان آپ تو کہہ رہے تھے کہ۔“ فراز جس وقت آفس سے گھر آیا سامنے کا منظر دیکھ کر حیرت کی شدت سے بولا۔

”بس بارہم دنیا میں ہر چیز کی پلاننگ تو کرتے رہتے ہیں مگر ہوتا وہی ہے جو ہمارے رب کو منظور ہوتا ہے۔“ انہوں نے نصرت جہاں اور ثریا بیگم کو آپس میں باتوں میں مصروف دیکھ کر کہا۔

”فراز بیٹا مجھے معاف کر دو، وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ کبھی کبھی بڑوں سے بھی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔“ ثریا بیگم نے فراز سے کہا۔

”چچی جان آپ میری بڑی ہیں بے شک میں آپ سے چھوٹا بیٹا مگر اس طرح مجھ سے معافی مانگ کر مجھے اس قدر چھوٹا مت کریں کہ میں خود سے بھی نظریں نہ ملا پاؤں۔“ فراز نے کھلے دل سے انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے کہا، بہت سے

گلے شکوؤں کے بعد ماحول ایک دم سے زبردست ہو گیا تھا۔

”بس بھیڑیا اور ریاض اب تم لوگ بھی پروگرام بنا لو، کیونکہ میرا تو عید کے بعد عمرہ پر جانے کا پکا پروگرام ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ دم دونوں بھی اللہ کے گھر کی زیارت کرنے چلو۔“ نصرت جہاں نے بڑے پن سے کہا۔

”ارے واہ بھابھی اس تو اچھی کوئی بات ہے ہی نہیں، کیونکہ بیگم، اس نیک کام میں تمہارا کیا خیال ہے۔“ ریاض احمد نے خوشدلی سے ثریا بیگم سے پوچھا۔

”جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔“ انہوں نے سب کچھ ان پر چھوڑ دیا۔

”تو ٹھیک ہے ریاض، ہم تینوں کے کاغذات کی تیاری کی ذمہ داری ہم لوگ فراز کے ذمہ لگا دیتے ہیں۔“ نصرت جہاں نے کہا اسی وقت ایک دم سے باہر شور مچا تھا۔

”لگتا ہے عیاض اور فراز بکری لے آئے ہیں چلو چل کر دیکھتے ہیں۔“ نصرت جہاں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا ہے عیاض اسے پیچھے کرو یہ..... یہ مجھے فکر مار دے گا۔“ منال چونکے بکری کے بڑے بڑے سیگوں سے ڈر رہی تھی اس لئے عیاض سے بولی۔

”واہ بھابھی آپ اس بے زبان بکری سے ڈر رہی ہیں، ارے ڈرنا ہے تو اپنے مجازی خدا سے ڈرا کریں۔“ وہ بھی چھیڑنے سے باز نہ آیا۔

”مجازی خدا سے تو بہت ڈرتی ہیں محترمہ، اب ہی تو وقت آیا ہے ان کا زردور کرنے کا کیوں جان فراز۔“ منال کے قریب کھڑے فراز نے آخری فقرہ ہلکی سی آواز میں صرف منال کو سنانے

کے لئے کہا۔

دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائی تھیں فراز کی گہری بولتی نظریں جیسے اسے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے جبکہ منال کی نظروں میں میٹھا میٹھا سا خوف تھا، کچھ دور کھڑی ثریا بیگم ان دونوں کو ایک دوسرے میں کھوئے دیکھ کر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

☆☆☆

اتا کی قید سے نکلے مقابلہ تو کرے وہ میرا ساتھ نبھانے کا حوصلہ تو کرے کبھی نہ ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے ”امی! وہ میں منال کو شاپنگ پر اپنے ساتھ لے جاؤں۔“ نصرت جہاں اپنا جیولری باکس کھولے بیٹھی تھیں جب فراز ان کے پاس آیا اور آتے ہی اپنے دل کی خواہش بیان کی۔

”ہاں ہاں بیٹا کیوں نہیں، میں ابھی بلاتی ہوں منال کو..... منال..... منال بیٹا کہاں ہو تم۔“ انہوں نے اس جواب دینے کے ساتھ ہی منال کو آواز دے ڈالی۔

”جی بڑی ماما، آپ نے مجھے بلایا ہے۔“ اگلے ہی لمحوں براؤن گرم سوٹ پہنے منال ان کے سامنے تھی، چونکہ کچن سے آئی تھی اس لئے ہاتھ آٹے سے بھرے ہوئے تھے۔

”بیٹا فراز تمہیں اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جانا چاہتا ہے، اس لئے کچن کا کام ختم کر لے گئی اور تم تیار ہو کر اس کے ساتھ چلی جاؤ۔“

”لیکن بڑی ماما، میں نے تو اپنی عید کی تمام شاپنگ حنا کے ساتھ جا کر مکمل کر لی ہے اس لئے مجھے تو کوئی شاپنگ نہیں کرنی۔“ سامنے بیٹھے فراز کی گہری نظروں سے پزل ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

”بیٹا خوش قسمت ہوتی ہیں وہ عورتیں جن

اور ایک ساتھ مریں گے۔“ موڈ بدستور شوخ ہو رہا تھا۔

”لیکن مجھے ابھی نہیں رنا، ابھی تو مجھے۔“ وہ بے اختیار ہی بولی تھی اور نبھانے مزید کیا کہنے جا رہی تھی کہ بے اختیار زبان دانتوں تلے دالی، فراز کا بھرپور جاندار ہتھپہہ گاڑی میں گونجا تھا جس پر وہ مزید پزل ہو گئی۔

”آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ اگلے ہی چل وہ غصے سے بولی اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

بانی کا سارا وقت وہ اسی طرح خاموش ہی رہی، فراز نے اپنی پسند سے جدید تراش کا بوتیک سٹائل کا شائنگ پنک کلر کا ڈریس لیا میچنگ کی چوڑیاں، جیولری، شووز، بیگ اور نبھانے کیا کچھ، وہ منال کو اپنے ساتھ لے کر ضرور گیا تھا مگر کسی چیز میں بھی اس نے منال کی رائے نہ پوچھی تھی، اپنی مرضی اور چوائس سے ہی وہ سب کچھ خریدتا رہا تھا اور اسے ایسا کرتے دیکھ کر منال سوچ رہی تھی کہ وہ اسے ساتھ کیوں لے کر آیا ہے جب سب کچھ ہی وہ اپنی مرضی سے خرید رہا تھا ہاں مگر دل ہی دل میں اس کی چوائس کی داد ضرور دے رہی تھی۔

☆☆☆

کل عید تھی ڈرائنگ روم میں منال، حنا اور عیاض کے ساتھ بیٹھی نہ صرف مہندی کے نقش و نگار پنا رہی تھی بلکہ دونوں آپس میں کہیں بھی لگا رہی تھیں، ساتھ ہی ساتھ فی وی پر چلنے والے پروگرام سے بھی وہ تینوں لطف اندوز ہو رہے تھے، ڈرائنگ فروٹ کی پلیٹ بھی قریب ہی پڑی تھی جس سے وہ سب لطف اندوز ہو رہے تھے، نصرت جہاں نے ریاض احمد اور ثریا بیگم کو بھی اپنے ہاں ہی روک لیا تھا، اس وقت سب بڑے اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے، اگر بے چین تھا تو صرف فراز احمد جو اپنے کمرے میں

کے شوہران کی خریداری میں دلچسپی رکھتے ہیں، پہلے تم نے جو کچھ بھی خریدا تھا اپنی مرضی سے خریدا تھا اب کچھ خریداری فراز کی مرضی سے بھی کر لو، جاؤ شایاں جلدی سے تیار ہو کر آؤ، کل عید ہے پھر باقی کی تیاریاں بھی کرنی ہے۔“ انہوں نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بڑی ماما، پھر میں تنہا کو اپنے ساتھ لے لیتی ہوں، وہ ایجنٹ کی اس کی چوائس بہت اچھی ہے اس لئے میں۔“

”چوائس تو میرے بیٹے کی بھی زبردست ہے، تم ایک بار اس کے ساتھ جا کر اعتبار کر۔ کہ تو دیکھو۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”جاؤ جلدی سے تیار ہو کر آؤ۔“ تب وہ مڑتے کیا نہ کرتے کے مصداق تیار ہونے چل دی۔

☆☆☆

”ہاں تو میری جان، کب تک تمہارے ساتھ کوئی نہ کوئی دم چھلہ لگا کر پھر وہی بھی نہ بھی تو میرے ہاتھ آؤ گی ہی وہ کیا کہتے ہیں کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے فراز نے بھرپور شرارت سے کہا۔

”آپ مجھے بکرا کہہ رہے ہیں۔“ منال نے غصے سے پوچھا۔

”نہیں میں تمہیں بکرے کی ماں کہہ رہا ہوں کیوں میرا دیا گیا یہ نام پسند نہیں آیا تو چلو پھر جان فراز کہہ لیتے ہیں۔“ وہ شوخ موڈ میں بات سے بات نکال رہا تھا، اس کی توجہ ڈرائیونگ کی جانب کم اور منال کی جانب زیادہ تھی۔

”آگے دیکھ کر گاڑی چلائیں کیوں مردائیں گے۔“ اس نے فراز کی توجہ وٹڈ سکریں کی جانب کروانا چاہی تھی۔

”اچھا ہے نا جان فراز ایک ساتھ جنیں گے

بے چینی سے ٹہلتا اپنی نصف بہتر کا انتظار کر رہا تھا مگر اس کا انتظار تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہ آ رہا تھا اور جب اس کی برداشت جواب دینے لگی تو وہ ڈرائنگ روم میں چلا آیا، عیاض کی کسی بات پر وہ دونوں بے ساختہ ہنس رہی تھیں، منال کو یوں لا پرواہی سے طویل نشست جمائے دیکھ کر اسے بے پناہ غصہ آیا تھا۔

”کیا بات ہے تم لوگوں نے آج سونا نہیں ہے کیا۔“ ان کے سر پر کھڑا وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”ارے بھائی آج بھی کوئی سونے کی رات ہے، عید کی تیاری موج مستی، ہلا گلا سب لوگ چاند رات اسی طرح مناتے ہیں آئیں آپ بھی نہیں جوان کر لیں۔“ ٹی وی پر چلتے میوزک پر ناٹکوں کو مسلسل ہلاتے ہوئے عیاض نے جواب دیا۔

”ویسے بھیا میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ عید کے بعد ہم ایک پارٹی رکھیں، آپ کا ولیہ بھی ہو جائے گا اور عید من پارتی بھی، کیوں کیا خیال ہے۔“ فراز کا جواب سنے بغیر عیاض دوبارہ شروع ہو گیا۔

”پھر کیا خیال ہے بھائی۔“ وہ ایک بار پھر متوجہ ہوا۔

”تم اپنے نادر خیالات اپنے پاس ہی رکھو، رات اتنی دیر تک جاگتے رہتے ہو اور پھر صبح اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے ہو۔“ فراز نے چڑ کر کہا۔

”ویسے بھائی میرے رات اتنی دیر تک سونے والی عادت نہیں آج آپ کو پریشان تو نہیں کر رہی۔“ وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔

”کیوں تمہارے بستر پر میں سونا ہے کیا، میری بلا سے تم رات دیر سے سو یا جلدی لیکن صبح جلدی ضرور اٹھا کرو۔“ فراز نے لہجہ کو نارمل بناتے ہوئے کہا۔

”اچھا جاؤ مجھے پانی پلاؤ۔“ پانی پی کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”بھائی بیٹھیں نا آپ، اتنا حرہ آ رہا ہے ہمیں۔“ اس کے اٹھنے پر جتنا روکا۔

”نہیں حنا، اس وقت مجھے بہت سخت نیند آ رہی ہے۔“ گہری ناراض نظر منال پر ڈالتا وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

کافی دیر بعد جب وہ کمرے میں داخل ہوئی فراز اگرچہ کہ جاگ رہا تھا مگر اس خیال سے سونے کی ایکٹنگ کرنے لگا کہ وہ اپنے لئے منال کی پیش رفت دیکھنا چاہتا تھا مگر جب منال اسی طرح صوفے پر جا کر خاموشی سے لیٹ گئی تو اس کے غصے کا گراف کئی گنا بڑھ گیا۔

☆☆☆

عید کا دن معمول کے مطابق مصروفیت لے کر آیا تھا، سوایاں کھا کر سب مرد تیار ہو کر عید کی نماز پڑھنے چلے گئے، خواتین گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہو گئیں منال بھی اپنے ذمے لگے تمام کام نپا کر تیار ہونے اپنے کمرے میں آئی تھی، عید کے لئے اپنے خریدے گئے کپڑے نکالے تو اس نے پہننے کے لئے مگر پھر فراز کی برہمی کا سوچ کر اس نے واپس رکھ دیئے اور فراز کے خریدے گئے کپڑے نکال لئے بہت دل لگا کر وہ تیار ہوئی تھی، جانتی تھی کہ اس کا موڈ آف ہے۔

فراز عید کی نماز پڑھ کر آیا تو سب سے عید ملنے کے بعد اپنا موبائل لینے جب اپنے کمرے میں آیا تو سامنے اتنی جگہ سے تیار منال کو دیکھ کر چہرہ ان رہ گیا، مکمل دلہن کے روپ میں لگ رہی تھی وہ، اس کے لائے ہوئے ڈریس کے ساتھ میچنگ کی چوڑیاں ڈالے اس کی شان ہی نرالی لگ رہی تھی، خوشگوار حیرت میں گھرا وہ اس کے قریب آیا تھا، سارا غصہ اور ناراضگی اسے اس

طرح تیار دیکھ کر اڑن چھو ہوئی تھی، جب سے وہ یہاں آئی تھی کبھی اس طرح سے تیار نہ ہوئی تھی مگر آج اس کی تیاری دیکھ کر فراز کو خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

”جان فراز یہ تم ہی ہونا۔“ اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے فراز نے کہا۔

”تھینک یو، تھینک یو سوچ کہ تم نے آج کے دن میرا لایا ہوا ڈریس پہنا۔“ بھاری لمبیر لہجہ میں کہتا وہ اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔

”لیکن اس کا دوپٹا اتنا بھاری ہے کہ سر پر ٹک ہی نہیں رہا۔“ اس کے ہاتھوں کی حرارت اور نظروں کی چمک سے گھبراتے ہوئے اس نے بہ مشکل اتمام کہا۔

”آج صرف ہماری خاطر اس گستاخ دوپٹے کی گستاخی کو معاف کر کے وہ سنو جو میں کہوں گا اس کے علاوہ کچھ مت سوچو۔“ اس کے سانیوں کی پیش منال کو اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی اور اس کے بھاری لمبیر لہجے کی لمبیرتا نے اس کے دل کی دنیا کو اٹھل پھل کر دیا تھا، فراز کی سادی راہیں فراز نے مسترد کر دی تھیں۔

”اچھا لائیں پہلے میری عیدی دیں۔“ منال نے اس کی توجہ خود پر سے ہٹانے کی خاطر کہا، گلابی حنائی تھیلی اس کے سامنے تھی جسے تھامتے میں فراز نے ذرا دیر نہ کی۔

”جان فراز یہ بندہ پورے کا پورا تمہارا ہے اس کے بعد تو کچھ بچتا ہی نہیں ہے دینے کے لئے۔“ فراز نے یونی اس کا ہاتھ تھامے ہوئے کہا۔

”جانتی ہوں لیکن ابھی مجھے عیدی چاہیے اور بس۔“ لہجہ کو مضبوط بناتے ہوئے اس نے اپنا سابقہ مطالبہ دہرایا۔

”بیگم منال فراز احمد پہلی بات تو یہ کہ یہ عید عیدی بانٹنے کے لئے نہیں بلکہ گوشت بانٹنے کی

ہے اور دوسری بات چلو میں تمہاری بات مان کر تمہیں عیدی دوں گا مگر پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیا دو گی عیدی میں۔“ اپنا حق مانگتی منال کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا، لہجہ اور انداز میں حد درجہ شوخی و شرارت تھی۔

”میں..... میں آپ کو کیا دوں گی، میرے پاس تو فی الحال کچھ بھی نہیں ہے۔“ فراز کی اس عجیب و غریب فرمائش پر وہ حیرت سے بولی۔

”ہے نا اگر تم دینا چاہو۔“

”کیا؟“ دھڑکتے دل کے ساتھ منال نے پوچھا۔

”ان چمکتی آنکھوں کی مستی دے دو، ان گلابی گالوں کی لالی اور ان نرم لبوں کی نرمی مجھے دے دو۔“ اس پر جھٹکتے ہوئے فراز کہہ رہا تھا، جذیوں نے گندھا لہجہ منال کے ارگرد خطرے کی گھنٹی بجارہا تھا تب ہی تو اس نے اسے دھکا دے کر بیڈ پر گر لایا تھا اور خود کمرے سے بھاگ جانے کا ارادہ تھا مگر برا ہوا کہ فراز نے اپنے ہاتھ میں تھامے منال کے ہاتھ کو ہلکے سے جھٹکا دے کر اسے بھی خود پر گر لایا۔

پیار کے نرالی کھیل کی شروعات ہو چکی تھی، جس میں وفا اعتبار اور مٹھاس شامل تھی، عید سعید کے اس پر سرت موقع پر ان کا ملن قدرت کی کرشمہ بانی ہی تو تھا۔

☆☆☆

تم آخری جزیرہ ہو

ام مریم

پہلی قسط کا خلاصہ

یہ کہانی شاہ ہاؤس کے مکینوں کے گرد گھومتی ہے، معاذ بے حد صاف گوشہ اور ہر قسم کے اظہار کے معاملے میں بے باک سمجھا جاتا ہے، دوسری جانب جہانگیر یعنی جہان ہے جس سے معاذ کی سب سے زیادہ بے تکلفی محبت اور دوستی کا رشتہ ہے مگر جہان ہر لحاظ سے اس سے برعکس ہے، سنجیدگی متانت اور گریز کے علاوہ لحاظ اور فرمانبرداری اس کی شخصیت کے رنگ ہیں، وہ زینب شاہ کو دل کی تمام گہرائیوں سے چاہنے کے باوجود اظہار کرنے سے گریز اس کے انا ہی نہیں ٹھکرائے جانے کا انجانا سا خوف بھی ہے، زینب، بیور خان کو پسند کرتی ہے مگر جہان کے دل کا راز جاننے کو بھی بے تاب نظر آیا کرتی ہے اس کا مقصد صرف جہان کی کمزوری کو پانا ہے۔

نور یہ، معاذ کی چھپی زاد ہے اور معاذ سے محبت کرتی ہے اس کی اس راز سے زینب کو آگاہی ہوتی ہے تو وہ اسے معاذ سے اظہار یہ آسانی ہے مگر نور یہ اس حق میں نہیں وہ مناسب وقت کی منتظر ہے جب معاذ خود اسے اس کی محبت سمیت قبول کرے۔

ذینب الرحمن، احسان شاہ کے والد کے دوست ہیں جن کا تعلق پاکستان کے قیام سے پہلے سے بندھا ہوا ہے اٹکوتے بیٹے اور بہو کی وفات کے بعد ذینب الرحمن، نواب شاہ کے ایک دوا افتادہ گاؤں میں اپنی پوتی کے ساتھ رہائش پذیر ہیں شدید بیماری کی حالت میں ذینب الرحمن، احسان شاہ سے رابطہ کرتے ہیں اور پر نیاں کے لئے تشویش کا اظہار کرتے ہیں، احسان شاہ ان کی ان ہی بات کا بھرم رکھتے ہوئے پر نیاں کا نکاح معاذ سے کرنا چاہتے ہیں مگر معاذ یہ سنتے ہی انکار کر دیتا۔

دوسری قسط

اب آپ آگے پڑھیے



اس کا دماغ صحیح معنوں میں بھک سے اڑ گیا تھا، اسے لگا تھا وہ اس کھلی بلیک میلنگ اور دھاندلی پہ اپنی جگہ سے حرکت تک کرنے کے قابل نہیں رہا ہے، مگر نہیں یہ غلط تھا اس کے احساسات جتنے بھی شاید تھے مگر پیا کی حرکت نے اسے لمحے کے ہزاروں حصے میں حرکت کرنے اور پھر انہیں اس جذباتی ایکشن سے باز رکھنے پہ بھی اکسلیا تھا، وہ بھی اس بلیک میلنگ میں قابو کر لیا گیا تھا، اس جیسا سرکش اور افسر ہوا کھوڑا جو اس سے پہلے بھی کسی کے قابو میں نہیں آیا تھا۔

”ٹھیک ہے پیا میں آپ کی بات ماننے کو تیار ہوں لیکن آپ اس طرح نہیں کریں گے۔“ ان کی ریوالتوری کی بلیکی پہ دھری انگلی کی سخت گرفت سے احتیاط سے ریوالتور نکالتے ہوئے اس کے سبجے میں کتنی بے بسی کس درجہ شکست کا رنگ اتر اٹھا اس پہ دھیان دینے کی فرصت فی الحال پیا کے پاس نہیں تھی وہ تو گویا صرف اور صرف عہد کی پاسداری کے پابند تھے بس، اس کی بات سن کر انہوں نے قدرے چونک کر مگر بغور اسے دیکھا۔

”تم سچی کہہ رہے ہو؟“ ان کے سبجے میں جو ترنگ جو خوشی یکبارگی اتری اس نے معاذ کے ہونٹوں کو باہم جتنی سے جتنی ڈالا۔

”آپ کو یاد ہو تو میں بھی جھوٹ اور غلط بیانی سے کام نہیں لیا کرتا۔“ وہ تلخ اکھڑے ہوئے تیز لہجے میں جتلا کر بولا تھا، مگر پیا اس کے انداز و لہجے پہ توجہ دیئے بنا اسے سمجھ کر اپنے گلے سے لگا کر بے تحاشا چوم کر بولے تھے۔

”آئی ایم شیور تم بہت خوش رہو گے۔“ اور ان کی بات کے جواب میں معاذ کے اندر دوڑنا زہر کچھ اور بھی بڑھنے لگا تھا۔

☆☆☆

ذرا پانے کی چاہت میں

بہت کچھ جھوٹ جاتا ہے

نہ جانے صبر کا دھاگہ

کہاں پر ٹوٹ جاتا ہے

کسے ہمارا ہی کہتے ہو یہاں تو اپنا سایہ بھی

کہیں پر ساتھ رہتا ہے کہیں پر دھک جاتا ہے

عجب تھے بے یہ رشتہ بھی

بہت مضبوط لگتا ہے

ذرا سی بھول سے لیکن بھروسہ ٹوٹ جاتا ہے

نکاح رات کے دوسرے حصے میں خاموشی اور سادگی سے کیا گیا تھا اور اگلی صبح وہ منہ اندھیرے ہی روانہ ہو گیا تھا، پیا نے حالانکہ اسے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ان سنی کیے نکل آیا دل و دماغ میں جیسے کوئی الاؤ دہک اٹھے تھے، اس کا بس چلتا تو رات کو ہی اس منحوس حویلی سے بھاگ جاتا جس نے اسے بے بسی اور بے وقفی کے ایسے احساس سے دوچار کیا تھا کہ وہ جیسے سرتاپا جل اٹھا تھا، دوران سفر بھی وہ کھٹیا اور سلگتا آیا تھا، اگرچہ پیا نے نکاح سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اسے فریق ڈلانی سے ملوانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ہرگز بھی آمادہ نہیں ہوا تھا، گاؤں کی جاہل گنوار لڑکیاں اسے بھی اچھی نہیں لگا کرتی تھیں اور شتم ظریفی یہ کہ اس کا نصیب انہی میں سے کسی

ایک لڑکی سے بھوڑ دیا گیا تھا، دل اتنا بھرا ہوا تھا کہ خود کسی کو چل رہا تھا، کوئی تک تھی بھلا؟ شہر کی ایک سے ایک مالدار طرہ دار اور فیشن ایبل خیمیں لڑکیاں اس کی پرسکش وجہ پر سناٹائی کی وجہ سے اس کی جانب متوجہ ہوتی رہی تھی مگر اس نے بھی کسی کو لپک حد سے زیادہ لفٹ نہیں دی تھی اور اس کے ساتھ جسے منسوب کیا تھا وہ..... اس کا سر کوفت اور کٹی سے پھٹنے لگا، جی چاہا ہر شے کو بس نہیں کر ڈالے۔

”بھائی! کیا کہاں ہیں؟ آپ اکیلے آئے ہیں؟“ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو کر وہ ناک کی سیدھ میں اپنے کمرے کی جانب آندھی طوفان کی طرح سے بڑھ رہا تھا جب ماریہ جانے کہاں سے نکل کر اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور گویا اپنی شامت کو آواز دی، معاذ نے اس کا گوارہ مداخلت پہ قہر پار نظروں سے اسے محض ایک نظر گھورا تھا اور پیر پٹٹا ہوا آگے بڑھ گیا، ماریہ کی فو گویا روح فنا ہو گئی تھی، وہ اپنے کمرے میں گھسا تو پیچھے دروازہ اتنی زوردار آواز سے بند کیا کہ آواز کم و بیش پورے گھر میں گونجی تھی۔

”یا الہی خیر! کیا زلزلہ آ گیا ہے؟“ زینب بچن سے نکل کر بھاگ آئی، سوال سہمی ہوئی ماریہ سے ہوا تھا۔

”زلزلہ نہیں معاذ بھائی آئے ہیں، یہ نہیں کیوں موڈ بے حد خراب لگ رہا تھا میں تو صرف پیا کا پوچھا جوابا ایسی نظروں سے گورا کہ مجھے لگا مگر جاؤں گی انہی۔“ وہ منمننا کر کہہ رہی تھی، زینب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”تم بھی ہمیشہ گدھی رہنا، موڈ دیکھ کر بات کیا کرونا، موصوف تو گاؤں گئے تھے نا، پیا نے بلوایا تھا، کوئی بات مزاج پر ہم کر گئی ہوگی شہنشاہ جذبات کا خیر تم فکر مت کرو، شام تک ٹھیک ہو جائیں گے۔“ زینب نے اسے تسلی دے کر رخصت کیا اور خود بچن میں آگئی، مگر تمام تو کیا رات تک بھی معاذ کا موڈ بحال نہیں ہوا نہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا تب سب کو فکر لاحق ہوئی تھی، پہلے زینب پھر ماما بھی جا کے وجہ پوچھتی رہیں مگر بند کمرے کے اندر سے ہنسی جھنجھکی کی آواز تو آتی رہتی مگر اس نے کسی بات کا جواب دینا گوارا نہیں کیا تھا ایسا اس سے پہلے بھی نہیں ہوا تھا ماما کے ساتھ ماما جان کی تشویش بھی یکجہت بڑھ گئی۔

”معاذ بیٹے کیا ہوا ہے، موڈ کیوں آف ہے کچھ بتائیں تو؟“ ماما جان۔ زخو آ کر دروازہ بجایا تھا ساتھ منہ مت ساجت بھی شروع کی۔

”مجھ سے نہیں اپنے دیور صاحب سے پوچھیں کیا چاند چڑھائے ہیں انہوں نے وہاں گاؤں میں۔“ اس کے جلے کئے جواب پہ جہاں ماما جان کا منہ ٹھٹھا ماما کا اتھ بے ساختہ ہول اٹھنے والے انداز میں دل تھام کے رہ گیا۔

”بچے کیا دانی تباہ! الہی! رہے ہو؟“ انہیں کیا سمجھ آئے گی دروازہ کھولو ڈھنگ سے بات کرو۔“ ماما جان نے کس نذر غفل اور حکم سے کہا تو کچھ توقف کے بعد چننی گرا دی تھی مٹی البتہ دروازہ اوپن نہیں کیا گیا تو وجہ ماما جان کے حکم کی خیال کے ساتھ اپنی غفلت کا اظہار بھی ضروری سمجھا گیا تھا، ماما نے تیزی سے دروازہ دھکیلا تو پہلے ندم پہ ہی چکر اکر رہ گئیں۔ رے کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں کا غبار اور! پھیلی ہوئی تھی، وہ بے ساختہ کھانسنے لگیں اور سرعت سے پہلے پورا دروازہ کھولا پھر آگے بڑھ کر پردے ہٹا کر کھڑکیاں کھولنے لگیں، اس کام سے فراغت کے بعد پائیں تو

”میں پریشان کر رہا ہوں اور جو مجھے پریشان کیا گیا، بلکہ بلیک میل کیا گیا وہ.....؟“
”جہاں نے چڑ کر جواب دیا تھا۔“

”انہوں نے دھوکے سے مجھے وہاں بلوایا اور باقاعدہ گن پوائنٹ پر اپنی کسی عزیزہ سے میرا نکاح بڑھو دیا ہے، جاہل گنوارسی کی خاتون سے، سن لیا تم نے؟ آگیا یقین کر وہ ایسا کر سکتے ہیں باقاعدہ گن پوائنٹ ہے۔“ وہ باقاعدہ بھنکارا تھا ایک ایک لفظ بے زور دے کر جبکہ جہان جیسا سیلف کنٹرول آدمی بھی اس انکشاف پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا، ماما اور ماما جان کی تو باقاعدہ سنائے میں آئی تھیں۔

☆☆☆

دل پہ ایسے بھی عذابوں کو اترتے دیکھا
ہم نے چپ چاپ اسے خود سے چھڑتے دیکھا
اس کو سوچا تو ہر سوچ میں خوشبو اتری
اس کو لکھا تو ہر لفظ مہکتے دیکھا
یاد آ جائے تو قابو نہیں رہتا دل پر
ورنہ دنیا نے بھی ہم کو تڑپتے دیکھا
اس کی صورت کو فقط آنکھ نہیں ترسی ہے
راستوں کو بھی اس کی یاد میں روتے دیکھا
ہم محبت کے لئے آج بھی دیوانے ہیں
یہ الگ بات کہ اس نے نہیں مڑ کے دیکھا

اس کے کمرے میں تبر جیسا گہرا اندھیرا تھا اور ویسا ہی سناٹا اور سنائے میں اس کی گھٹی گھٹی
سسکیاں گونجتی تھیں اور کمرے کے درود پوار سے لپٹ جاتی تھیں، معاً دروازہ آہستہ سے کھلا اور
روشنی کی بوھتی ہوئی درز نے کمرے کی تاریکی کو نگل لیا۔

”نوری..... نوری.....“ زینب نے آہستہ سے رکارا پھر پہلے سوچ بورڈ پہ ہاتھ مار کر لائیٹ
آن کی پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتی اس کے پاس چلی آئی، نوری کی پوزیشن میں فرق نہیں آیا تھا
البتہ سسکیاں گونجتی تھیں، زینب نے اپنا سبک گداز ہاتھ اس کے کاندھے پہ ہمدردی کے انداز میں
رکھا البتہ اسے قطعی سمجھ نہیں آ سکتی تھی سے نوری یہ کیا کہنا چاہے وہ اسی شش و پنج کا شکار تھی جب
نوری یہ ایک جھٹکے سے سدھتی ہوئی اور اس کے کاندھے سے لگ کر بے ساختہ بے اختیار رو روئی چلی
گئی، زینب پہلے بوکھلائی پھر آہستہ سے اسے تھکنے لگی تھی۔

”یہ کیا ہو گیا زینبی؟ یہ میری محبت پہ کیسا سانحہ آ کر گر گیا ہے، ابھی تو میں اس کے رنگوں سے
آشنائی بھی حاصل نہیں کر پائی تھی ابھی تو کسی ایک خوشی سے بھی اپنے دل کی کلی کو مہکتے نہیں دیکھا تھا
زینبی میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا آخر؟“

کبھی کر بنا کی لیسٹی ہو کر تھی اس کی آہ و بکا میں زینب اچھی خاصی مضبوط دل کی مالک ہونے
کے باوجود خود کو اس کے دکھ کے آگے ہارتا ہوا محسوس کرنے لگی۔

”پتہ نہیں بچا کو کیا سوچھی ہے یار، بھلا اس طرح بھی شادیاں ہوا کرتی ہیں آج کل، فریقین

ایک پل کو ششدر رہ گئیں۔
ہمیشہ کی طرح اس نے اپنا غصہ کمرے کی اشیاء پر نکالا تھا، کرٹل داز کار پٹ یہ کرچیوں کی
صورت ڈریسنگ کے آئینے کے ساتھ بکھرے پڑے تھے، وارڈروب کے دونوں پٹ کھلے تھے اور
کپڑے بے ترتیب ہو کر کچھ لنگ رہے تھے کچھ فرش پر بے ترتیب پڑے تھے دیگر سامان اشیاء کا
بھی حال اس سے مختلف نہیں تھا۔
”معاذ بیٹے اب آپ بچے نہیں رہے ہیں، کب چھوڑیں گے اپنی یہ حرکتیں؟“ ماما کے لہجے
میں ملال نہیں بے بسی تھی، وہ ہونٹ پیچھے کھڑا ہا، روٹھا روٹھا کھڑا کھڑا سا، ماما جان کو وہ اس پہ بے
ساختہ پیار آنے لگا۔
”سوال آپ مجھ سے کرنے کی بجائے اپنے شوہر نامدار سے کریں، وہ کسی فلم کے ہیرو نہیں
ہیں مگر حرکتیں.....“

”معاذ!..... واٹ نان سینس۔“ ممانے زور سے ڈانٹا مگر وہ خائف نہیں ہوا۔

”جو انہوں نے کیا وہ کسی سینس میں ٹھیک کیا؟“ وہ بھڑک اٹھا تھا۔

”کیا ہوا ہے کچھ بتائیں بھی؟“ ان کے سوال نے معاذ کا چہرہ پھر غصے کی زیادتی سے سرخ کر

دیا۔

”یہ آپ انہی سے پوچھیں ان کے کارنامے میں کیوں بتانے لگا۔“ وہ کس قدر بدتمیزی اور
زورٹھے پن سے بولا تو اب کی بار ماما جان نے اسے جھڑک دیا تھا۔

”یہ آپ احسان کے لئے کون سا لہجہ اور انداز استعمال کر رہے ہیں بات کرنے کے لئے
معاذ! باپ ہیں وہ آپ کے۔“ ان کے لہجے کی سخت تنبیہ نے معاذ کا خراب موڈ کچھ اور خراب کر دیا
تھا۔

”جو انہوں نے میرے ساتھ کیا ہے اس پہ میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔“ اب انہیں
اچھی طرح سے سمجھا دیجئے گا اور وہ جوان کی بہت چھٹیختی کھڑمہ ہیں نا اسے تو ساری عمر کے لئے سبق
سکھاؤں گا ایسا کہ یاد کرے گی، ساری زندگی شکل نہیں دیکھوں گا اس کی، آئے بڑے میری زندگی کا
فیصلہ کرنے والے۔“ وہ تنک کر بولا چلا گیا تھا اور جو الفاظ منہ سے نکالے تھے انہوں نے ماما اور ماما
جان کی اچھن تو بڑھائی ساتھ میں زینب و ماما سے صورت حال جان کر اسی سمت آتے جہان کے
قدموں کو بھی جکڑ لیا، تینوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ اور استفہامیہ لگا ہوں سے دیکھا تھا پھر ماما
جان اٹھ کر اس کی جانب آئی تھیں۔

”معاذ بیٹے کس کی بات کر رہے ہیں، کس کی شکل نہیں دیکھیں گے؟ وہاں گاؤں میں کیا ہوا
ہے آپ کے ساتھ؟“ اب کی مرتبہ ان کا لہجہ متعادل نرم اور پیار بھرا تھا، معاذ نے یونہی تھے ہوئے
نقوش سمیت چہرے کا رخ ان کی جانب پھیرا اور پریش لہجے میں بولا تھا۔

”آپ کو میرا لہجہ میرا انداز گستاخانہ لگ رہا ہے نا، مگر آپ کو کچھ چلے کہ پیانے میرے ساتھ
کیا کیا ہے تو.....؟“ اس نے ایک بار پھر بات ادھوری چھوڑی اور چچی پچی سانس سچ کر جیسے سر
جھٹکا اس انداز نے ان تینوں کو کچھ فکر مند کچھ حراساں کر ڈالا۔

”تم بولتے کیوں نہیں یار کیا ہوا ہے؟ کیوں پریشان کر رہے ہو؟“ جہان نے کس قدر خفگی
سے کہا تو وہ جیسے آگے سے پھٹ پڑا۔

کی پسند اور رضا مندی کتنی ضروری ہے یہ بات انہیں کون سمجھائے، خیر تم فکر نہ کرو میں تمہیں یہی بتانے آئی ہوں کہ بھائی پیا کے اس فیصلے سے بالکل بھی خوش نہیں ہیں اور انہوں نے باقاعدہ اعلان کیا ہے کہ وہ اس لڑکی کو بیوی کی حیثیت سے بھی قبول نہیں کریں گے۔ اس کی سلی و دلا سے نے نوریہ کے چہرے پہ اچھلال کے ساتھ بے بسی بھی بھیر دی جسے زینب نے واضح محسوس کیا اور پھر سلی کے انداز میں بولی تھی۔

”تمہارے اٹے ابھی سارے رستے بند نہیں ہوئے ہیں نوری! جب بھائی کی دلچسپی نہیں تو سمجھ لو اس رشتے کی اہمیت صفر ہے، وہ کیا کہتے ہیں کہ جو پیا من بھائے وہی سہاگن، رات پیا آئے تو ایک بار پھر ہنگامہ اٹھا تھا بھائی تو گھر سے بھاگ رہے تھے ماما اور ماما جان نے بیچ میں پڑ کے معاملہ سنبھالا، پیا کی اتنے بڑے ایکشن کے بعد کی خاموشی حیران کن ہے، اپنی دیر میں پھر تمہیں کہوں گی ہرٹ مت ہو ابھی کچھ بھی طے نہیں ہوا، بھائی ہرگز خوش نہیں ہیں اور ان کی ناپسندیدگی تمہاری خوشی کا باعث ہونا چاہیے، اب بس ہمت سے کام لیتا اور معاذ بھائی سے اپنی پسندیدگی کا اظہار ضرور کر دینا۔“ زینب نے اپنی بات مکمل کر کے اس کے تاثرات بھائی سے تو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کے چہرے پہ یہ ہنوز حزن و ملال کے رنگ تھے۔

”پارکیا ٹینشن ہے، موڈ تو ٹھیک کر دینا۔“
”میں بے حس ہوں نہ خود غرض زینبی کہ کسی کی بر بادی کو اپنی آبادی کا ذریعہ جان کر خوش ہو لوں گی۔“ اس کا جواب کم از کم زینب کو اوث پٹا لگ ہی لگا تھا اس نے گھور کر نوریہ کو دیکھا تھا۔
”داماغ درست ہے تمہارا؟ کیا کہتی رہی ہو؟“

”زینبی وہ ابھی ایک عورت ہے، میرے اور تمہارے جیسی جس کی زندگی کے فیصلے بنائے اور بگاڑے جارہے ہیں، کیا وہ احساسات اور جذبات نہیں رکھتی ہوگی؟“ اس نے عجیب سی نظروں سے جواباً نوریہ کو دیکھا یوں جیسے اس کا دماغ پھر گیا ہو۔
”تم معاذ بھائی کی متکوحہ کی بات کر رہی ہو؟ تمہیں خود اپنے آپ سے زیادہ اس سے ہمدردی ہے؟“ زینب کا لہجہ و انداز پھر کارڈ اٹنے والا تھا، نوریہ نے سر جھکا لیا۔
”تمہیں معاذ بھائی سے محبت کبھی تھی نوری؟“ زینب کا لہجہ اب کی مرتبہ بے حد کڑا اور متشنع اڑانے والا تھا، نوریہ کا دل بھرانے لگا۔

”محبت کا یہ مطلب تو نہیں ہے زینبی کہ میں اخلاقیات و اقدار کا خون کر دوں اپنی نسوانیت کا وقار کھود دوں، کیا جانتی ہو تم؟“

”اس میں اخلاقیات و اقدار اور نسوانیت کدھر سے آکھسی ہیں؟“
”انہیں ہمیشہ ہر معاملے میں ہمیں ساتھ رکھنا ہوتا ہے انہیں کھوکھرا ہم اپنے آپ کو پستیوں میں گرا دیتے ہیں زینبی پھر دوسری اہم بات یہ میں نے کہا نہ میں نے جس نہیں ہوں اور نہ میں اتنی بولڈ ہوں کہ یوں محبتوں کے اظہار کرنی پھروں، میں ایک مشرقی لڑکی ہوں جو اپنی محبت کا خون تو اپنے ہاتھ سے کر سکتی ہے مگر اپنے وقار اور نسوانی ہندار کی قربانی کسی صورت بھی دینے پہ آمادہ نہیں ہوگی۔“ اس کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ اس میں کسی قسم کی گنجائش نہ پا کے زینب جھٹلا کر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”بھائی میں جاؤں تم اپنی ان کتابی باتوں کے ساتھ، اونہ۔“ وہ ہیر پھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تو

نوریہ نے گال پہ لڑھک آنے والے آنسوؤں کو آنکھوں سے رگڑ کر صاف کر دیا تھا اور ٹھہرا ہوا حال سے انداز میں پھر نیچے میں منہ گھسایا، ابھی اسے اور بہت سارا رونا تھا ابھی اسے بہت محنت کرنا بھی خود کو پھر سے جوڑنے میں۔

☆☆☆

معاذ کے تمام تر واویلے اور احتجاج و غصے کے باوجود شاہ ہاؤس میں اس کے نکاح کی اس سنسنی خیز خبر نے یکا یک ایک پچھلی سی پچا کے رکھ دی تھی، پر نیاں کے بارے میں باقاعدہ قیاس آرائیاں ہوتی تھیں اور دے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا گیا تھا جس پہ پیا سمیت کسی بزرگ نے دھیان دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

”نام تو بہت یونیک ہے، ہو سکتا ہے وہ خود بھی پیاری ہوں۔“ یہ بات نوریہ نے کبھی تھی جو بے حد ایکسٹینڈ ہو رہی تھی یہ سب جان کر۔

”ویسے حیرانی کی بات ہے پیا بھائی کی ضد ہٹ دھری سے اچھی طرح آگاہ تھے اس کے باوجود انہوں نے ان کے لئے ایسا سوچا جبکہ اس گھر میں ان کے علاوہ بھی دو اور لڑکے شادی کے قابل تھے۔“ زیادہ کی بات یہ جہان نے شکر اہٹ دیا تھی۔
”کہیں تمہیں اپنا چائس مں ہو جانے کا افسوس نہیں؟“

”ایسا تب ہوتا اگر جو ہمارا دل کسی اور مرد رخ کا سیر نہ ہو چکا ہوتا۔“ زیادہ ہنسنے لگا۔
”ہر وقت تو شادی کے لئے مرے جاتے تھے بس اسی لئے پیا نے ان کا نام سوچا ہوگا۔“ زینب کی رائے مضبوط تھی۔

”پیا جتنے پرسکون ہیں حیرت ہوتی ہے، انہیں بھائی کی ناراضگی کی پرواہ تک نہیں۔“ زینب کو پتہ نہیں کیوں غصہ چڑھ رہا تھا۔

”چند دنوں میں ہمارے بزرگ پھر معاذ کے سرال جارہے ہیں۔“ اسماء بھابی کی اس قدر اہم اطلاع پہ حاضرین اپنی اپنی جگہ اچھل پڑے۔

”واپ؟ کس سلسلے میں؟“ جہان نے ٹھٹھک کر یہ سوال بھابی سے کیا تھا، اس کے لہجے میں واضح تشویش تھی۔

”یہ تو مجھے نہیں پتہ مگر جب میں چائے لے کر گئی پیا جان ماما سے کہہ رہے تھے، ماما جان اور چاچو بھی وہیں تھے، بانی بات رات کو تمہارے بھائی سے پتہ چلے گی، اس مینگ کا وہ بھی حصہ تھے۔“ بھابی کے اگلی بات نے بیک جزیشن میں کللی بچا دی۔
”لیکن اسے لگام کون ڈالے گا، وہ تو اٹھرا ہوا گھوڑا بنا ہوا ہے۔“ جہان نے کس قدر فکر مندی سے خود کلامی کی تھی۔

”مجھے تو خود یہ جلد بازی لگ رہی ہے، معاذ کا موڈ پہلے ہی ابھی تک بگڑا ہوا ہے۔“

”اچھا تھا وہ گھر سے دوڑ جاتے۔“ زینب نے پھر گل کر کہا تھا جہان نے بہت چونک کر اسے دیکھا اس کے چہرے پہ دبی دلی کی تھی غصہ تھا سخت تھا۔

”تم چپ رہو بھئی، ابھی تم اپنے بڑوں سے زیادہ عقل مند نہیں ہوئیں اور معاذ بھائی کتنے جذباتی ہیں یہ سب جانتے ہیں، پیا بتا رہے تھے انہوں نے انہیں بھابی سے ملنے انہیں دیکھنے کی آفر کی تھی، نکاح سے پہلے بھی بعد میں بھی، مگر یہ مانے نہیں۔“ زیادہ نے جھڑک کر کہا۔

”صرف دیکھنے کی آفر تھی نا، دیکھنے کے بعد رجحیکٹ کرنے کی تو نہیں، جب فیصلہ ہی مانا جاتا تھا تو اس بات کی اہمیت صفر ہو جاتی ہے کہ ملا اور دیکھا جائے یا نہیں۔“ زینب نے جواباً خائف ہوتے بنا ترخ کر کہا تھا، اس کا انداز کچھ ایسا غیر معمولی تھا کہ سب ہی اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

”آخر پپانے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ انہیں بھی اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ بھائی صاحب اس فیصلے کے سب سے وجہہ اور شاندار آدمی ہیں آف کورس انہوں نے ان کے لیے شریک حیات کا انتخاب بھی اسی معیار کے لحاظ سے کیا ہوگا۔ ملنے یا دیکھ لینے میں حرج بھی نہیں تھا کم از کم معاملہ کلیئر تو ہوا ہوتا۔“ ابن زیاد اپنی بات پر اڑا ہوا تھا مگر زینب کے تاثرات میں تبدیلی نہیں آئی۔

”آپ ان کی اتنی فور کیوں کر رہے ہیں آخر؟“ وہ بری طرح جھلا اٹھی تھی اب کے۔ اس بات سے بے نیاز کہ جہان بہت خاموش مگر گہری نظروں سے مسلسل اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”اور تم مجھے بتاؤ تم آخر پپا کے اس فیصلے کی اتنی مخالفت کیوں کر رہی ہو؟“ ابن زیادہ کے سوال پر وہ ذرا سا کربوالی۔

”اس لیے کہ کل اسی طرح پپا کسی اور یہ بھی اپنا فیصلہ مسلط کر سکتے ہیں۔“

”ڈونٹ وری سسٹرز مجھ پر یا جہان پر یہ ستم اگر وہ توڑیں گے بھی نا تو ہم معاذ بھائی کی طرح کاری ایکشن نہیں دیں گے پر اس! اب تم زیر دست ستم کی چائے تو بنا لاؤ۔“ زیاد نے نرمی اور سبھاؤ سے اس کا دھیان بٹانٹا چاہا تھا وہ ہونٹ پیچ کر اٹھی تو جہان نے نگاہ کا کاڑا وہ بدل لیا۔ جانے کیوں جہان کے اندر زینب کی اس تکرار نے ایک نظر ایک بے چینی بھر دی تھی جسے وہ معاذ کے لئے انہیں خود اپنے لیے کوئی جنگ لڑ رہی ہو۔

☆☆☆

اندھیری رات کے لمحے شمار ہونے تک
 تجھے ہی سوچتا ہوں صبح سے شام ہونے تک
 میں ایسا جسم ہوں جس کی روح بھی تو ہے
 اندھیری رات ہوں میں تیرے نام ہونے تک
 تیری آواز نہ سن لوں تو دل نہیں لگتا
 تڑپتا رہتا ہوں غم سے ہمسکلام ہونے تک
 تیری نظر کی قیمت یہ بک رہا ہے کوئی
 اسے خرید لے تو مجھے دام ہونے تک
 عشق کی آگ جو سینے میں لگا بیٹھے ہیں
 سلگتی رہتی ہے یہ نیندیں حرام ہونے تک

وہ اندر آئی تو اس کے میل فون کی اسکرین پر تاریک کمرے میں بلیک کر رہی تھی۔ میسج فون تھی اس نے لیک کر بیڈ سے میل فون اٹھایا۔ تیمور خان کا میسج تھا بہت خوبصورت شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا گیا تھا جسے بڑھتے وہ چل جانے والی مسکان سے بے خبر نہیں تھی، ابھی نظم پوری یا مشکل پڑھ پائی تھی تبھی تیمور کی کال پھر سے آگے گئی۔ زینب نے گردن موڑ کر بند دروازے کو دیکھا پھر

مطمئن ہو کر بیڈ پر نیم دراز ہوتے کال پیک کر لی تھی۔

”کہاں تھیں آپ؟ بہت انتظار کرانے لگی ہیں۔“ تیمور خان کا بے تاب چلتا ہوا لہجہ زینب کو یاد کر رہا تھا وہ اس کے لیے کتنی اہم کتنی خاص ہے۔ وہ آہستگی سے ہنس دی جلتے تک بجائی ہوئی دلکش ہنسی نے فون کے ذریعے تیمور خان کی سماعتوں میں رس گھولا اور وہ کچھ اور بھی بے چین ہونے لگا۔

”زنی آئی مس یو یار۔“

”تو کرتے رہیں تمس میں کیا کروں؟“ وہ ٹھٹھک کر بے نیازی سے بولی اور تیمور خان خفا ہونے لگا تھا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا زینب شاہ یہ سچ ہے میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بتاؤ کب اپنی فیملی کو تمہارے ہاں بھیجوں؟“

”اتنی جلدی کیا ہے آخر؟“ وہ اسے جان کر ستاتی اور حظ کیا کرتی اس سے اسے اندازہ ہوتا وہ تیمور کے لیے کتنی اہم ہے اور یہ احساس بہت دلچسپ لگا کرتا تھا اسے وہ ایسی ہی تھی تھوڑی بے حس اور بہت زیادہ خود پسند۔

”میں نے کہا ناں میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہارے سپنوں اور تصور سے خود کو بہلاتے تھک گیا ہوں۔“ تیمور خان کی آواز میں خفگی سی جھنجھلاہٹ اتر آئی تھی۔ وہ پہاڑوں کا بیٹا تھا۔ ویسا ہی سنگلاخ بلند و بالا اور مضبوط۔ جانے زینب کے آگے کیونکر پھسل گیا تھا کچھ اس طرح کہ موسم بن کر قدموں میں ڈھیر ہوا جاتا تھا۔ زینب اس کی دھامت خور ہوئی سے زیادہ اس کے پیک گراؤنڈ اس کے شانہ طرز زندگی سے متاثر ہوئی تھی۔ زرا لے اس کی یونیورسٹی فیلو اور دوست تھی۔ تیمور خان اس کا بھائی تھا۔ وہ اکثر زرا لے کو کالج ملنے آیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ زینب کی بھی اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ زرا لے کے ساتھ تیمور خان تو جیسے دیوانہ ہوا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کی طرح تھا زور آور اور دھانسو مزاج رکھنے والا، سرکش اور بے نیاز مگر زینب کے خمرے اور بے نیازی نے اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

”ایسا کیا جادو کر دیا ہے لالہ یہ وہ پاگل ہو رہے ہیں تمہارے لیے۔“ زرا لے نے جب پہلی بار یہ بات کہی تو زینب نے ہنس کر ٹال دیا تھا مگر تیمور خان کی جب آمد و رفت زرا لے سے ملنے کے بہانے کالج بڑھی تب زینب کو اس کی بات کا یقین کرنا پڑا کہ تیمور خان کی بولتی بہت کچھ ہتی آنکھوں میں جتنے بھی بے لگام اور بے باک جذبے تھے سب یہ زینب کو اپنا نام لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ زینب نے آسانی سے اس کی محبت کو قبول نہیں کیا تھا دل ہی دل میں پوری طرح اس سے متاثر ہونے کے باوجود اس نے اسے اپنی فطرت اور مزاج کے مطابق خوب ترسایا تھا خوب ترسایا تھا تب جا کے اسے قبولیت کی سند بخشی تھی۔ تیمور خان اس سے شادی کو اتنا ولا ہوا جا رہا تھا جبکہ زینب کو یہاں بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔

دوسری طرف جہان تھا تیمور خان سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا بلکہ وہ جاہلیت، قابلیت اور تعلیم میں وہ تیمور سے ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ البتہ تیمور ان کی وسیع جائیداد اور اراضی کے سامنے وہ اپنی مالی حیثیت میں خود مات کھا جاتا تھا۔ زینب کو بار بار مرتبہ لگا تھا جہاں اس میں انوا لو ہے اور اس نے اس راز کو اگلوانے اور اس کی کرید کی کوشش بھی کی تھی مگر جہان کی ثابت قدمی کے باعث وہ ابھی تک

اس کے دل کے راز سے آگاہی حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی اور بہت جھنجھلائی ہوئی تھی۔ اس کی اتنی تسکین اس میں تھی کہ جہان بھی تیمور کی طرح سے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دے مگر جہان نے اپنی یہ کمزوری اسے نہ دے کر گویا اسے جھنجھلاہٹ کا شکار کر دیا تھا۔ اس کا مقدر صرف جہان کی کمزوری حاصل کرنا تھا ورنہ حقیقت یہی تھی کہ جہان اور تیمور دونوں میں سے اس کا اختیار تیمور خان ہی بٹھرتا۔ اسے تیمور خان سے زیادہ تیمور کے شاہانہ طرز زندگی کی ضرورت تھی۔ وہ جذباتی اور بے خوف لڑکی نہیں تھی کہ محبت جیسی خرافات میں بڑ کر سار زندگی خاندان میں بسر کرے۔

”نہیں شاہ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ وہ اپنی سوچوں میں مگن تھی۔ تیمور خان کی آواز بے فوٹن کر متوجہ ہوئی اور ٹھنڈا سا سانس کھینچا۔

”تیمور پلیر ہمارے گھر میں کچھ کرائس پہلے سے چل رہا ہے یہ موقع بالکل مناسب نہیں ہے بات کرنے کے لیے۔“ اس نے رسائی سے کہا تھا۔

”کیا کرائس ہیں؟“ تیمور خان کے سوال پر اس نے مختصر اما معاذ والا معاملہ اسے بتا دیا۔

”ٹھیک ہے شلالے کی شادی ہو رہی ہے نا ایک ڈیڑھ مہینے میں میں چاہتا تھا ہمارا بھی کوئی معاملہ ساتھ ٹکیر ہو جاتا نکاح رخصتی نہ سہی سہی مگر خیر.....“

”ابھی میں پڑھ رہی ہوں تیمور مجھے تعلیم تو مکمل کرنے دیں کم از کم ماسٹرز۔“ وہ بسوری تو تیمور چونکا۔

”یعنی دو تین سال مزید..... ہرگز نہیں میں اتنا صبر کبھی نہیں کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں جتنی بے صبری تھی اس نے نہیب کو مسکراتے پر مجبور کر دیا۔

”تم شادی پر ضرور آؤ گی زینی۔“

”کس کی شادی پر؟“ اس نے دانستہ تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

”شلالے کی شادی پر میری تو ظاہر ہے تمہارے بغیر ہوگی نہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولا تو نہیب ہنسنے لگی تھی۔

”وقت آنے پر بتاؤں گی۔“

”تمہیں آنا ہوگا نہیب شادی میں تمہیں اپنی فیملی سے ملنا پڑے گا۔“

”جی بہتر۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا کہ اس کے کمرے میں دروازہ کسی نے ناک کیا تھا۔ اس نے سیل فون نیچے کے نیچے کھینچتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا ماریہ تھی۔

”بجو، مہا بلار ہی ہیں آپ کو۔“

”جی مہا۔“ وہ اٹھ کر ان کے کمرے میں آئی تو انہیں غلٹ میں بیگ میں چند جوڑے رکھتے دیکھ کر حیران ہوئی۔

”خیریت مہا آپ لوگ کہیں جارہے ہیں؟“

”ہاں بیٹے ہمیں گاؤں جانا ہے آپ ذرا اپنی مہا جان اور پایا جان کے چند جوڑے تو بیگ میں ڈال کر ان کی تیاری کرادیں۔“ وہ بویک مصروف رہ کر زنی سے بولی تو نہیب کی آنکھیں کچھ اور بھی بڑھنے لگی۔

”کون سے گاؤں؟ اور یہ کیا افتاد آ پڑی کہ آپ چاروں اکٹھے ہی جاگم بھاگ جارہے ہیں۔“ وہ اپنی عادت کے مطابق جلدی غصے میں آگئی تھی۔

”بیٹے نہیب انکل کا انتقال ہو گیا ہے جانا تو پڑے گا اتنا قریبی رشتہ ہے۔“

”کون نہیب انکل؟ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔“

”معاذ کے دداسر۔“ مہا کے جواب نے اسے ساکن کر دیا۔ یہ بات تو بہر حال وہ بھی جان گئی تھی کہ پر نیاں کا دادا ایک ہی دنیا میں رشتہ تھا اور وہ اس کے دادا کا تھا۔ وہ کچھ محو کو بولنے کے قابل نہیں رہی۔

”اب پر نیاں کا کیا ہوگا مہا؟ وہ اکیلی کیسے رہیں گی؟“ اس کا سوال بے ساختہ اور فطری تھا البتہ تشویش سے عاری تھا۔

”اللہ ہر کسی کا مالک ہے بیٹے سب سے بہتر سب پیدا فرمانے والا وہی ہے خدا نے ایک رشتہ لینے سے پہلے کتنے نئے رشتے بچی کو عطا فرمائے ہیں۔“

”آپ کا مطلب اب وہ یہاں آئیں گی مگر بھائی.....!“

”اسے بھی سنبھال لیں گے جیسے بھی سہی بہر حال معاذ نے قبول تو کیا ہے نا اسے۔“ مہا کے جواب نے نہیب کے لبوں پہ خاموشی کی مہر لگا دی۔ ایک جھنجھلاہٹ اس کے اندر اتری تھی۔

(مہی غلطی تھی ان کی اور یہی بزدلی کا مظاہرہ کیا انہوں نے بھلتیں۔)

مہا کی طرح پپا جان اور مہا جان بھی غلٹ اور افراتفری میں تیار ہو کر نکلے تھے۔ نہیب برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے پرسوچ نظروں سے ان کی گاڑی کو گیٹ سے نکلتے دیکھتی رہی۔ اس سے پہلے کہ چلتی جہان کی سفید مارگلہ ڈرائیور سے پریشانی پوری آ کر رکی؟

”یہ چاچو کی گاڑی تھی نا؟ پایا جان بھی ساتھ تھے اس وقت کہاں گئے ہیں یہ لوگ۔“

نیوی بلیو پینٹ کوٹ میں لمبوس ہاتھ میں بریف کیس پکڑے جہان اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا تھا۔ نہیب نے ایک نگاہ اس کے سنجیدہ و تین مگر بے تحاشا خوب روچرے کو دیکھا تھا اور بے اشتناکی سے بولی تھی۔

”پرسہ دینے گئے ہیں اپنی چہیتی بہو کو۔“ جہان نے پہلے نہیب کو پھر ٹھٹک کر اسے بغور دیکھا۔

”بہو.....!“ اس کی بڑی بڑی خفاف آنکھوں میں الجھن بہت واضح اتری تھی۔ سز پر نیاں معاذ حسن کو اس کا لہجہ ہنوز تھا جہاں کے اعصاب کو زور دار جھٹکا لگا۔

”کیا ہوا دیاں خیریت ہے نا؟ ان کے ددا.....“

”وفات پا گئے ہیں واپسی پر وہ شاہکار ساتھ ساتھ ہی ہو گا غالباً۔“ جہانگیر نے جو اسے بغور دیکھ رہا تھا بے ساختہ ہونٹوں کو تختی سے باہم پیچ کر قدم بڑھا گیا۔ اسے بہر حال پر نیاں سے نہیب کی یہ چیز سمجھ نہیں آئی تھی۔

”بات سنیں معاذ بھائی کو اس متوقع خطرے سے آپ ابھی آگاہ کر دیں تو بہتر ہوگا۔“ وہ بھاگ کر اس کے ہم قدم ہوئی اور گویا مشورہ دیا۔

”تمہیں اس سارے معاملے کی اتنی فکر کیوں ہے؟ جنہوں نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے وہ بہتر جانتے ہیں اسے کیسے پھینا نا ہے۔“ ناچاچے ہوئے بھی جہان کے لہجے میں ناگواری سمٹ آئی تھی۔

نہیب نے جواب سر دنگا ہوں اسے کی قدر گھور کے دیکھا تھا۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے معاذ بھائی میرے سکے بھائی ہوتے ہیں۔“ اس نے جیسے بتایا تھا جہانگیر نے زور سے سر جھٹکا۔

”اور یہ اطلاع میرے لئے نئی نہیں ہے، جنہوں نے یہ کیا ہے وہ بھی معاذ حسن کے والد محترم ہیں۔“ اس کا لہجہ جانے کیوں بے حد سرد ہو گیا تھا، زینب نے اپنے قدموں کو دھیمایا پھر روک لیا مگر جہان آگے بڑھتا چلا گیا تھا، ایک بار بھی رک کر یا مڑ کے دیکھے بغیر، زینب ہنٹ ہنٹ بچنے کھڑی رہی۔

(اور نوری کتنی احمق ہے کہتی ہے یہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔)

اس کے اندر غصہ بڑھنے لگا، اسے اپنے قدموں پہ جھکانے کا خیال دن بدن فاسق ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

معاذ اپنے دھیان میں مگن ڈائننگ ہال میں آیا تھا، وہاں سب کو خاموشی سے کھانے میں مصروف دیکھ کر چونکا۔

”واہ بڑا سکون ہے، یہ شاہ ہاؤس کا ہی ڈائننگ ہال ہے نا؟“ بہت دنوں بعد وہ اپنی پرانی فارم میں نظر آیا تھا، ویسا ہی تک سک سے درست بے حد خوب و جہان نے بہت دھیان سے اسے دیکھا۔

(کیا ابھی جو انکشاف اس پہ ہونے والا ہے اس کے بعد بھی یہ اتنا پرسکون نظر آئے گا؟)

وہ اس کا متوجہ ری ایکشن سوچ کر مضطرب ہونے لگا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب اس نے پاپا جان سے فون پر بات کی تو انہوں نے بھی پریناں کو اپنے ساتھ لانے کا عندیہ ظاہر کیا تھا اس کے سوا اور کوئی راستہ تھا بھی نہیں اور ممانے اسے یہ فریضہ سونپا تھا کہ معاذ کو وہی اس صورتحال کے لئے تیار کرے گا۔

”کیا سنا پ سوگھ گیا ہے سب کو؟“ جواب میں خاموشی کو باکرہ دھلا با، بھابھی نے سبھی کو سختی سے معاذ سے کوئی بھی بات کرنے سے منع کیا تھا کہ وہ ہتھے سے اکھڑ سکتا تھا، تبھی یہ کام جہان کے سپرد ہوا تھا اسے بتلانے اور قائل کرنے کا۔

”ہر وقت کا اودھم ضروری تو نہیں ہے، تم کھانا کھاؤ آرام سے۔“ جہان نے جواب دیا تھا، وہ کاندھے اچکا کر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور کھانے کی سمت متوجہ ہو گیا۔

”زینی مجھے ایک بڑا لگ کانی کا یاد دے دے جانا۔“ وہ کھانے سے فارغ ہو کر اٹھا تو زینب سے بولا تھا، زینب نے سر ہلایا تو کسی کو مزید کچھ کہے بنا پلٹ کر باہر چلا گیا، جہان اس کے کمرے میں آیا تو وہ بیڈ پر بہت ریلیکس انداز میں بیٹھا ہوا تھا اور لیپ ٹاپ پہ بڑی تھا۔

”تم مصروف ہو تو میں کچھ دیر بعد آ جاتا ہوں۔“ جہان کی بات پہ معاذ نے نظریں اٹھا کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

”بیٹھو یا تم اتنے فارل کیوں ہو رہے ہو، میں بڑی نہیں ہوں، بس کچھ ای میل چیک کر رہا تھا، اپلائی کیا تھا نا یونیورسٹی میں تو.....“

”کیا رہا؟“ جہان نے بے تالی سے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

”تم جانتے ہو زندگی کے کسی بھی مقام پہ رہ کر محسن میرے حصے میں نہیں آیا میں سلیکٹ کر لیا گیا ہوں۔“ جہان بے ساختہ مسکرا دیا۔

”مگد ویری ٹاکس کا ٹکریٹ یار۔“ معاذ نے جواب آہستگی سے سر ہلایا، اس کی مبارک باد کو

قبول کیا۔

”یار اگر تم سمجھو تو بھابھی تمہارے لئے مبارک ثابت ہوئی ہیں، اتنی بڑی کامیابی کتنی آسانی سے مل گئی تمہیں۔“ جہان نے گویا تمہید باندھی، معاذ جو لیپ ٹاپ بند کر چکا تھا الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”کون سی بھابھی؟“

”پریناں بھابھی اور کون!“ جہان کے لہجے میں آنکھوں میں خلاف مزاج شرارت در آئی تھی یہ پریناں بھابھی کون ہیں؟“ معاذ نے مسکرا کر بھنڈوں کو بخش دی تو جہان نے بے حد خفگی سے اسے ٹھوڑا تھا۔

”تم کیوں بھابھی کہہ رہے ہو احمق!“ وہ جزبہ ہوا تھا۔

”کیوں اگر تم کہہ سکتے ہو تو میں نہیں کہہ سکتا، ویسے یہ کون سی نئی ٹویلی اور انجان بھابھی ہیں جن سے میں سرے سے واقف نہیں۔“ اس کے لہجے میں اگر مصوعی پن ہوتا تو اور بات ہوتی تھی وہ سنجیدہ تھا جہان کو اب کی مرتبہ شک لگا تھا۔

”معاذ تم واقعی کچھ نہیں جانتے؟“ وہ کس قدر تحیر سے بولا تھا۔

”کیا؟ بتاؤ گے تو ہے نا۔“ معاذ بھی اب جھلا اٹھا تھا۔

”پریناں اس لڑکی کا نام ہے معاذ حسن سے تمہارا نکاح ہوا ہے میں انہی کی بات کر رہا تھا۔“ جہان نے سرد آواز میں بہت کچھ جتلا یا تو معاذ نے ساکن ہو کر اسے دیکھا پھر پہلے کا ایک اس کی آنکھیں سرخ ہوئیں پھر چہرے کی رنگت، جب وہ بولا تو اس کا لہجہ خوفناک حد تک سرد اور سنگین تھا۔

”پہلی بات تو یہ کہ میں اس زبردستی کے رشتے کو نہیں مانتا دوسری اہم بات ہمیشہ کے لئے نوٹ کر لو بچے کہ تمہارا رشتہ مجھ سے ہے اور میں تم سے کہہ رہا ہوں تم میرے حوالے سے اس کو بھابھی نہیں کہو گے، مجھے تم؟“ جہان کچھ کھوں کو شاگردہ گیا تھا اس نے دیکھا محض اتنی سی بات یہ وہ اتنا مستعل ہوا تھا کہ غصہ میں لال سمجھو کا چہرہ لائے اٹھ کر کمرے میں چکرانے لگا تھا، انداز اتنا بگڑا ہوا تھا کہ اس کے استے نزدیک ہونے کے باوجود جہان کو مزید کچھ کہنے سے جھجک محسوس ہوئی تھی۔

”اگر ایسی بات بھی معاذ تو پھر تمہیں یہ بندھن نہیں باندھنا چاہیے تھا۔“ اس نے کس قدر غصے سے کہا تو معاذ اس کے پاس آ کر ایک جھٹکے سے ٹھم گیا اور اپنی سسکی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

”تمہارا کیا، کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا انہوں نے میرے فرار کا، مگر اب میں مزید ان کی نہیں مان سکتا، زندگی میری ہے اسے میں اپنے انداز میں گزارنے کا پورا حق رکھتا ہوں۔“ وہ دبے ہوئے انداز میں چیخا تھا۔

”مگر منیب اگر جن کی وفات ہو چکی ہے اور اب وہ اکیلی ہیں، کیسے رہ سکتی ہے ایک اکیلی جوان بے سہارا لڑکی۔“

”یہ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے کہ وہ یہاں پیرا کرے، ویسے بھی یہ پیار کے سوچنے کا کام ہے۔“ وہ کس قدر بے حسی اور سفاکی سے بولا تو جہان کو اس کی سوچ کے اس رخ نے گہرے تاسف میں مبتلا کر دیا تھا۔

”جس انداز میں بھی سہی، بہر حال اب وہ تمہارے نام سے منسوب ہیں معاذ یہ بہت غلط بات ہے کہ وہ اس گھر میں ہوں اور تم انہیں اپنے رویے سے ہرٹ کرو، میں یہی کہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ.....“

”واٹ کیا کہا تم نے.....؟“

”وہ اس گھر میں آئے گی؟“ معاذ نے حقارت سے ہونٹ سکڑ کر جس طرح سے سوال کیا تھا اس کے چہرے پہ جتنی ناگواری در آئی تھی اس نے جہاں کو لنگ کر دیا تھا۔

”تو اور کہاں جائیں گی، میں نے بتایا کہ اب ان کا دنیا میں.....“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ کہاں رہے گی، میں اتنا جانتا ہوں میں اسے یہاں اس گھر میں برداشت نہیں کرسکتا یہاں آنے کا مطلب ہے لوگوں سے اس کا میرے حوالے سے تعارف جو مجھے ہرگز بھی گوارا نہیں ہے۔“ وہ چیخ پڑا تھا جہاں نے خائف ہو کر دیکھا تھا اسے۔

”معاذ بہت فضول بات کر رہے ہو تم، چاچو انہیں ساتھ لے کر آئیں گے میرا خیال ہے کہ تم انہی سے بات کرنا۔“ وہ واقعی ہی چڑ گیا تھا، اس کا خیال تھا وہ اس کے سنبھالے میں نہیں آنے والا تھا۔

”تو پپا نے پھر یکطرفہ فیصلہ کیا ہے، وہ پھر من مانی کر رہے ہیں، مگر یہ ان کی بھول ہے کہ میں اب ان کے ہاتھ میں کھ پکلی ہوں گا، اوکے فائن! رہیں وہ اپنی بھولو یہاں مگر میں نہیں رہوں گا، جا رہا ہوں میں ابھی اور اسی وقت۔“ وہ ایلکدم اتنا پھرا تھا کہ جہاں کی گھبراہٹ بوکھلاہٹ پکاروں کو خاطر میں لائے بغیر الٹے سیدھے جوتے پہن کر اس کے روکتے پکڑتے بھی اپنا آپ چھڑا کر آندھی طوفان کی طرح سے کمرے سے نکل گیا تھا، جہاں سر پکڑ کر وہیں بے بس سایہ گیا۔

☆☆☆

بجھے بجھے سے عجیب دن ہیں
خواب ہیں نہ خیال کوئی
نہ منظروں میں کوئی کشش ہے
نہ موسموں میں جمال کوئی
ہم ایک دوجے کو اپنی اپنی
ادھوری آنکھوں سے دیکھتے ہیں
ہماری برسوں کی چاہتوں پہ
اتر رہا ہے زوال کوئی
جو ہنسنا چاہیں تو اشک نکلیں
جو رونا چاہیں تو ہنسنے جائیں
ہمارے جذبات گردی رکھ کر
بنا رہا ہے مثال کوئی.....

وہ ٹیرس پہ کھڑی تھی فضا دبیز دھند سے بوجھل تھی آس پاس برقی ہواؤں کی سرسراہٹ تھی جو وجود میں دوڑتے خون کو بھی گویا جانے کے در پہ بھی مگر وہ جیسے ہر احساس سے عاری تھی، ہوا کا

ایک تیز جھونکا اسے چھو کر گزرا اور اس کی شال کا پلوڑنے لگا، وہ تب بھی بے خبر رہی مگر جب ایک مہربان ہاتھ کا لمس اس کے کاندھے پہ اترا تب وہ اسی غفلت بھری کیفیت سے باہر آئی تھی، گردن موڑنے پہ اسے اپنی دہنی جانب ماما کا شفق چہرہ نظر آیا جس پہ اس کے لئے بے پناہ محبت کا رنگ تھا۔

”بہت سردی ہے بیٹے آپ باہر کیوں آگئیں اندر چلیں ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“ ان کے چہرے کی طرح ان کا لہجہ بھی مشفق تھا نرم اور محبت سے بھرا ہوا، برنیاں نے ذرا سا تجاہل برتا پھر اسی خاموشی سے ان کے ساتھ کمرے میں آگئی، کمرے کی فضا میں کتنی خوشگوار حدت تھی آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور چاروں بزرگ افراد وہیں جمع تھے، آج انہیں یہاں آئے دوسرا دن تھا اور تب سے گویا دونوں خواتین نے اسے اپنی بے پناہ پر شفقت بنایا ہوا تھا، ماما اور ماما جان تو گویا اسے دیکھ کر پہلی نگاہ میں ہی عاشق ہو گئی تھیں، ایسا معصوم نوجنر اور دلربا حسن شاید ہی ان کی نگاہ سے پہلے گزرا ہو وہ تو اس کے داری صدمتے ہوتے اس کی بلا میں لیتے نہ تھک رہی تھیں، شوہر سے جو ایک ان کہا سا شکوہ تھا بیٹے سے زیادتی کا وہ کب کا بھول چکا تھا بلکہ انہیں تو صحیح طور اسی انتخاب سے فخر محسوس ہونے لگا تھا اور جب انہوں نے جانا وہ میڈیکل کے دوسرے سال میں ہے تو معاذ کا خصوصی چناؤ بھی ان کی سمجھ میں بخوبی آ گیا تھا۔

(بہت بے وقوف ہے معاذ بھی، اگر ایک نگاہ دیکھ لیتا تو اتنا شور کبھی نہ مچاتا۔) انہیں بیٹے کا داوایا یاد آیا تو مسکرا دیں۔

”خیر اب میں خود بتاؤں گی اسے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”پر نیاں بیٹے آج شام سے پہلے ہمیں لکھنا ہے گھر جانے کو، آپ نے اپنی تیاری تو کر لی ہے نا۔“ چاچو جیل فون پہ مصروف تھے فراغت کے بعد سب سے پہلے اسی کی سمت متوجہ ہوئے، جو ملازم کو کافی سرد کرتے بے خیالی میں دیکھ رہی تھی اس بات پہ چونکی بلکہ مضطرب ہو گئی۔

”آپ اپنی ضروری چیزیں ہی لینا بیٹا، کپڑے وغیرہ اٹھانے کی ضرورت نہیں اور بن جائیں گے۔“ ماما جان کے کہنے پہ وہ جو ہونٹ کاٹ رہی تھی یونہی سر جھکائے انگلیاں مسکتی رہی۔

”آپ کچھ کہنا چاہتی ہو بیٹا!“ اسے تذبذب میں مبتلا کر پپا نے گویا اسے مشکل سے نکالا۔
”وہ انچونگی میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی، میں ہاسٹل میں ہونی ہوں نا، تو..... اب بھی وہاں.....“

”بیٹے پہلے کی بات اور تھی، تب آپ کا گھر دور تھا مگر اب.....“

”اب تو میرا گھر بھی کوئی نہیں رہا، ددا کے بعد میں.....“ وہ ایک دیم سے چہرہ ہاتھوں میں ڈھانپ کر بلک اٹھی، اس پہ گویا شدید غم کی شکستہ حالی کا دورہ پڑا تھا، دل گرہنی اور بے چینی اس کی رگ رگ کو کاٹ رہی تھی، وہ بھولی نہیں تھی بھول سکتی ہی نہیں تھی، وہ سب کچھ جس کی حواس باخشی نے اسے ساکن کر دیا تھا احساسات بھی گویا جامد ہو گئے تھے یہ جان کر کہ ددا اس کا نکاح امیر غنسی میں کسی سے کر رہے ہیں، کون کس سے، یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا البتہ ددا کی آنکھوں میں جتنی نے کسی بھی جوا تھجائی اسے رد کرنے کا حوصلہ وہ کہاں سے لاتی جتنی ان کی خواہش پہ چپ چاپ سر تسلیم خم کر دیا تھا ورنہ جو اس کی اپنی زندگی اور مستقبل کے لئے پلاننگ تھیں ان میں شادی کو تو اگلے

کئی سالوں تک تصور بھی نہیں تھا، مگر کچھ کام انسانی ارادوں اور منصوبوں سے یکسر اوپر کے ہوتے ہیں جنہیں قدرت نے طے کیا ہوتا ہے اور وہ ہو کر ہی رہا کرتے ہیں یہ بھی ایک ایسا ہی کام تھا جو جتنا بھی غیر متوقع تھا اس نے اسے قبول کر لیا تھا، وہ اس بات سے بھی مطمئن تھی کہ ددا کا انتخاب اس کے لئے بہترین ہی ہوگا، نکاح نامے پر سائن کرتے اور قبولیت کے مراحل سے گزرتے وقت معاذ حسن کا نام اس کی سماعت اور بصارت کا حصہ بنا تو اس ہنگامی صورتحال کے باوجود دل اس ایک نام سے جانے کیسے اور کیوں شناسائی کا مرحلہ بہت سرعت سے طے کر گیا تھا اور اس نام سے یہ شناسائی اتنی سرعت سے بڑھی تھی کہ اس کے بعد محض چند گھنٹوں میں ہی جتنی بار بھی اس نے ددا یا پھر احسان انکل کے منہ سے اس نام کو سنا اسے اپنی ہارٹ بیٹ مس ہوتی محسوس ہوتی تھی، مگر یہ کیفیت اتنی لمبی ہوگی یہ اس کے گمان تک بھی نہیں تھا۔

اگلی صبح وہ جب معمول نماز فجر کے بعد چہل قدمی کو لان کی سمت جانے کو اپنے کمرے سے نکلی تو احسان انکل اور معاذ کے کمرے کے دروازے سے گزرتے اسے ٹھٹھک کر رک جانا پڑا تھا، احسان انکل حیران پریشان کمرے کے وسط میں کھڑے تھے اور ان کے مقابل یقیناً وہ معاذ حسن تھا، بلیک سوٹ میں اونچا لمبا بے حد جہرہ سالو کا جس کے چہرے کے تمام عضلات تناؤ کا شکار تھے اور لہجہ بے حد سخت تھا۔

”آپ مجھے اب کسی قیمت پر نہیں روک سکتے ہیں پاپا یہ بات طے ہے، جو کچھ آپ نے کرنا تھا وہ کر چکے، اب آپ مجھے کن پوائنٹ پہ پہلے کی طرح مزید کوئی بات نہیں منوا سکتے یا دیکھیے گا اس مرتبہ آپ نہیں میں خود اپنے آپ کو شوٹ کر دوں گا اور یہ شخص جھمکی نہیں ہوگی۔“ کتنے تلخ الفاظ تھے اور کتنے عجیب، گوکہ اسے عادت نہیں تھی اس قسم کی غیر اخلاقی حرکتوں کی کہ کسی کی باتیں سنتی مگر معاملہ صرف کسی کا تو نہیں رہا تھا، اس کی اپنی ذات بھی انوالو ہو چکی تھی اور جس کے ساتھ انوالو ہوئی تھی وہی ہتھے سے اکھڑا ہوا تھا اس کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی دھک رہی تھیں۔

”تم خواہو خدا جہاں ہی ہو رہے ہو معاذ مجھ پہ بھروسہ نہیں ہے اپنے پاپا پہ! بیٹا ایک نظر پر نیاں کو دیکھو تو سہمی ملو تو سہمی اس سے، تمہاری ساری شکایات دور ہو جائیں گی۔“ اس نے سائیں سائیں کرتی سماعتوں سے احسان انکل کی بھی آواز سنی تھی اور جیسے خود اپنے آپ سے بھی شرمندہ ہو گئی، وہ اتنی حقیر تھی اتنی بے مایا کہ کوئی اسے اتنی شدتوں سے ٹھکرا رہا تھا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے مزید کسی حماقت کا وہ جیسی بھی حور پری ہو مجھے ہرگز بھی قابل قبول نہیں یہ بات آپ آج اچھی طرح سے سمجھ لیں اور اپنی محترمہ بہو صاحبہ کو بھی سمجھا دیجئے گا۔“ وہ کچھ اور بدگزر گیا تھا اور ایک جھٹکے سے مڑا تو پر نیاں کو اس کی آنکھوں میں شعلے لپکتے ہوئے نظر آئے تھے، وہ جو ہانت کے احساس سے پارہ پارہ ہو رہی تھی اسے مڑتے دیکھ کر سرعت سے ستون کی آڑ میں ہو گئی تھی اور وہ بیک اٹھائے تنقنا ہوا اس کے پاس سے نکلتا چلا گیا تھا، پر نیاں دنگار روح اور دل کے ساتھ وہیں سے پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی، تب اس پل اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ ہرگز ہرگز بھی اپنی انا کا خون نہیں ہونے دی گی، جیسی دوا کی وفات پہ بھی اس نے خود سے شاہ ہاؤس اطلاع نہیں پہنچائی تھی وہ تو ملازمہ نے خود دھیان رکھا تھا کہ پیانے اسے کسی بھی ایمر جنسی کی صورت میں انہیں فون کرنے کی خاص تاکید کی ہوئی تھی، ورنہ وہ شاید انہیں اطلاع بھی نہ کرتی، مگر

جان اور ماما کے ساتھ پہلے بھی اس کے یوں بلک اٹھنے پہ پریشان ہو گئے تھے ماما کا بس نہیں چل رہا تھا اسے گود میں اٹھالیں، کبھی گلے لگاتیں کبھی پانی پلاتیں، بار بار اس کا ماتھا چوم رہی تھیں۔

”کیا ہوا بچی کیوں روئی اس طرح؟“ اور پر نیاں وہ اتنی محبتوں کے آگے خود کو بے بس پارہی تھی، بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھال پائی۔

”کچھ نہیں آئی بس ددا یاد آرہے ہیں۔“ اس نے ہنسی بھرتے ہوئے آنسو پونچھ لئے اور دیکری سے جواب دیا، انا پرست ایسی تھی کہ اس بات کو عیاں کر کے اپنا بھرم کھوتا بھی گوارا نہیں تھا۔

”خدا انہیں اچھی جگہ نصیب فرمائے ان کی مغفرت فرمائے آمین! بیٹا خود کو سنبھالو ہم سب ہیں نا آپ کے اپنے اور مجھے آئی نہیں کہو ماما ہوں تمہاری۔“ ماما جان نے پھر اسے پیار کیا تو وہ کچھ گے بغیر سر جھکا کر آنسو ضبط کرنے لگی، اس سے پہلے کہ کوئی کچھ مزید بولتا پیا کا سیل فون دھم سے گنگٹانے لگا تھا، انہوں نے کوٹ کی جیب سے سیل فون نکالنے سے قبل کافی کاگ ذرا آگے جھک کر ٹیبل پہ رکھا تھا، موبائل کی اسکرین پہ جہان کا لنگ کے الفاظ چپکتے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے کال ریسیو کی تھی۔

”السلام علیکم وعلیہم چاچو!“

”علیکم السلام بیٹے خیریت سے ہو؟“

”جی چاچو مگر ایک پرائلم ہے آپ لوگ واپس کب آرہے ہیں؟“ وہ کچھ بتاتے بتاتے جیسے رک کر استفسار کرنے لگا۔

”سوئم ہو گیا ہے، ہم انشا اللہ آج ہی روانہ ہو جائیں گے، خیریت؟“

”چاچو آپ نے بھائی کے لئے کیا سوچا؟“

”بیٹے ہم ساتھ لائیں گے جی کو۔“ جواب دیتے ان کی پیشانی پہ ایک شکن نمودار ہوئی جو ان کی آگاہی کی جانب اشارہ کرتی تھی جہاں کا فون بے معنی نہیں تھا اور یہ سوال اور بھی اہم تھا، انہیں سمجھنے میں لچ بھر نہیں لگا کہ معاملہ کس نوعیت کا ہو سکتا ہے۔

”ایکچو نیکی چاچو معاذ کچھ پرائلم کری ایٹ کر رہا ہے، مجھے سمجھ نہیں آرہی کیا کرنا چاہیے۔“ وہ جیسے بہت جھک کر بہت الجھ کر کہہ رہا تھا۔

”اسے کب جوہ کرنا چاہتا ہے کر لے ڈیم اٹ۔“ وہ غصے سے بولے اور ایک نگاہ حاضرین پہ ڈال کر احتیاطاً کمرے سے باہر نکل گئے۔

”وہ بہت خفا ہو رہا تھا چاچو بلکہ گھر سے چلا گیا ہے اسی غصے میں میرا خیال تھا آج واپس آ جائے گا مگر.....“

”اسے کرنے دو جوہ کر رہا ہے، آئی ڈونٹ کیئر۔“ انہوں نے جہاں کی بات کاٹ کر غصے سے کہنا۔

”چاچو اس کا کہیں پتہ نہیں ہے وہ اس بات پہ خفا ہے کہ آپ جہاں کو کہاں لائیں گے۔“

”میں نے کہا نا براہ وہ نہیں ہے، چلا گیا ہے۔ تو بہتر ہے، ورنہ میں خود اسے آکر گھر سے نکال دیتا، ایسی ناخلف اولاد لی مجھے بھی ضرورت نہیں۔“ وہ اب لے خاشا مشعل بوجھتے تھے۔

”چاچو پلیز معاملے کو سنبھالیں پلیز!“ بہان کے رسائیٹ سے کہنے پہ وہ: ونٹ بھیج گئے۔

”وہ پاگل ہو گیا ہے جہاں بیٹے اور اس کے پاگل پن کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے، اس کی فضول ضد کی وجہ سے میں بچی سے کیسے غفلت برت لوں، اس کی ذمہ داری قبول کی ہے میں نے مذاق نہیں ہے یہ بات۔“

”آپ تیس مت ہوں چاچو آپ لوگ گھر آجائے پھر بات کرتے ہیں۔“
”اوکے فائن مگر میں اس کی کوئی فضول بات ہرگز نہیں مانوں گی اور پر نیاں اسی گھر میں رہے گی ہمارے ساتھ۔“ انہوں نے غصے سے کہا اور سیل آف کر کے اپنے دھیان میں پلٹے تو خود سے محض چند قدموں کے فاصلے پر پر نیاں کی موجودگی نے انہیں گڑبڑا کے رکھ دیا۔
”آپ کب آئیں بیٹا! وہ خواہ مخواہ مسکرائے۔“

”جب آپ بہت پریشان ہو رہے تھے میری وجہ سے۔“
”جی!!!“ جوابا وہ جیسے کسی کرب سے گزر کر مسکرائی اور رواداری سے گویا ہوئی تھی۔
”آپ میری وجہ سے ٹینشن مت لیں انکل پلیز! میں نے کہا نا میں ہاسٹل میں ہی ہوتی ہوں یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے، میری وجہ سے آپ انہیں گھر سے نکالیں مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“ پاپا کو شاید اس سے اس حد تک صاف گوئی کی توقع نہیں تھی یہ پوچھن صحیح معنوں میں انہیں شیشا کے رکھتی تھی۔

”بیٹے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ایسی کوئی بھی بات.....“
”انکل پلیز! پلیز انکل آپ نے میری پوزیشن کو سمجھئے مجھے مزید ڈی گریڈ مت کریں، اس روز آپ اور ان کے سچے جوابات چیت ہوئی وہ بھی میں سن چکی ہوں یہ محض اتفاق تھا مگر میں جھتی ہوں اچھا اتفاق تھا خدا نے مجھے یقیناً کسی بہت بڑی ذلت سے بچا کر قدرے معمولی ذلت سے ہٹا کر دیا۔“ بات کے اختتام سے پہلے اس کی آواز بھرا گئی تھی، پاپا تو جیسے شاید کھڑے رہ گئے تھے، نجات سخت دکھ بے بسی غصہ لا چاری کتنی کیفیات تھیں جن سے وہ یکبارگی دو چار ہوئے تھے اور کسی طرح بھی خود سے نگاہ ملانے کے قابل نہیں رہے تھے، پر نیاں سے نگاہ چار کرنا تو بہت حوصلے کی بات تھی۔

”آئی ایم ساری بیٹا..... مم..... میں.....؟“ وہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکے خفت کے شدید غلبے نے ان کی آواز کو بے حد بوجھل کر ڈالا تھا۔

”انکل پلیز! مجھے شرمندہ مت کریں مجھے آپ کے خلوص محبت اور ایمانداری پر کوئی شبہ نہیں ہے۔“ پر نیاں سے ان کی حالت دیکھی نہیں گئی تو نرمی سے کہا تھا۔
”مگر یہ میری غلطی ہے کہ میرا انتخاب.....“

”فار گیٹ اٹ انکل!“ پر نیاں کے رکھائی سے ٹوک دینے پر ان کے چہرے پر یہ ایک سرائیہ آکر گزر گیا، کچھ کہے بغیر انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔
”میں آج ہی ہاسٹل جانا چاہوں گی، آپ مجھے ڈراپ کر دیں گے؟“ پر نیاں نے گویا اپنی کچھ دے قبل کی بیگانگی کا ازالہ کرنا چاہا تھا۔

”چھپور بیٹے کیوں نہیں آپ تیار کر دو۔“
”جینکس!“ وہ آہستہ سے بھیگی آنکھوں سے مسکرائی اور اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئی، پاپا

وہیں کھڑے کسی متفکرانہ قسم کی سوچ میں ڈوب رہے تھے۔

☆☆☆

مما اور ماما جان کو پاپا کے اس اچانک فیصلے نے شدید اختلاف سے دو چار کیا تھا، جس کا برملا اظہار بھی ہوا، پر نیاں کے سامنے بھی اور اس کے ہاسٹل چلے جانے کے بعد بھی البتہ پاپا جان چھوٹے بھائی کا بے حد سنجیدہ چہرہ دیکھ کر معاملے کی غیر معمولی بنجیدگی کو پائے تھے بھی کسی بھی قسم کے سوال سے اجتناب برتا کہ بھائی تھلے چھوٹا تھا مگر ہمیشہ بہت لمبیر مسکوں کا کل بہت آسانی سے نکالتا رہا تھا اور وقت نے ثابت کیا تھا ان کے فیصلے کتنے سچ اور منافع بخش ثابت ہوتے رہے تھے انہیں اپنے بھائی کی قابلیت پر ہرگز بھی شبہ نہیں تھا مگر ماما جان کے ساتھ ماما کا احتجاج اور ناگواری بھی جس کا کوئی انت نہیں تھا۔

”ارے میں کہتی ہوں ضرورت کیا ہے آخر اپنا گھر چھوڑ کر بچی کو ہاسٹل چھوڑنے کی، کتنی غیر مناسب بات ہے، پھر صدیے میں ہے انہوں میں رہتی تو جلد سنبھل بھی جاتی۔“ ماما جان کو ایک بار پھر ہول اٹھا تو شروع ہوئی تھیں، پاپا نے اپنی جگہ پر پہلو بدلا اور غیر شعوری انداز میں گاڑی کی اسپید بڑھائی۔

”ہاں تو اور کیا؟ مگر انہیں ہمیشہ اپنے فیصلے ٹھونسنے کی پڑی رہتی ہے، شاید انہیں معاذ یہ اعتقاد نہیں ہے، وہ بولند ضرور ہے مگر میرا بچہ بے باک نہیں ہے۔“ ماما بھی جو جانے کیا سوچ کر کھڑ رہی تھیں جل کر بولیں تو پاپا کا ضبط اسی لمحے جواب دے گیا تھا، انہوں نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی کئی سمیت بیوی کی طرف مڑے۔

”ہاں اس فیصلے کے پیچھے آپ کا بیٹا وجہ بنا ہے، مگر وجہ اس کی بولند نہیں اس کی ہٹ دھرمی اور ناگواری ہے وہ محض اس وجہ سے پہلے ہی یہ گھر چھوڑ کر چلا گیا کہ پر نیاں اس گھر میں آکر رہے گی اور یہ میرا نہیں پر نیاں کا فیصلہ ہے، بچی جتنی بھی بے بس سہی مگر بہر حال اپنی انا اور عزت نفس اسے بھی عزیز ہے، شکر ہے بیگم صاحبہ آپ کا واسطہ خاندانی رواداری گھرانے کی لڑکی سے پڑا ہے ورنہ اس بات پر آج کل کی لڑکیاں طوفان اٹھادیا کرتی ہیں مگر وہ صرف شکایت بھی زبان پر نہیں لائی۔“ ان کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی دہک اٹھیں جبکہ اس انکشاف کی زد پر آئے بانی کے بیٹوں نفوس گویا ساکن ہو گئے تھے۔

”بہت اچھا ہوا کہ وہ میرے گھر جانے سے پہلے چلا گیا، ورنہ جو اس کے کروت ہیں نا میں خود اسے گھر سے دھکے دے کر نکال دیتا۔“ وہ ضبط کھڑ کر پھٹ پڑے تھے جب پاپا جان نے نرمی و طاوت بھرے انداز میں اپنا ہاتھ ان کے بازو پر رکھ دیا۔

”کام ڈاؤن احسان! سنبھالو خود کو یار! اللہ بہتر کرے گا۔“ ان کا بلڈ پریشر بڑھتا محسوس کر کے انہوں نے رسائییت آمیز لہجے میں کہا تو پاپا ہونٹ بھیج کر پھر سے گاڑی اشارت کرنا شروع کی، ماما ڈھال سی بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

جب مزید ایک ہفتہ تلک بھی نہ اس کا پتہ چل سکا نہ واپسی ہوئی تو شاہ ماؤس کا ہر کہیں ماسوائے پاپا کے اس کی خیریت کی فکر سے دو چار ہوا تھا، جہاں تک جہاں کی بات تھی تو وہ پہلے دن

سے ہی اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا، ماما کا ضبط بالآخر جواب دے گیا آخر ماں تھیں بدحواس ہو کر جو رونا شروع ہوئی تو کسی کے چپ کرائے نہیں ہوئیں ماما جان بھی دیورانی سے ازلی وفاداری نبھاتے پوری طرح ساتھ دے رہی تھیں کہ معاذ انہیں جنید سے بھی کہیں بڑھ کر عزیز رہا تھا۔

”اللہ جانے کس حال میں مارا مارا پھرنا ہوگا میرا بچہ! کھانا بھی کھانا ہوگا کہ نہیں، کپڑا بھی ساتھ کوئی نہیں لے کے گیا، کیا کرتا ہوگا اسے تو میرے ہاتھ کے سوا کسی کا کھانا بھی پسند نہیں آتا تھا۔“ پاپا گھر آئے تو وہ رو رو کر بے حال ہو چکی تھیں ان کا موڈ خواہ مخواہ آف ہونے لگا۔

”آپ کا بیٹا بچہ نہیں ہے دودھ پیتا ہوا کہ کہیں رل رہا ہوگا، محترم ضد منوانے کو گھر سے نکلے ہیں ذرا باہر کی خاک چھان لینے دیں عقل آجائے گی۔“

”احسان بس کرو تم ہی وہ تو بچہ ہے تم ہی باز آ جاؤ، بہر حال تم بچے نہیں ہو۔“ ماما نے جن شاکی نظروں سے ماما جان کو دیکھا تھا شوہر کی ان سخت سست پہ انہی کا اثر تھا کہ وہ دیورانی کلاس لینے لگیں، پاپا نے بریف کیس صوفے پہ اچھالا اور ٹھنڈا سانس بھر کے ٹائی کی ٹاٹ ڈھکی کرتے ہوئے تھکے ہارے انداز میں بولے تھے۔

”پھر کیا چاہتیں ہیں آپ؟ موصوف کی منت سماجت کر کے گھر واپس لاؤں اور اس کے مطالبات مانوں؟“ ان کی آنکھوں میں سرد مہری اور بے زاری تھی۔

”اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“ ماما کے چمک کر کہنے پہ انہوں نے کس قدر خفگی سے انہیں دیکھا تھا۔

”آپ اس کے مطالبات جانتی ہیں بیگم صلبہ! سب سے پہلے وہ پر نیاں سے قطع تعلقی کا اعلان کرے گا، اگر آپ کو اعتراض نہیں تو میں ڈھونڈ لاتا ہوں اسے واپس۔“ ان کے لہجے کی ٹہنی اور سفاکی نے ماما کے ساتھ کمرے میں موجود بانی کے افراد کو بھی گنگ کر ڈالا۔

”خدا نہ کرے۔“ انہوں نے بے ساختہ دل پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”آپ میرے بیٹے کے متعلق ہمیشہ بدگمان رہتے ہیں، آپ اسے لائیں تو سہی میں اسے پر نیاں سے ملواؤں گی، اسے دیکھنے کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ انکار کر دے۔“ ان کے لہجے کے یقین نے پاپا کے چہرے پہ زہر خند بکھیر دیا۔

”بھول ہے آپ کی، آپ کے بیٹے کا دماغ بہت میڑھا ہے آپ کی خوش فہمی دھری رہ جائے گی۔“

”آپ پھر بدگمانی کی بات کر رہے ہیں، میں نے کہا نا مجھے ٹریٹ کرنے دیں اسے۔“ ماما نے اپنی بات پہ زور دیا تو انہوں نے کاندھے اچکا دیئے تھے۔

”اوکے فائن کریں جو آپ کرنا چاہتی ہیں۔“ انہوں نے کہا اور پلٹ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”جہان بیٹے کو معاذ سے گھر آ جائے، اس کے پاپا کہہ رہے ہیں۔“ ان کا چہرا ایکدم سے چمکنے لگا تھا، جہان نے متا سفاہ سانس بھری۔

”اس کا نمبر پچھلے ایک ہفتے سے مسلسل آف جا رہا چچی جان! میں بار بار ٹرائی کر چکا ہوں۔“

اس کے جواب پہ ماما کا چہرا الجھ سا گیا۔

”ایک بار پھر ٹرائی تو کرو بیٹے کیا یہ رابطہ ہو جائے۔“

ماما جان کے کہنے پہ اس نے جھٹک ان کا دل رکھنے کو اپنا سیل فون اٹھایا تھا، معاذ کا نمبر ڈائل کرتے اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی رابطہ ہونے کی مگر دوسری جانب جانی ٹیل کی آواز نے اس کی دھڑکنوں کے شور کو بھڑھادیا تیسری سے چوتھی ٹیل پہ کال پک کر لی گئی تھی۔

”ہاں بے بولو۔“ جہان کو لگا تھا جانے کتنے عرصے بعد وہ اس سن رہا ہے۔

”معاذ کہاں ہو تم؟ سیل بھی آف جا رہا تھا۔“

”مقصود کی بات کرو فون کیوں کیا ہے؟“ معاذ کا لہجہ ایکدم سے روکھا ہو گیا، جہان نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔

”چچی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس طرح کیوں کر رہے ہو معاذ وہ بہت فکر مند ہیں تمہاری وجہ سے بیمار پڑ گئی ہیں۔“ اس نے دانستہ غلط بیانی کی تھی، اسے قابو کرنا آسان نہیں تھا۔

”انہیں میری طرف سے تسلی دے دو، ابھی مرا نہیں ہوں بہر حال۔“ وہ کلس کر بولا تو جہان کو ہونٹ پھینچنے پڑے تھے جبکہ ماما مسلسل اسے ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھیں۔

”میری بات کراؤ۔“

”فصل مت بولا کرو، بتاؤ کہاں ہو؟“

”کیوں اغواء کرنا چاہتے ہو؟“ وہ تمللا کر بولا تو جہان کی ہنسی نکل گئی۔

”ہاں ہونا تم کوئی الہز میا کہ اغواء کرنے کا سوچوں یا رماں سے ملو آ کر بہت اپ سیٹ ہیں وہ۔“

”پاپا کہاں ہیں؟ اگر گھر پہ نہیں ہیں تو ابھی آ جاتا ہوں، اکیچو سیلی مجھے اپنے ڈاکومنٹس بھی چاہیے نا مگر شرط یہ ہے کہ تم انہیں نہیں بتاؤ گے۔“

”ڈونٹ وری آ جاؤ۔“

”مگر پاپا۔۔۔۔۔“

”نہیں ہیں وہ آ جاؤ۔“

جہان نے دانستہ پھر غلط بیانی کی اور فون بند کر دیا، وہ ایک بار آ جاتا پھر باقی کام آسان تھا۔



”دیکھو میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں صرف ماما کی وجہ سے آیا ہوں دے انہیں ہوا کیا ہے؟“

جہان اسے گھر سے باہر ہی اسے اپنے انتظار میں ٹھہرا مل گیا تھا جہان اسے دیکھتا رہ گیا، بلیو جینز پہ لیڈر کی براؤن جیکٹ فریش شیو کی ٹھہلاٹیں لئے خوب روچھا ابے حد فریش نظر آتا تھا وہ کہیں سے بھی نڈھال اور پشمرہ نظر نہیں آتا تھا جیسا نقشہ دن رات ماما اس کا کھینچا کرتی تھیں یہ حال ہو گیا ہوگا وہ حال ہو گا ہی ہوگا میرے بچے کا۔

”تم مل لو ان سے اور ڈاکومنٹس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”تم کیا سمجھتے ہو میں اب ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھا ہوں گا، میں نے جس یونیورسٹی میں

اپلائی کیا تھا وہاں مجھے ایڈمیشن مل گیا ہے۔“

”اوہ اچھا ٹھیک ہے۔“ جہان نے سر ہلایا اور اس کے ہمراہ گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

”سنا تو آگئے ہیں تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے؟“ وہ بدکا جہان گڑبڑا سا گیا۔
 ”کھان نہیں جائیں گے تمہیں یار کیا کرتے ہو؟ وہ سوغات تو ساتھ اٹھا کر نہیں لے آئے؟“ وہ
 کس قدر بے رخی بے اعتنائی سے بولا تھا۔
 ”کون سی سوغات؟“ جہان واقعی نہیں سمجھا تھا۔
 ”وہی فساد کی جڑ ان کی پیڈو بہو۔“ وہ جی بھر کے چڑا جہان کو ہنسی آنے لگی۔
 ”یعنی رشتہ مانتے بھی ہو۔“

”شٹ اپ جے میں مذاق میں بھی ایسی بات پسند نہیں کرتا۔“ وہ ہتھے سے اکھڑا تو جہان کو
 ڈھیلا ہونا پڑا۔
 ”اوکے اوکے، ویسے اطمینان رکھو ایسا کچھ نہیں ہے، بھابھی ساتھ نہیں آئیں۔“
 ”خبردار جو تم اسے بھابھی کہا سمجھے؟“ وہ آنکھیں نکال کر غرایا تو جہان نے بے بسی سے اسے
 دیکھا۔

”پھر اور کیا کہوں؟“
 ”اس کا جو بھی نام ہے وہ لیا کرو میرے حوالے کا دم چھلا ساتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔“
 جواباً وہ پھینکا تو جہان ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا تھا۔
 ”اوکے سر کچھ اور آرڈر؟“

”اوہ ہاتھ سے ہی فرمانبردار ہونا جیسے تم؟“ وہ تلخ ہوا اور زور سے سر کو جھٹکا۔
 اس سے پہلے کہ جہان جواباً کچھ کہتا اپنے دھیان سے ڈرائیوگ روم سے باہر آتی زینب معاذ
 کو اسی سمت آتے دیکھ کر کھٹک گئی، شاید اسے اپنی بصارت پہ یقین نہیں آیا تھا اور جب وہ اس
 یقین کو مانگتی تو کچھ خوشی سے اور جذباتی پن سے بھاگ کر آئی اور بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی۔
 ”تمہاں چلے گئے تھے بھائی!“

”اب تو آگیا ہوں نا؟“ وہ دھیمے سے مسکرایا تو زینب نے سر اٹھا کر اسے نم آنکھوں سے
 دیکھا تھا۔

”اب جائیں گے تو نہیں۔“
 ”تم پریشان مت ہو ریلیکس!“ معاذ نے دانستہ جواب گول کر دیا تو زینب اس کے ساتھ لگی
 اندر کمرے میں آئی مگر جہاں ماسمیت سب گویا اسی کے منتظر تھے اسے دیکھتے ہی ایک شور مچ گیا
 باری باری سب یوں گلے لگے جیسے وہ حج کر کے واپس آیا ہو، وہ کچھ جھپٹ سا گیا۔
 ”بیٹے کہاں چلے گئے تھے؟“ ماما کے آنسو اسے دیکھتے ہی پھر رواں ہو گئے تھے۔
 ”آپ روئیں نہیں پلیز!“

”اب پھر تو نہیں جاؤ گے؟“ ان کا خدشہ زبان نہ آ گیا۔
 ”یہ حالات یہ ڈنڈ کرتا ہے۔“ اس کا لہجہ روکھا ہونے لگا۔
 ”آپ سنو تو بیٹے پر نیاں بہت پیاری ہے ریلی میں تو اسے دیکھ کر.....“
 ”میں اس بارے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔“
 ”اگر سنو گے نہیں تو جانو گے کیسے بیٹے تم.....؟“

”اگر آپ نے یہ ٹاپک کلوز نہ کیا تو میں ابھی اسی وقت دوبارہ چلا جاؤں گا، مجھے سمجھ نہیں آتی
 آپ لوگ مجھے کیوں ٹیز کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ چیخ اٹھا تھا، کمرے میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔
 ”آپ اب کہیں مت جانا میرے بیٹے میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ ماما نے اسے پٹا کر
 پھر سے رونا شروع کر دیا وہ کچھ اکتایا ہوا نظر آنے لگا۔
 ”یہ بات آپ میری بجائے پاپا کو سمجھائیں کہ وہ مجھے اپنے مطالبات نہ منوائیں۔“ وہ پھر
 سے بدحفاظ ہونے لگا۔

”کیا مطالبات ہیں تمہارے؟“ پاپا کی آمد اچانک ہوئی تھی ان کا لہجہ خوفناک حد تک سنجیدہ
 تھا، ایک پل کو تو خود معاذ بھی گڑبڑا گیا مگر اگلے لمحے اس کا اذی اعتبار اس کے ساتھ تھا۔
 ”مجھے آپ کا فیصلہ قابل قبول نہیں، یہ شخص آپ کی ضدھی جو پوری ہوئی، میں اپنی پسند سے
 شادی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔“ اس نے جواباً ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو ٹوک انداز
 میں کہا تھا۔

”پر نیاں کے بارے میں کیا سوچا؟“ پاپا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا جانے وہ کتنا ضبط کر
 رہے تھے خود پہ۔

”اس کے بارے میں آپ ہیں نا سوچنے کو۔“ وہ بے حد تخی سے بولا تو پاپا کچھ دیر شعلہ بار
 نظروں سے اسے دیکھتے رہے تھے، پھر دو قدم اس کے نزدیک آئے اور سرد آواز میں بولے تھے۔
 ”میں نے سوچ لیا ہے یا تم اسے پوری عزت و احترام سے رخصت کرا کے لاؤ گے اور اس
 کے سارے حقوق پورے کرو گے ورنہ.....“
 ”ورنہ کیا.....؟“ وہ طنز سے ان کی بات اچک کر بولا۔

”ورنہ تم ابھی اور اسی وقت اسے طلاق دے دو گے، اس کی زندگی برباد کرنے کی اجازت
 میں تمہیں ہرگز نہیں دے سکتا۔“ ان کے مطالبے نے ماما کے حلق سے چیخ نکال دیں تھیں ماما جان
 الگ دل تھام کر رہ گئیں۔

”احسان یہ کیا کر رہے ہو؟“ وہ بے ساختہ چیخیں، مگر ان پہ جیسے کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔
 ”بولو کیا کرنا چاہو گے تم؟“ وہ معاذ کو گھور رہے تھے۔

”میں آپ کا پہلا مطالبہ ماننے سے قاصر ہوں، ہاں دوسرا مطالبہ پورا کرنا قطعی مشکل کام نہیں
 کہیں تو ابھی طلاق دے دوں؟“ وہ خائف ہوئے بنا اسی سکون سے بولا تو ماحول پہ کمبیر سناٹا در آیا
 تھا۔

(جاری ہے)

☆☆☆



حمیدہ کو بلائیں۔ زارا نے مشورہ دیا۔
”ہاں! یہ تو ہے، میں آج اس کا حساب کتاب کر دیتی ہوں۔“ قدسیہ غصے سے بولیں۔
”باہجی! مجھے معاف کر دیں، آئندہ شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ حمیدہ ان کی باتیں سن کے کمرے میں آگئی۔

”ایسی معافیاں تم متعدد بار مانگ چکی ہو، اب چھٹی کرو۔“ زارا نے نخوت سے جواب دیا۔
”باہجی! معاف کر دو، میں بہت غریب عورت ہوں، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ حمیدہ نے منت ریز انداز میں کہا۔

”یہ تمہیں پہلے سوچنا تھا، اب نکل جاؤ، مجھے تمہارا کوئی بہانہ نہیں سنا ہے۔“ زارا نے غصے سے کہا، حمیدہ سر جھکا کے مایوسی سے چلی گئی۔

”امی! شام کو آنے والے مہمانوں کے لئے مارکیٹ سے کیا منگوانا ہے؟“ سیف نے پوچھا۔

”رہنے دو، کچھ بھی لانے کی ضرورت نہیں ہے، لوگ کھانٹھوس کے چلے جاتے ہیں اور اپنے نکلے کھٹو عام سی صورت والے بیٹوں کے لئے پسند کر جاتے ہیں۔“ زارا چڑ گئی۔

”بیٹا! مہمان نوازی تو کرنی پڑتی ہے۔“ قدسیہ بیگم بولیں۔

”امی! زارا باہجی ٹھیک کہہ رہی ہیں، اس سے پہلے والے مہمان سب کچھ کھا کے چلے گئے تھے اور جب ہم ان کے گھر گئے ایک تو خالی چائے دپدی اور اوپر سے چشمہ ٹوڑا کے گود کیکھ کے میرا پس کر برا حال ہو گیا۔“ مازہ بولی۔

”زارا! آج شام میں کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں۔“ قدسیہ بیگم نے کہا۔
”اچھا!“ زارا کا دھیان ٹیلر سے سل کے آنے والے سوٹ کی جانب تھا۔
”ان لوگوں نے تمہیں نیلم کی شادی میں دیکھا اور پسند کر لیا۔“ قدسیہ نے بتایا۔
”کن لوگوں نے؟“ زارا نے لا پرواہی سے پوچھا۔

”یہ تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے، تم نے ہی انہیں گھر کا ایڈریس بتایا ہو گا۔“ قدسیہ بیگم مسکرائیں۔

”امی! مجھ سے نجانے کتنے لوگ گھر کا پوچھتے ہیں، نجانے کتنے لوگ شادی میں تھے، لکٹوں نے ہی مجھے سرائیا تھا۔“ زارا نے غرور سے کہا۔

”ہاں! یہ تو ہے۔“ قاسم بیگم نے تائید کی۔
”بیٹا! تمہیں تو سب پسند کر لیتے ہیں ہمیں بھی کوئی تمہارے معیار کا لڑکا ملے تو بات نہیں۔“

”امی! مل جائے گا، آخر مجھ میں کس چیز کی کمی ہے۔“ زارا نے سکون سے جواب دیا۔

”ہاں! یہ تو ہے۔“ قدسیہ اطمینان سے بولیں۔

”امی! یہ سوٹ کیسا لگ رہا ہے۔“ زارا کی توجہ بدستور اپنے سوٹ پر تھی۔

”تم! یہ تو سب کچھ بچ جاتا ہے، میں زارا ماسی سے صفائی کروالوں، کم بخت کل بھی کچرا چھوڑ گئیں تھیں۔“

”امی! آپ اسے فارغ کر دیں، کل سے

”باہجی! تیاری کر لیں، مہمان آتے ہی ہونگے۔“ مازہ نے گھڑی دیکھی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے تیار ہونے کی۔“ زارا اترا لی، قدسیہ بیگم اور مازہ مسکرا دیں۔
”امی! مجھے بتا دیں کیا لانا ہے، بیکار بحث کمرے سے نکل گیا، قدسیہ بیگم کچن میں چلیں دیں گے۔“ قدسیہ بیگم نے جواب دیا، سیف مت شروع کریں۔“ سیف بیزاری سے گویا ہوا۔

گئی۔

”ماڑہ! لوگوں پہ اتنا غصہ آتا ہے ایسے لنگور بیڑوں کی صورت نہیں دیکھتے اور منہ اٹھا کے میرے لئے آجاتے ہیں، جیسے میرے تو کچھ خواب ہی نہیں ہے۔“ زارا بے بسی سے بولی۔

”آبی! آپ فکر مت کریں، آپ کی قسمت بہت اچھی ہوگی اور آپ کے شوہر بھی آپ جیسے خوب صورت ہونگے۔“ ماڑہ نے تسلی دی۔

”ایسا ہی ہوگا۔“ زارا اعتماد سے بولی۔

قدسیہ بیگم بیوہ خاتون تھیں، ان کا تعلق مڈل کلاس گھرانے سے تھا، ان کے شوہر گورنمنٹ ملازم تھے، ان کی ڈھتہ کے بعد پینشن اور دوکانوں کے کرائے سے اچھا گزارہ ہو جاتا تھا، ان کے تین بچے تھے، جو کہ خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھے، ان کی خوبصورتی کا چرچا، خاندان، رشتے داروں میں بچپن سے ہی تھا، اس وجہ سے بچے بھی کچھ خود پسند واقع ہوئے تھے، بڑے ہو گئے ان میں یہ عادتیں پختہ ہو گئیں، سیف بڑا تھا، جو میڈیا میں انٹرنیڈ تھا، اس لئے اخبار کے دفتر میں ملازم ہو گیا۔

زارا نے ایف اے کیا تھا، اسے بڑھائی یا گھر داری سے قطعی لگاؤ نہ تھا، بنا سنورنا، گھومنا، پھرنا، موویز دیکھنے کا اسے کمریز تھا۔

ماڑہ نے بھی ایف اے کیا تھا، وہ بھی خاصی خوبصورت، شوخ زندہ دل تھی، عادات و اطوار زارا سے مختلف نہ تھے۔

قدسیہ بیگم بھی کوئی سمجھدار خاتون نہ تھیں، بچوں کی خوشی میں خوش رہنے والی تھیں۔

☆☆☆

”امی! مہمان آگئے ہیں۔“ سیف نے اطلاع دی۔

ماڑہ اور قدسیہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں، جب کہ زارانی وی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

ماڑہ نے خالی چائے پیش کر دی، آنے والے مہمان بہت بااخلاق اور سادہ لوگ دکھائی دیتے تھے، بہت پڑھے لکھے اور سنجے ہوئے لوگ تھے، زارا کو انہوں نے پسند کر لیا تھا۔

”امی! لوگ بہت شریف اور اچھے ہیں۔“

سیف بولا۔

”مجھے بھی بہت پسند آئے۔“ قدسیہ نے تائیدی۔

”بس لڑکا اچھا نکل آئے۔“ ماڑہ نے حسرت سے کہا۔

”ہم نے خالی چائے پلا دی۔“ زارا کو تاسف نے آکھیرا۔

”مشورہ بھی آپ کا تھا۔“ سیف نے طنز کیا۔

”مجھے کیا پتہ تھا، اس مرتبہ ایسے اچھے لوگ دیکھنے ملیں گے۔“ زارا مسکرائی۔

کل جاتے ہوئے خصوصی اہتمام کیا، ماڑہ ایک مائیڈ بھی ریان کا گھر دس مرلے کا تھا، جو مکش کے خوب صورت علاقے میں تھا، گھر بہت جدید طرز کا تھا، گھر والے بہت نفیس تھے اور ان کی مہمان نوازی اور خلوص نے قدسیہ بیگم، ماڑہ اور سیف کو شرمندہ کر دیا، ماڑہ ریان کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھی، جب ہی ریان آگیا، سانولا، لمبا اور خوبصورت پرکشش شخصیت کا مالک تھا، ماڑہ کو بے حد پسند آیا، ریان تہذیب یافتہ، مہذب اور شریف پڑھا لکھا انسان تھا، سیف اور قدسیہ بیگم نے فوراً اوکے کر دیا۔

ماڑہ نے ریان کی اتنی تعریفیں کیں کہ زارا کا دل بھی بے اختیار اسے دیکھنے، سوچنے، چاہنے کی آرزو کرنے لگا، اگلے ہی ہفتے زارا اور ریان کی منگنی کر دی گئی۔

منگنی کے بعد زارا اور ماڑہ منتظر تھیں کہ ریان زارا کے موبائل پہ کال کرے گا، لیکن شادی کا دن

آپہنچا ریان کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں جاگی۔

دوہن بن کر زار بے حد حسین لگ رہی تھی، آئینہ دیکھا تو خود پہ تازہ ہونے لگا۔

ریان بھی اپنی پروقار شخصیت کے ساتھ سب کو بے حد پسند آیا، خود زارا بھی پہلی نظر میں سراہ گئی، لیکن وہ قابل ہونے والوں میں نہیں قائل کرنے والوں میں تھی، سو بہت بے نیازی نظر آنے لگی۔

☆☆☆

”زارا! میں کبھی بھی کسی کی ظاہری خوب صورتی سے متاثر نہیں ہوا، مجھے ہمیشہ سے باطنی حسن پسند ہے، میری امی نے مجھ سے جب شادی کے لئے لوکی کا پوچھا تو میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ جو بھی ہو، باطنی حسن سے مالا مال ہو، میں امید کرتا ہوں، جیسی آپ کی صورت ہے اس سے کہیں بڑھ کے سیرت ہوگی۔“ ریان نے جیسے لہجے میں کہا۔

زارا جو اپنے حسن کی تعریف سننے کی توقع کر رہی تھی، ریان نے اس کے ارمانوں پہ اوس ڈال دی اور وہ دل میں خفا سی ہو گئی۔

ریان کی فیملی میں سب لوگ بہت اچھے تھے، زارا کی ساس صالحہ خاتون بہت نرم مزاج، صلح جو خاتون تھیں، ریان کی بڑی بہن جو شادی شدہ تھیں، علیحدہ وہ صالحہ خاتون جیسا مزاج رکھتی تھی، ریان کی چھوٹی بہن امامہ، زارا کا بہت خیال رکھتی تھی۔

”زارا! تمہاری شادی کو پندرہ دن ہو گئے ہیں، اب تم کھیر بنا لو۔“ ریان کی خالہ بولیں، زارا تیل پالش لگاتے ہوئے رگ کیں اور پیشانی پہ بل پڑ گئے، جو صالحہ خاتون سے پوشیدہ نہ تھے۔

”بنا لے گئی ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔“ صالحہ بولیں۔

”بھابھی میں مہندی لگاؤں۔“ امامہ نے پیار سے ہاتھ تھاما، زارا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لگتا ہے بہو کو سچے سنورنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔“ ریان کی خالہ نے طنز کیا۔

”باجی! کیسی باتیں کر رہی ہیں، شادی کو دن کتنے ہوئے ہیں۔“ صالحہ خاتون نے چپ کروانے کی کوشش کی۔

دو ماہ گزر گئے، زارا کے تہہ نہ بدلے، روزانہ گھومنا پھرنا، یا میکے جانے کی خواہش ہوتی۔

”زارا امی سارا دن گھر کے کام کرتی ہیں، تم ان کا ہاتھ بٹایا کرو۔“ ریان نے دھیسے سے انداز میں کہا۔

”مجھے گھر داری نہیں آتی۔“ زارا نے ناگواری سے کہا۔

”زارا! امی تمہیں سب سکھا دیں گی، تم کچن میں جا کے دیکھو۔“ ریان نے سمجھایا۔

زارا اس وقت تو چپ ہو گئی لیکن دوسرے دن میکے چلی گئی اور ہفتہ وہیں رہیں، میکے میں اسے ریان کی یاد بھی آتی، لیکن ریان سے فون پہ روزانہ بات کر دیتی تھی۔

”آبی! آپ گھر کے کام کر لیا کریں۔“ ماڑہ بولی۔

”کیا؟“ زارا چلائی۔

”آبی! آپ کے سسرال والے اور ریان بھائی بہت اچھے انسان ہیں، آپ کو ان کی قدر کرنی چاہیے۔“ ماڑہ صاف گوئی سے بولی۔

”ماڑہ! مجھے یہ سب کام کرنا پسند نہیں ہے۔“ زارا نے جواب دیا۔

”آبی! گھر داری عورتیں ہی کرتی ہیں، آپ معمولی بات کو ایٹو بنا رہی ہیں۔“ ماڑہ نے کہا۔

”ماڑہ تم مت بولو، میرا موقف بالکل درست ہے۔“ زارا نے چڑکے جواب دیا۔

”ای! آپ ہی سمجھائیں۔“ مارہ نے کندھے اچکائے۔
”زارا! تم کچھ کام کر لیا کرو۔“ قدسیہ بیگم بھی بولیں۔
”آپ لوگ خاموش رہیے۔“ زارا نے ٹوکا۔

”ریان! ایک ماہ ہو گیا ہے زارا نہیں آئی۔“ صالحہ خاتون کو تشویش لاحق ہوئی۔
”ای! میں بہت مصروف ہوں، میرے پاس آج کل نا تم نہیں ہے اسے لانے کا۔“ ریان نے موڈب انداز میں جواب دیا۔
”تو بیٹا! وہ خود آ جانی۔“ صالحہ خاتون بولیں۔

”تو آج پوچھو، بلکہ لے کے آؤ۔“ انہوں نے حکمانہ انداز میں کہا۔
”جی! بہتر۔“ ریان کھانے کی جانب متوجہ ہوا۔

☆☆☆

زارا اداس تھی ایک ماہ ہو گیا تھا، ریان اس نے ملنے بھی نہیں آیا تھا، اسے ریان کی بے بسی بہت غصہ آ رہا تھا، یہ بھی حقیقت تھی کہ اب اس کا یہاں دل نہیں لگ رہا تھا، اسے ریان، اس کی باتیں، سب کچھ ستا رہا تھا، لیکن وہ بلا کی اتنا پرست تھی، اپنی غلطی ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کرتی تھی، اور نہ ہی بھی پہل کرتی تھی، سو صبر کیے ہوئے تھی۔

صالحہ خاتون کے کہنے پر ریان اسے لینے آ گیا، زارا کو اپنی جیت محسوس ہوئی اور وہ غر سے چلی گئی، راستے میں ریان خاموش ہی رہا جبکہ زارا کا خیال تھا وہ زارا سے مصنوعی حقی کا اظہار کرے گا وہ اتنا عرصہ کیوں بھری، لیکن ریان نے اسے مایوس کیا صالحہ خاتون اور امامہ زارا کو دیکھ کے خوش ہوئیں۔

”بھابھی! آپ نے اتنے دن لگا دیے، کتنی بور ہوئی تھی میں۔“ امامہ نے شکوہ کیا۔
”میں منتظر تھی کہ تمہارے بھائی مجھے لینے آئیں۔“ زارا نے کن اکھیوں سے اس ایم ایس کرتے ریان کو دیکھا۔

”بیٹا! وہ دفتری کاموں میں مصروف تھا، تم سیف کے ساتھ آ جانی۔“ صالحہ خاتون نے شفقت سے جواب دیا۔
”سیف بھی دفتری کاموں میں مصروف تھا۔“ زارا چمک گئی۔

”بیٹا! یہ تمہارا اپنا گھر ہے اور عورتیں ہی گھر بناتی ہیں اور کامیاب بیوی وہ ہی ہوتی ہے جو شوہر کی رضا میں رضا مند رہے، بیٹا عورت میں برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور عورت ہی سمجھوتہ کرتی ہے جس کے بعد گھر جنت بنتا ہے اور شوہر بھی بیوی کی قدر کرتا ہے اور اسے عزت اور محبت دیتا ہے۔“ صالحہ خاتون نے نرمی سے کہا۔

”بہتر ہوتا آئی! اگر کچھ نصیحتیں آپ انے بیٹے کو بھی کرتی۔“ زارا ایک دم بھڑک اٹھی تھی۔
”زارا! میری امی سے گیزرے بات کرو۔“ ریان نے غصہ ضبط کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔
”ادبہ۔“ زارا منہ بناتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

”ریان کو ہمیشہ میں ہی غلط نظر آتی ہوں۔“ زارا نے دہمی ہو کے سوچا اور سونے کے لئے لیٹ گئی۔

”ای! آخر کب تک یوں کام چلے گا، مجھے زارا بہ ختم کرنی ہوگی، اسے گھر داری سے قطعی دھکی نہیں، گھر والوں کی اسے پروا نہیں، بڑوں کی عزت کرنا نہیں جانتی۔“ ریان کو زارا کی عادات سے شکایت تھی۔

”بیٹا! وہ تمہاری بیوی ہے، کچھ نرمی سے کچھ سختی سے اسے سمجھاؤ، رفتہ رفتہ سمجھ جائے گی اور ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ ہو جائے گی۔“ صالحہ خاتون نے ریان سے جواب دیا۔
”نرمی ہی بری ہے اب تک، اب سختی کا وقت آ گیا ہے۔“ ریان نے خود سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

زارا آنکھوں پر بازو رکھے لائٹ آف کر کے سونے لگی تھی، جب ہی ریان نے لائٹ آن کی اور زارا کو مخاطب کیا۔

”زارا! ریان نے نرمی سے پکارا، زارا کا دل ریان کی نرم آواز سن کے خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا، زارا خوش ہو گئی۔
”جی!“ زارا نے جان بوجھ کے اسے نظر انداز کر کے رخ موڑا۔

”میرے صبح کے کپڑے پر لیس کر کے رکھو۔“ ریان بولا، زارا کو جھکا لگا، وہ کیا توقع کر رہی تھی اور کیا حکم ملا۔
”صبح کروں گی، مجھے نیند آ رہی ہے۔“ زارا سرد مہری سے بولی۔

”صبح نہیں ابھی، صبح تم گیارہ بجے اٹھو گی، جب تک امامہ ہمیشہ کی طرح کر کے رکھ چکی ہو گی۔“ ریان نے جواب دیا۔

”تم اٹھو اور یہ کپڑے پر لیس کرو۔“ زارا کی طرف سے کچھ دیر جواب نہ موصول ہونے پر قدرے غصے سے کہا، زارا غصے سے اٹھی اور جلدی سے کپڑے پر لیس کر کے جان چھڑائی، جب تک ریان اسے نظر انداز کیے سو چکا تھا، زارا نے افسوس بھری نظر اس پر ڈالی۔

شادی سے قبل کیا کیا خواب دیکھے تھے، رات کو لانا ڈرا یو دیک میں ایک مرتبہ کینڈل لائٹ، ڈنر، کام کے لئے ماسی اور شادی کے بعد جی مومن پہ شمالی علاقہ جات کی سیر، مال روڈ سے

شاہنگ۔

”تم نے میرے سارے خواب آنکھوں سے نوج ڈالے، تم ایک بے حس انسان ہو، بیوی کی فیلنگ کا احساس نہیں، تم ایک خود غرض انسان ہو۔“ زارا بے آواز روتے ہوئے اپنے شوہر سے دل میں مخاطب ہوئی، ریان نے اسے ہرٹ کیا تھا، اسی اپنی بیسٹ فرینڈ ہانیہ کی بات یاد آئی تھی، ہانیہ نے شادی میں کہا تھا۔

”زارا تم تو اتنی حسین ہو، تمہارا بزمینڈ تمہیں دیکھتے ہی اپنا دل تمہارے قدموں میں رکھ دے گا اور تا حیات تمہارا غلام بن کر رہے گا، تم تو مغلہ دور کی شہزادی لگ رہی ہو۔“ اور زارا غر سے مسکرا دی تھی، وہ ریان سے یہی چاہتی تھی، لیکن ریان چھپھورا نہیں سوہر بندہ تھا، اس کے نزدیک صورت سے زیادہ سیرت اور کردار کی اہمیت تھی، زارا میں وہ خوبیاں نہیں تھیں، جن کا وہ متلاشی تھا، صالحہ بھی عام عورتوں کی طرح اس کی صورت پر مٹی کہ ان کی بہو لاکھوں میں ایک نظر آئے گی۔

ریان کو گھر بیٹو لڑکیاں اچھی لگتی تھیں، جو اپنے ہاتھوں سے اپنے شوہر کا اپنے گھر کا کام کریں، شوہر سے منسوب رشتوں کا احترام کریں، زارا ان لڑکیوں میں سے تھی، جو صرف اپنے میاں تک تعلق رکھنا پسند کرتی ہے، علیحدہ گھر، خود مختاری کی خواہش مند، ایک حد تک ریان اس کا آئیڈیل تھا، گڈ لکنگ، ایجوکیڈ، ویل ڈریسڈ، اسٹیلیش، لیکن اس کی حد سے زیادہ سنجیدگی، اسے گھر والوں کے لئے فکر مندی زارا کو خالص گھریلو روپ میں دیکھنے کی آرزو سے زارا ناالاں تھی۔

رات کو دیر تک جلنے کڑھنے اور اپنے بکھرے خوابوں پر ماتم کرنے سے اس کی آنکھ تین بجے لگی تھی ریان نماز پڑھنے جا رہا تھا، جاتے ہوئے اسے بھی کہہ گیا۔

”زارا نماز پڑھ لو۔“ زارا کروٹ بدل کے

سو گئی تھی، فجر کی نماز وہ عموماً رمضان المبارک میں ہی پڑھا کرتی تھی، عام روٹین میں تو وہ بھی بکھار عصر، یا مغرب کی پڑھ لیا کرتی تھی، دراصل ان کے گھر میں کوئی بھی نماز کا پابند نہ تھا، جبکہ صالحہ خاتون کا گھر اندر دیندار اور مشرق روایت کا حامل تھا، ان کے بچے بھی دینی احکامات کی پابندی کرتے تھے، ریان کو زارا کی دینی احکامات سے غفلت پہ تاسف ہوتا تاہم وہ ابھی سختی نہیں کرنا چاہتا تھا، خیال تھا کہ ماحول بدلنے پہ زارا کی عادات میں بھی مثبت تبدیلی رونما ہوگی، جن کے فی الحال آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

”زارا! ناشتہ بناؤ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ ریان آٹھ بجے تک زارا کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا تھا۔

”زارا! جلدی اٹھو، آخر اور کتنا سوؤں گی۔“ ریان جھنجھلایا زارا ناچار اٹھ گئی، سلاکس گرم کر کے ناشتہ دیا۔

”میں براٹھا اور آلیٹ کھاتا ہوں، کل سے بنانا۔“ ریان کے کہنے پہ زارا کو بہت غصہ آیا تاہم ضبط سے کام لیا، صبح وہ بحث میں پڑنا نہیں چاہتی تھی، ناشتہ رکھ کے وہ اپنی بقیاتیند پوری کرنے لگ گئی تھی، نہ برتن اٹھائے، نہ دھوئیں۔

اتفاق سے صالحہ خاتون کا اپنے میکے حجرات جانے کا ارادہ بن گیا، صالحہ خاتون کے ساتھ امامہ بھی چلی گئی، دوپہر کا کھانا تو صالحہ خاتون بنا گئی تھیں، رات میں زارا کو صرف روٹیاں بنانی تھیں، صالحہ خاتون کے جاتے ہی زارا کو آزادی اور خود مختاری کا احساس ہوا، اس نے جی بھر کے نی وی دیکھا، سوشام کو اپنا فیورٹ سوٹ پہنا اور میک اپ کیا، آئینہ دیکھا وہ ہمیشہ کی طرح دلکش لگ رہی تھی، آج اس کا ہونٹ لکڑ کا دل کر رہا تھا، ریان آٹھ بجے آیا۔

”السلام وعلیکم!“ ریان نے دھیمے سے کہا۔

”وعلیکم السلام! کیسے ہیں آپ؟ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“ زارا نے خوشدلی کا مظاہرہ کیا۔

”کہیں جانا ہے؟“ ریان نے بھی سندی زارا سے پوچھا۔

”میری فرینڈز، شان مغلیہ، ریسٹورنٹ کی بہت تعریف کرتی ہیں، مجھے آج رات کا کھانا وہاں کھانا ہے۔“

”اوکے، میں فریش ہو کے آتا ہوں لیکن تم پلیز کوئی چادر وغیرہ لے لو، یوں سر عام اتنے لوگوں میں بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔“ ریان نے نرمی سے جواب دیا۔

زارا اس کے رضامند ہونے پہ خوش ہوئی تھی کہ اگلے جملے نے اسے بد مزہ کر دیا، کتنا خوب صورت روپہ تھا، نازی کڑھائی، اس دوپٹے کی وجہ سے تو سوٹ خرید تھا، لیکن ریان کے خوشگوار موڈ کو بحال رکھنے کے لئے اسے اپنی بری کی بڑی اور بھاری چادر نکال کے اوڑھنی پڑھی، کھانا خوش گوار موڈ میں کھایا گیا، رات گئے دونوں کا موڈ اچھا رہا۔

”زارا! اٹھو نماز پڑھو، ناشتہ بناؤ، براٹھا اور انڈا بنانا، جلدی کرو، نماز لیٹ ہو جائے گی، میں نماز پڑھنے کے بعد ناشتہ کروں گا، مجھے آج سات بجے پہنچنا ہے۔“ اس نے ریان کی بات سنی اور سمجھنے سے قبل اس پہ نیند کا غلبہ آ گیا، ریان نماز پڑھ کے آیا تو اسے سوتے دیکھ کے چڑ گیا۔

”زارا! ناشتہ کہاں ہے؟“

”میں بناتی ہوں۔“ زارا نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور چکن کا رخ کیا اور کچھ دیر میں ناشتہ سامنے رکھ دیا۔

”زارا! میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے سلاکس کی عادت نہیں ہے، پھر تم نے یہی بنایا ہے۔“

”فرنج میں آنا گوندھا ہو نہیں ہے۔“ زارا

نے جواب دیا۔

”نہیں ہے تو گوندھتی اور بناتی۔“ ریان ناشتہ چھوڑ کے آگس چلا گیا، زارا اپنی بقیاتیند پوری کرنے لگی۔

صبح دوبارہ بیدار ہو کے ناشتہ بنایا اور فون پہ قدیمہ بیگم، مارہ، سیف سے باتیں کر کے بھی دل نہ بھرا تو صبا، ندا سے باتیں کرنے لگی، اس کے بعد نی وی دیکھا چار بجے بھوک لگی تو سالن بنانے کے بجائے فرنج سے سیب لے کے کھانے لگی، آج فون پہ صبا نے اسے بلیک ساڑھی پہنے کا مشورہ دیا تھا، آٹھ بجے سے پہلے خفیوں کی خوب صورت ساڑھی باندھی، بلیک موتیوں کا آرٹیفیشل جیولری سیٹ پہنا، پیچرل میک اپ کیے وہ بہت زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔

”السلام وعلیکم!“ ریان تھا کہ ہوا آیا تھا، آج ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اور فرنج کا ٹائم نہیں ملا تھا۔

”وعلیکم السلام!“ زارا دلکشی سے مسکرائی۔

”زارا! کھانا لگاؤ۔“ ریان داش روم کی طرف بڑھا۔

”تم یہیں بیٹھی ہو۔“ ریان نے واش روم سے نکل کر چڑ کے کہا۔

”میں نے کھانا نہیں بنایا ہے۔“ زارا نے بتایا۔

”کیوں؟ زارا! تم اب شادی شدہ عورت ہو، یہ مشکل لائف میں آچکی ہو، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو، یوں کب تک چلے گا۔“ ریان نے سپاٹ انداز میں کہا۔

”مجھے نہیں آتا، نہ ہی مجھ سے یہ کام ہوتے ہیں۔“ زارا بے بسی سے بولی۔

”زارا! یہ کہہ کے تم کاموں سے جان نہیں چھڑا سکتی، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو، جو کام نہیں آتا، اسے سیکھو، اٹھو اور کچھ بھی بناؤ۔“ ریان نے سخت لہجے میں جواب دیا، زارا مرے مرے

قدیموں سے اپنے بڈ روم میں آئی تھی، ساڑھی چنچ کی اور چکن میں آگئی۔

”میں انڈا بنا سکتی ہوں سویاں، چاول، آلو کا سالن۔“ زارا نے سوچا۔

چاول بنائے، رات گیارہ بجے ریان کا بھوک سے برا حال تھا، جب زارا چاول لائی، پھیکے کچے سخت بد مزہ چاول وہ بمشکل چار چنچ لے پایا، خود زارا سے بھی کھانا مشکل تھا۔

”آخر کب تک مجھے صبر کرنا ہوگا۔“ ریان نے پوچھا۔

”صبر میں کر رہی ہوں، تین گھنٹے گرمی میں خوار ہوئی ہوں۔“ زارا نے غصے سے جواب دیا۔

”یہ کھانے کے قابل نہیں ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اتنی پھو پڑ، بد سلیقہ اور بد مزاج بیوی ملے گی۔“ ریان نے السوس سے کہا۔

”میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے تک نظر ظالم اور ناشکرا شوہر ملے گا۔“ زارا نے دودھ جواب دیا یوں دونوں کی بحث اچھی خاصی بڑھ گئی۔

☆☆☆

صبح اتوار تھا، ملیجہ باجی اپنے بچوں سمیت آگئی، ان کے چار بچے ہیں جو بے حد شریر تھے، بڑا شرجیل گیارہ سال کا روجیل نو سال کا عاشرہ اور فاطمہ نو تین سات سال کی تھیں۔

ریان بہت خوش تھا، زارا کو یہ جان کے دھچکا لگا تھا کہ وہ ایک جفتے کے لئے آئیں ہیں، ریان دوپہر کے لئے چکن، سلاد، چاول لایا تھا ریسٹورنٹ سے۔

”باجی مجھے کھانا نہیں بنانا آتا اور جو آتا ہے وہ انہیں پسند نہیں آتا۔“ زارا نے منہ پھلا کے کہا۔

”زارا! تم پریشان مت ہو، میں کھانا بناتی ہوں، تم صفائی کرو۔“ ان کی صفائی پسند طبیعت گنداکھر دیکھ کے گھبرا گئی تھی۔

”لو جی کھانے سے جان چھٹی تو یہ عذاب گلے پڑ گیا، مجھے ماسی سمجھا ہے۔“ زارا نے دل میں سوچا۔

باجی نے لذیذ کھانا بنایا، کچن سے نکلی تو دیکھا زارائی وی دیکھ رہی ہے۔

”صفائی نہیں کی تھی۔“ انہوں نے نرمی سے زارا کو مخاطب کیا۔

”باجی! میں نے کبھی اپنے گھر میں صفائی نہیں کی، مجھے الرجی ہے۔“ زارا نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تم! کچھ کر سکتی ہو۔“ ریان نے طنز کیا۔

”ریان! تم خاموش رہو۔“ باجی نے لٹاڑا۔

”زارا! تم آؤ کھانا لگا دیں۔“

زارا نے کھانا لگا دیا، کھانا دانی مزیدار تھا۔

”امی جان کے جانے کے بعد آج پٹ بھر کے کھایا ہے۔“ ریان نے باجی سے کہا۔

زارا ریان کی بات سے ہرٹ ہوئی تھی، زارا کو بھی کھانا بہت اچھا لگا تھا لیکن تعریف کرنے کا ظرف نہیں تھا۔

”زارا! تم برتن دھو کے رکھو، جو سالن بچا ہے، اسے فرج میں رکھو، میں صفائی کرتی ہوں۔“

”جی!“ زارا نے برتن سمیٹنے شروع کیے اور پھر دھو کے خشک کر رکھے۔

”اُف اتنے سارے گندے برتن تھے۔“

زارا نے برا سامنہ بنا کے ریان سے کہا۔

ریان نے ناگواری سے زارا کو دیکھا لیکن خاموش رہا، اتنے میں شرجیل اور راجیل کمرے میں آگئے، روئیل بیڈ پہ چڑھ گیا جبکہ شرجیل زارا کی الماری کے پیچھے چھپ گیا، فاطمہ غالباً انہیں تلاش کرنے آئی تھی۔

”آپ نینوں کمرے سے باہر جائیں یہ پلے گرداؤں نہیں ہے۔“ زارا نے بے مردی سے

کہا، بیچ خاموشی سے باہر نکل گئے تھے۔

”کیا تھا، اگر کچھ دیر کے لئے بیچ کمرے میں آگئے تھے۔“ ریان نے حلقی سے کہا۔

”مجھے بچوں کا شور اور شرارتیں پسند نہیں۔“ زارا چڑی، ریان کمرے سے باہر چلا گیا۔

”ماموں! ہمیں پارک جانا ہے۔“ چاروں بچوں کا مطالبہ تھا۔

”باجی! چلیں رات کا کھانا بھی باہر کھالیں گے۔“ ریان نے پروگرام بنایا۔

”نہیں رہنے دو، تم بچوں کو لے جاؤ ہم رات کا کھانا تیار کر لیں گے بلکہ یوں کرو زارا کو بھی لے جاؤ۔“ باجی نے متانت سے کہا۔

”نہیں، میں بچوں کو لے جاتا ہوں۔“

ریان جانتا تھا کہ باجی کو پارک کے ہنگاموں سے وحشت ہوتی ہے اور زارا کو لے جانا انہیں تنہا چھوڑ جانا مناسب نہیں تھا۔

”زارا! میں بچوں کو لے کے پارک جا رہا ہوں، تمہیں کچھ منکوانا ہو تو بتاؤ؟“ ریان نے پوچھا۔

”نہیں۔“ زارا نے مختصر کہا اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

ریان اور بچوں کے جانے کے بعد باجی تنہائی کے خیال سے زارا کے کمرے میں آئی، زارا ابلی ہوئی تھی، انہیں دیکھ کے اٹھی۔

”لیٹی رہو، تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

انہوں نے نرمی سے پوچھا، زارا کے خراب تیور چڑھے یہ نمایاں تھے۔

”جی! آپ کو کچھ کام تھا؟“ زارا نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”نہیں، اسکیلی بورر ہی تھی، تم سے گپ شب کرنے آگئی، تم پارک چلی جاتی۔“ انہوں نے خوشدلی سے کہا۔

”مجھ سے ریان نے چلنے کا نہیں کہا تھا۔“

زارا بولی۔

”چلو کل ریان سے کہوں گی، صرف تمہیں لے جائے۔“ باجی نے محبت سے کہا تو زارا کے دل کا غبار کچھ کم ہوا۔

کچھ دیر میں دونوں باتوں میں خوشدلی سے مشغول ہو گئی۔

”زارا! سالن تو رکھا ہے، رات کے لئے روٹیاں بنانی ہیں۔“ باجی نے کھڑی میں آٹھ بجے کا ٹائم دیکھ کے کہا۔

”مجھ سے گول اور اچھی روٹیاں نہیں بنتی۔“ زارا نے گھبرا کے جواب دیا۔

”تم آٹا گوندھوں میں روٹیاں بناتی ہوں۔“ انہوں نے مسئلے کا حل تلاش کیا تھا۔

زارا نے آٹا گوندھا لیکن وہ زیادہ پتلا ہو گیا تھا، باجی نے مشکل سے روٹیاں بنائی، زارا نے سالن گرم کیا اور ریان کے آنے پہ کھانا لگا دیا، رات کے برتن دھو کے زارا تھک گئی تھی، آج سے قبل زارا نے اتنا کام نہیں کیا تھا، وہ تھک ہار کے اپنے کمرے میں آئی تو دنگ رہ گئی، زارا کا قیمتی کاسٹیکس دونوں بچیاں برباد کر رہی تھیں اور ریان اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔

فاطمہ مریم کا میک اپ کر رہی تھی، مریم نے لپ اسٹک سے شیشے پر پھول بنائے تھے، زارا کا نیورٹ پرفیوم آدھا خالی کر دیا تھا، مریم اس کی بلیک ساڑھی کو خود پہ ساڑھی کی طرح پلیٹ کے پیچھے تھی، اس کے برش قالین پر بٹھرے ہوئے تھے، اس کی گولڈ رنگز مریم نے اپنی انگلیوں میں فٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔

”یہ کیا کیا ہے سب کچھ برباد کر دیا، بدترین نگو یہاں سے۔“ زارا نے غصے سے دونوں کے بازو پکڑ کے باہر کی جانب دھکیلا۔

”زارا! حد میں رہو۔“ ریان بولا۔

”آپ کو نظر نہیں آ رہا لیکن آپ کو مجھ سے

غرض نہیں تو مرے سامان کی فکر کہاں سے ہوگی، میں ہی بیوقوف ہوں، جواب تک سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔“ زارا چلائی۔

”سمجھوتہ تم نہیں میں کر رہا ہوں، جو تم جیسی کم عقل تنگ دل بد اخلاق اور پھوہڑ عورت کو برداشت کرتا رہا ہوں۔“ ریان نے بھی غصے سے جواب دیا۔

”اگر میں اتنی ہی بری ہوں تو مت کرو سمجھوتہ۔“ زارا کا دل برا ہو گیا، آواز بھرا گئی۔

”یہ تم پہ احسان ہے۔“ ریان لا پر دانی سے بولا۔

”مت کرو میری ڈاپ پہ احسان، نہیں ہوں میں اتنی کمزور۔“ زارا کو اپنی ذات کی تذلیل کا دکھ تھا اس کی عزت نفس کو دھچکا لگا تھا۔

”میں جارہی ہوں، اگر تم مجھ سے اتنے ہی تنگ ہو۔“ زارا نے آنسو ضبط کیے۔

”جاؤ، تم میں سمجھدار بیویوں والے اوصاف نہیں ہے تم جیسی لڑکیوں کا عموماً یہ ہی انجام ہوا کرتا ہے، اگر تم نہ جانی تو میں خود سے کچھ فیصلہ کرتا۔“ ریان نے بے حسی سے کہا، اس سے زیادہ زارا اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس نے محض پرس لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی، گیٹ سے باہر جاتے دیکھ کر باجی چونک گئیں۔

”زارا! کہاں جا رہی ہو؟“ باجی نے تشویش سے پوچھا، زارا سنی ان سنی کر گئی انہوں نے ریان کو لپکا رہا۔

”زارا کہاں گئی ہے؟“

”اپنے گھر۔“ ریان نے بے فکری سے جواب دیا۔

”اس طرح اچانک اتنی رات میں تنہا تم نے جانے کیوں دیا۔“ باجی نے حیرت سے ریان کو گھورا۔

”باجی وہ ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہوسکتی۔“

”ریان اسے وقت دو، وہ دل کی بری نہیں، البتہ نادان ہے، اس میں اس سے زیادہ قصور اس کے ماحول اور تربیت کا ہے، اسے وقت ملے گا، ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں تمہیں صبر و برداشت سے کام لینا ہوگا۔“

”باجی! آپ پریشان مت ہو، وہ آجائے گی، دراصل اس سے کام نہیں ہوتا، اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہے۔“ ریان بولا۔

”کام کی عادت آہستہ آہستہ ہوگی، کل میں دیکھ رہی تھی وہ کام کے لئے فکر مند تھی، لیکن اس کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا تم سمجھدار ہو اس کو سمجھنے کی کوشش کرو، یہ مت سوچو کہ وہ تمہاری توقعات پہ پوری نہیں اترتی یہ سوچو کہ وہ اپنا گھر اپنے رشتے دار، دوست احباب، اپنے شوق سب کچھ چھوڑ

کے آئی ہے، اس کی بھی کچھ توقعات ہوگی، تمہاری ذات سے، تم نے یہ جانے کی کوشش نہیں کی، تم نے صرف روز اول سے اپنے ذہن میں یہ بات بٹھالی ہے کہ وہ بہت خوب صورت ہے، خوب سیرت نہیں ہوگی، ریان اسے پیار محبت عزت مان دو، اسے دوستانہ ماحول میں اپنی پسند ناپسند بتاؤ، خود بھی اس کے جذبات و احساسات کی قدر کرو، پھر دیکھنا وہ تمہارے پسندیدہ روپ میں ڈھل جائے گی۔“ باجی نے سمجھایا۔

ریان خاموش رہا، اسے کچھ اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا، لیکن وہ زارا کو بھی غلط سمجھتا تھا، اس لئے اسے آج کھری کھری سنائی تھی، جو کے یقیناً غلط تھا کیا سوچنے لگے؟

”کچھ نہیں سونے جا رہا ہوں، صبح آفس جانا ہے۔“ ریان نے دیکھتے سر کو انگلیوں کی مدد سے دبایا۔

”ہاں سو جاؤ۔“ انہوں نے اجازت دی۔

ریان لائیٹ آف کر کے جلدی سو گیا تھا۔

☆☆☆

”باجی! اتنی رات کو خیریت ہے؟“ مائرہ اسے تہاؤہ بھی تشویش سے بولی، زارا نے من و عن سب بتایا۔

”ارے کیسے نا قدرے لوگوں ہیں، میں نے اپنی بیٹی پیادہ دی، میری پھول جیسی بچی کے کتنے طلبہ گار تھے، مجھے کیا معلوم تھا کہ بظاہر پڑھے لکھے، خوشحال نظر آنے والے لوگ اندر سے اتنے ظالم نکلے گے۔“ قدسیہ بیگم دکھا روئے لگیں۔

”امی! خاموش رہیں، میاں بیوی کے رشتے میں اونچ نیچ ہو جاتی ہے، لیکن اتنی چھوٹی سی بات پہ لڑکیوں کو اپنا گھر چھوڑ کے نہیں آنا چاہیے اور زارا تمہیں اب ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ مسائل پیدا کرنے کی۔“ سیف نے سنائی۔

اکلوتے بھائی کی بے حسی پہ زارا کی آنکھیں بھیگ گئیں، قدسیہ بیگم کو بھی سیف کی بے حسی اور دخل اندازی پہ تاؤ آیا وہ سیف سے بحث میں الجھ گئیں، زارا بیڑی سے اپنے کمرے میں آ گئی، اس کے کمرے کا کھڑا ہوا تھا، ڈریسنگ ٹیبل اور فرنیچر پہ مٹی الٹی ہوئی تھی بیڈ پہ رسالے بکھرے ہوئے تھے، الماری میں مائرہ نے بے ترتیبی سے کپڑے پھونپے ہوئے تھے جس سے الماری بند نہیں ہو رہی تھی، اس کا دل برا ہوا اس نے مائرہ سے پوچھا۔

”مائرہ! کمرہ کتنا گندا ہو رہا ہے، اس کمرے کی صفائی نہیں ہوتی۔“

”ماسی بیمار ہے، ہفتے میں ایک دن برابر والوں کی ماسی کر دیتی ہے، امی تو بس بچن کا مشکل سے کرتی ہیں۔“ مائرہ بے نیازی سے بولی۔

”تم کر لیا کرو، بلکہ امی کی ہیلپ کر دیا کرو وہ جس عمر میں ہے، اس میں انہیں آرام کی

ضرورت ہے۔“ زارا بے ساختہ بولی۔

جواباً مائرہ نے اسے جن نگاہوں سے دیکھا، زارا کو خود حیرت ہوئی کہ اس نے کیا کہا ہے، وہ خاموش ہو کے بیڈ پہ لیٹ گئی، رات کو عشاء کی اذان کے وقت اس کی آنکھ کھلی، کمرے سے باہر نکلی تو مائرہ کو دیکھا، وہ اس وقت فل والیم میں لی وی پہ سو گئی سن رہی تھی۔

”مائرہ! اذان ہو رہی ہے۔“ زارا بولی، مائرہ نے آواز بند کر دی لیکن توجہ بدستوری وی پہ تھی۔

”زارا! میں نے تمہارے لئے پرانی بنائی ہے۔“ قدسیہ محبت سے بولیں اور تھکی ہاری صوفیہ پہ بیٹھ گئی۔

”امی آپ کی طبیعت ٹھیک ہیں۔“ زارا تشویش سے بولی۔

”آپی! امی کی تو ٹھیک ہے لیکن آپ کی خراب لگتی ہے آپی تھک ریان بھائی سے لڑائی نے آپ پہ برے اثرات مرتب کیے ہیں۔“ مائرہ نے مذاق اڑایا، زارا مائرہ کی سنائی سن کر کے امی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کہاں، بیٹا! بی بی ہائی رہتا ہے، سر میں اور جسم میں درد رہتا ہے، میڈیسن سے بھی افادہ نہیں۔“ قدسیہ بولیں، زارا نے ہمدردی سے زرد چہرہ اور لاغر وجود دیکھا۔

”امی آپ ریست کر لیں۔“ زارا بولی۔

”ابھی کہاں ابھی دودھ کو گرم کرتا ہے، رات کے برتن دھونے ہے، صبح کے لئے آٹا گوندھنا ہے۔“ انہوں نے بے جا رگی سے کہا۔

”امی! یہ سب میں کر لوں گی۔“ زارا عزم سے بولی۔

مائرہ اور قدسیہ چونکیں لیکن زارا نے توجہ نہ دی، زارا نے آہستہ آہستہ گھر کے کاموں کی ذمہ داری لے لی، مائرہ نے بھی ہاتھ بٹانا شروع کر

دیا، لیکن مائرہ کو بار بار کہنا پڑتا تھا، تب وہ کچھ کرتی بھی ٹال دیتی، رات کو جب تھک بار کے لیتی تو ریان کی یادداشت سے آتی جس نے ایک فون بھی نہیں کیا تھا، مائل بھی نہ پوچھا تھا، خود سے کرنے میں اتنا حائل ہوئی تھی۔

”زارا! انسٹیٹیوٹ جوائن کر لو۔“ سیف بولا۔

”کس لئے؟“ زارا ابھی۔

”کو کنگ کلاس لے لو، ابھی تمہارے ہاتھ کے کھانے انسانوں کے کھانے کے قابل نہیں ہے۔“ سیف نے چھیڑا، زارا ہرٹ ہوئی، کچھ دن گزرے تو حقیقت میں کلاسز لینا شروع کر دی اور بہت دہشتی سے سیکھنا شروع کیا وہ اپنے بنائے ہوئے کھانے بار بار ٹرائی کرتی اور ان میں پہلے سے بہتری دیتی، وہ تھک جاتی تھی، اسے کام کی عادت نہیں تھی، لیکن یہاں اس نے قدسیہ کو بیٹھا دیا تھا، صفائی مائرہ کے ذمے لگائی تھی، صالحہ خاتون واپس آئیں تو زارا کو نہ دیکھ کے سوچا کہ مکے ہوگی، لیکن متعدد دن گزرنے کے بعد بھی نہ آئی تو پوچھا، ریان مڑے سے بولا۔

ابن انشاء کی کتابیں

طنز و مزاح سفر نامے

○ اردو کی آخری کتاب،

○ آوارہ گرد کی ڈائری،

○ دنیا گول ہے،

○ ابن بطوطہ کے تعاقب میں،

○ چلتے ہو تو چین کو چلے،

○ گمری گمری پھر مسافر،

لاہور اکیڈمی ۲۰۵ سرکر روڈ لاہور۔

زیست ہے موج صبا

اسماء بدر



”السلام وعلیکم!“ زارا جو ابھی موبائل ہاتھ میں لئے ریان کو کال کرنے والی تھی کہ میں آرہی ہوں کیونکہ میاں بیوی کے رشتے میں اتنا نہیں ہوتی ہے اچانک سے ریان کو دیکھ کے گڑبڑا گئی۔ ”علیکم السلام! کیسی ہو؟“ ریان نے دھجے سے پوچھا۔

”بیٹھیں، میں ٹھیک ہوں۔“ زارا نے آنسو ضبط کیے۔

”ایک بار میری یاد نہیں آئی۔“ ریان نے شکوہ کیا۔

”آپ نے کون سا یاد کر لیا تھا۔“ زارا بولی۔

”زارا! مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے، تمہیں لینے آیا ہوں، کوشش کروں گا تمہیں خوش رکھوں۔“ ریان عزم سے بولا، زارا کا بدلا ہوا روپ اسے حیران کر رہا تھا، سلیقے سے اوڑھا دوپٹہ، چمکتا نورانی چہرہ، تراشیدہ بناء پالش کے ناخن وہ سراپا سادی تھی، ریان نے سرائتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”میں نے نادانی میں جو غلطیاں کی ہیں اب ایسا نہیں ہوگا، میں کوشش کروں گی خود کو آپ کے پسندیدہ روپ میں ڈھالنے کی۔“ زارا نے کہا۔

”اب چلو ہمیں شاپنگ بھی کرنی ہے اور میں سب ازالہ کر دوں گا۔“ ریان نے گھڑی دیکھی۔

”میں پہلے نماز پڑھ لوں۔“ زارا کے جواب نے اسے سرشار کر دیا تھا۔

☆☆☆

”ای! آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں، زارا مہینہ رہے گی، وہ بڑی ہے آنٹی کی دیکھ بھال کرتی ہے۔“

”بیٹا! مجھے بتا دیتے، میں مزاج پر سی عیادت کر لیتی۔“ صالحہ نے احساس دلایا، ریان کی غفلت کا۔

☆☆☆

رات کو دوست کے ساتھ شاپنگ پلازہ میں گھومتے ہوئے زارا بے ساختہ یاد آئی، یہاں بہت سے کپل شاپنگ کر رہے تھے، ریان کی نظر ایک ریڈی میڈ سوٹ پر پڑی، یہ رنگ زارا پہ بہت کھلتا ہے، بلکہ زارا پہ تو سب رنگ جتے ہیں، ریان نے اعتراف کیا۔

”یار! تم بھی کچھ خریدو نہ۔“ دوست اپنی شاپنگ کر چکا تھا۔

”نہیں موڈ نہیں ہے۔“ ریان اداس ہوا۔

”او یہ کہونا بھابھی کے ساتھ آؤ گے۔“ وہ ہنسا۔

”ہاں۔“ ریان بھی مسکرا دیا، دونوں واپس آ گئے۔

زارا نماز کی پابند ہو چکی تھی، وہ اب خوش اسلوبی سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال رہی تھی اور اب وہ کبھی بھی نہ تھی، بلکہ ماڑہ کی بھی ساتھ میں تربیت کر رہی تھی، ماڑہ میں مثبت تبدیلی آئی تھی، قد سیر کو اپنی کوتاہی کا احساس تھا کہ اس نے بچپن کی تربیت اپنے بے جالاڈ پیارے خراب کردی، برسوں عید تھی، زارا بہت اداس تھی، اس مرتبہ شاپنگ بھی نہیں کی تھی، بنا بات آنسو بہہ رہے تھے، کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا، دل ہی دل میں ریان سے ہزاروں شکایتیں کرتی، ریان کو بھی اپنا کمرہ بہت خالی خالی لگتا تھا، آفس سے آنے کے بعد وہ زارا کے گھر چلا گیا۔

تیرے مست مست دو نین
میرے دل کا لے گئے چین
میرے دل کا لے گئے چین
تیرے مست مست دو نین

ڈرائنگ روم کی چھت پر رکھا پیکر فل آواز
میں گونج رہا تھا، فہرے ہر کو روٹنیوں سے
پہن کی طرح سجا رہا تھا، گھر میں خوب گہما گہما
تھی، ہر طرف رونق تھی، رافع بیگم مطمئن بھی تھی
اور خوش بھی کہ آج عزت کے ساتھ اس کی بیٹی
اپنے گھر کی ہو جائے گی، احمد حسن اس پر اللہ کا
شکر ادا کر رہا تھا کہ اللہ نے اسے اپنے فرض سے
سکدوش ہونے کا موقع دیا، بھی اجالا بھی زرق
برق لباس پہنے اترا بیٹی پھر رہی تھی، زارا بند کمرے
میں اپنے ہاتھوں پر نئی مہندی اور اپنے آپ کو
پہن کے اس روپ میں دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ یہ
زندگی کا کون سا روپ ہے، جانے ابھی کتنے
امتحان باقی ہیں۔

”تمہیں پتا ہے زارا..... کہ تم کتنی پیاری
ہو؟“ اسد نے بڑے دل سے کہا۔

”بتاؤں کہ کتنی پیاری ہوں۔“ زارا نے
اترا کر کہا۔

”بھی خود کو میری نظر سے دیکھنا پتا چل
جائے گا۔“ اس اسے اٹھا کر مر کے سامنے لے
آیا تھا۔

”اچھا..... اسد اگر..... یہ تعریف میری
کوئی اور مرد کرے تو؟“ زارا نے شرارت سے
کہا۔

”کوئی کرے تو سہی اسے جان سے مار
دوں گا۔“ اسد نے اسے بچھ کر اپنے قریب
کرتے ہوئے کہا۔

زارا ماضی سے حال میں واپس آگئی تھی اور
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”اسد کوئی اور مرد آ گیا ہے، اسد مجھے

معاف کر دینا میں مجبور ہو گئی۔“

☆☆☆

زارا چپ چاپ بیٹھی زندگی کی بھول بھلیوں
میں گم تھی، وہ ماضی کی پگھلندی پر دوڑ رہی تھی۔

احمد حسن اور رافع بیگم دونوں ہی بہت نیک
اور سلجھے ہوئے لوگ تھے، زندگی میں خوشی اور
سکون تھا، زارا کے دنیا میں آنے سے گھر کے
سوئے آگن میں رونق ہو گئی اور ویسے بھی زارا تو
منہ میں سونے کا بیج لے کر پیدا ہوئی تھی، زارا
ماں باپ کی روشنی اور گھر کا دیبا بن گئی، ماں باپ
نے اسے بھلی کا چھالا بنا کر رکھا، جب زارا تین
برس کی ہوئی تو اللہ نے رافع بیگم کو بیٹے کی ماں بنا
دیا، اس کا نام انہوں نے راجیل رکھا، راجیل اور
زارا مہینوں میں پروان چڑھ رہے تھے، احمد حسن
کے چھوٹے بھائی عمر حسن نے چین میں ہی اپنے
بیٹے اسد سے زارا کا رشتہ طے کر دیا، سبھی اس
رشتے پر خوش تھے اور اسد تو دیوانہ تھا زارا کا،
سورج غروب ہوتا رہا طلوع ہوتا رہا، گھڑی کو
سویاں آگے پیچھے بھاگتی رہیں، وقت گزرتا گیا
اور زارا اور اسد نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا،
وقت کے ساتھ ساتھ محبت پروان چڑھتی گئی۔

☆☆☆

مہندی لگے گی تیری ہاتھ
ڈھولک بچے گی ساری رات
جا کے تم ساجن کے پاس
بھول جانا یہ دن رات
تجھ کو دیں پیا کا بھائے
تیرا پیا تیرے گن گائے
زارا مایوں بیٹھ چکی تھی، اسد کے نام کی
مہندی بڑے دل سے اس نے اپنے ہاتھوں پر
لگوائی تھی۔

”ارے..... ارے..... یہ آنکھوں میں پانی
کیوں؟ کیا ابھی رخصتی ہو رہی ہے؟ بس رونا

نہیں، بیٹا..... اور تم کون سا بیاہ کر دو رہا ہے
یہ تھوڑی دور تو سسرال ہے۔“ رافع بیگم نے زارا
کو خود سے الگ کر کے آنسو صاف کیے۔

”اور پھر تمہاری چچی تو ماں سے بڑھ کر تم
سے پیار کرتی ہیں، وہ بھی تمہیں میری کی محسوس
نہیں ہونے دے گی۔“ رافع بیگم نے ہیکلی پلکوں
کے ساتھ کہا، اپنی ہونے والی ساس کے قابل
رشتہ پیار پر وہ ہمیشہ ناز کرتی تھی۔

”اوہ..... بڑی فلمی جیوشن چل رہی
ہے۔“ شہریار نے ماں بیٹی کے لاڈ پیار کو دیکھ کر
سکرا کر کہا۔

”ہاں..... تو تم کیوں جل رہے ہو؟“ زارا
نے فوراً جواب دیا۔

”ارے میں کیوں جلوں گا، میں تو دیکھ رہا
تھا کہ کیسے میری بھولی بھالی خالہ کو تم اپنے مگرچھ
کے آنسو سے بیوقوف بنا رہی ہو، جبکہ دل میں
اسد سے شادی کے لٹو پھوٹ رہے ہیں۔“
شیری کہاں ادھار رکھنے والوں میں سے تھا۔
”اچھا اپنی کو اس اپنے پاس رکھو۔“ زارا
نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

شیری، زارا کا خالہ زاد بھی تھا اور بہت اچھا
انسان اور دوست بھی شہریار ان لوگوں میں سے
تھا کہ جن کے ساتھ وقت گزرتے ہوئے وقت کا
پتا نہیں چلتا، جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ
رہے تھے زارا کو شدت سے ماں باپ کی دوری کا
احساس ہو رہا تھا اور اس چیز کی طرف سے دل
مطمئن تھا اور خوشی بھی تھی کہ اسدا سے بہت چاہتا
ہے۔

اس کے سسرال والے اسے بہت چاہتے
ہیں، یہ بات اس کا سب سے بڑا ہوا دیتی تھی،
شیری نے گھر کے سارے انتظام سنبھال رکھے
تھے، ولید (زارا کا بھائی) کو کہیں یہ احساس نہیں
ہونے دیا کہ وہ اکیلا ہے، اس کے ساتھ مل کر

سب چھوٹے بڑے کام کیے، فہد (شیری کا بھائی)
نے بھی کزن ہونے کا پورا حق ادا کیا، آخر شادی
کا دن آن پہنچا، زارا سرخ کا دھاریلے میں بالکل
خورگ رہی تھی، اسد بھی کسی سے کم نہیں لگ رہا
تھا، زارا بڑا دل پران مان لے رخصت ہو کر چچا عمر
حسن کے گھر آگئی، وہاں اسے اس کی سوچ سے
بڑھ کر پیار مل رہا تھا۔

☆☆☆

وقت کو تو جیسے رنگ گئے تھے، اتنی برق
رفتاری سے گزر رہا تھا، کہ پتا ہی نہیں چل رہا تھا،
اسد تو دیوانہ تھا، زارا اس کی محبت پر نہال ہو جاتی
تھی اسے ایسا لگتا تھا کہ محبت کی خوبصورت تتلیاں
اس کے چاروں طرف کر رہی ہیں، محبت دیکھ کر اس
کی لوگ رشک کرتے تو اسے خود پر ناز ہوتا، پیار
کے گلابی پھول اس کا حصار کیے ہوئے تھے، ایسا
لگتا تھا کہ زمین اس کے ساتھ جھوم رہی ہے،
آسمان اس کے ساتھ گنگنا رہا ہے، راوی چین ہی
چین لکھ رہا تھا، اس کی شادی کو دو ماہ گزر گئے
تھے، اسد کی محبت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی
تھی، اسے پتا ہی نہ چلا کہ دو ماہ گزر گئے۔

زارا کمرے کی صفائی کر رہی تھی کہ اسے اتنا
شدید چکر آیا کہ ہاتھ میں پکڑا گلدان ہاتھ سے
چھوٹ گیا اگر وہ قریب رہی میز کو نہ پکڑتی تو گر
جاتی، تھوڑی دیر بیٹھے رہنے کے بعد اس نے اٹھ
کر ٹوٹے ٹوٹے اٹھائے، صفائی کی اور لیٹ گئی
اسے بخار بھی ہو رہا تھا اور چکر بھی آرہے تھے،
سوچا بوا کو آواز دے کر چائے کا کھول، پر ہمت
ہی نہیں ہوئی پھر یاد آیا کہ بوا تو آج آئی ہی نہیں،
سو بیٹی رہی، اتنے میں چچی جان اندر آ گئیں۔

”زارا!“ نجمہ نے دھیرے سے پکارا۔
”جی..... چچی جان!“ زارا نے نہایت
ادب سے کہا۔

”دیکھو زارا! یہ گھر تمہارا گھر ہے، اب تم

تھوڑا بہت کام کاج کیا کرو، کچن میں آؤ، اسے سنبھالو، گھر کی دیکھ بھال کرو، یہ سب تمہارا فرض بھی ہے اور ذمہ داری بھی، آج شام کا کھانا تم بناؤ زارا، تمہیں بتا رہے ہوں کہ بوا آج نہیں آئیں ہیں اور روشنی پڑھانی میں بڑی رہتی ہے، پھر بھی وہ چھوٹے موٹے کام کرتی ہے، تم سمجھ رہی ہو ناں۔“

”جی..... چچی جان!“ زارا نے ہولے سے جواب دیا، بھرتو چلی گئی مگر زارا سوچتی رہ گئی، کہ چچی جان کا یہ بدلا ہوا روپ کیوں ہے؟ ”چچی جان کے اس بدلے ہوئے لہجے اور روپ کے بارے میں اس نے کئی بار سوچا کہ اسد سے بات کرے پر ہر بار یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ کہیں ماں بیٹے کے درمیان میں فرق نہ آ جائے۔“

☆☆☆

زارا صبح سے طبیعت خراب کے باوجود کام میں جتی پڑی تھی، وہ سب کاموں سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تو اسد اس کا منتظر تھا، اس کا بدن تھکن سے چور تھا، اس کی نقاہت اور تھکن کی گواہی اس کی آنکھیں دے رہی تھیں، کہیں اسد پریشان نہ ہو جائے اس لئے چہرے پر مسکراہٹ سجا رکھی تھی۔

”اگر فارغ ہو گئی ہو تو اس نہ چیز کو بھی ٹائم دے دو۔“ اسد نے رومینگ انداز میں کہا، زارا مسکرا کر چپ ہو گئی۔

”تمہیں سب کی خوشی کا احساس ہے، سوائے میرے۔“ اسد کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ زارا سمجھ چکی تھی کہ اسد ناراض ہو رہا ہے اسی لئے مسکرا کر کہا۔

”اچھی میری بات سنو۔“ اسد اس سے اپنا موڈ خراب نہیں رکھ سکتا تھا، اسد نے زارا کا ہاتھ

پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اگلے ہی لمحے سے جیسے کرنٹ لگا ہوا، اس نے زارا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”زارا! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے اور تم کام میں لگی رہی، مجھے بتایا تک نہیں، اٹھو..... اٹھو ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ اسد نے فکر مند ہوتے ہوئے جھلت میں کہا۔

”نہیں اسد! میں ٹھیک ہوں، ابھی دوا لی ہے میں نے۔“ زارا نے ہاتھ چھڑائے ہوئے کہا۔

”جب تمہیں بخار تھا تو تم کیوں کام کیا، ماما کو کیوں نہیں بتایا اور بوا کہاں ہے جو روزم کام کرتی ہو۔“

”ماما نے..... بوا کو ہٹا دیا ہے۔“

”بتائیں ماما کو کیا ہو گیا ہے، بے شک تم نے اب تک مجھ سے کوئی شکوہ نہیں کیا ہے، پر مجھے پتا ہے کہ ماما کا رویہ تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہے، جانے ماما کو کیا ہو گیا ہے، ان کا یہ بدلا ہوا روپ میرے لئے بھی حیران کن ہے۔“ اسد دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بول رہا تھا، زارا حیران بھی تھی اور خوش بھی کہ اسد کی خود ہی سب پتا ہے۔

☆☆☆

آج زارا وقت سے کچھ زیادہ ہی پہلے اٹھ گئی تھی، وہ رات بھر ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی، عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اسد اٹھا تو اسے زارا کچھ پریشان لگی۔

”کیا بات ہے؟ زارا تم اداس پریشان کیوں ہو؟“ اسد نے قریب سے گزرتی زارا کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

”کچھ نہیں اسد! بس طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی ہے، ایک انجانا سا خوف ہے، جیسے کچھ ہونے والا ہے۔“

”تم تو ایسے ہی میری جان فکر مند ہو رہی

ہو، کچھ نہیں ہوتا، ایسی حالت میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔“ اسد کے یوں کہنے پر زارا جھینپ گئی، اس کی اس کیفیت سے اسد مڑا لینے لگا، اسے بے اختیار اس پر پیار آ گیا، اسد نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے گویا ہوا۔

”تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں جاتے ہوئے تمہیں تمہاری امی کے گھر چھوڑ جاؤں گا اور واپسی پر لیتا آؤں گا۔“ گھر جانے کا سن کر زارا خوش ہو گئی اور ویسے بھی لڑکیاں تو میکے جانے کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں۔

☆☆☆

اسد گیٹ پر بی زارا کو چھوڑ کر چلا گیا، زارا نے کچن میں کام کرتی ماں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”ارے زارا! تم کب آئیں، تم تو ہمیں بالکل ہی بھول گئی ہو، دیس میں رہتے ہوئے بھی پردیوں جیسا حال ہے تمہارا۔“ رانج بیگم نے اسے گلے لگاتے ہوئے شکوہ کیا۔

”نہیں اماں ایسی کوئی بات نہیں ہے، آئیں آپ بیٹھیں ناشتہ میں بنائی ہوں اور یہ ولید کہاں ہے؟“

”ناشتہ بعد میں بنانا، پہلے ولید کو جگا کر آؤ،“ زارا تقریباً بھگتے ہوئے ولید کے کمرے میں پہنچی۔

”اف تو یہ ولید! ابھی تک سو رہے ہو اور دیکھو تو سورج کہاں تک آ گیا ہے اوپر سے کمرے میں کتنا اندھیرا کر رکھا ہے۔“ زارا نے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے ہٹاتے ہوئے کہا، ولید کمرے میں زارا کی آواز سن کر خوش ہو کر اٹھ بیٹھا۔

”جلدی سے فریش ہو کر نیچے آؤ، میں ناشتہ بناتی ہوں، سب مل کر آج ناشتہ کریں گے۔“ زارا نے خود ہی پروگرام ترتیب دیا۔

”نہیں، تم بیٹھو، میں آتا ہوں اتنے دنوں بعد تو تم آئی ہو، بیٹھ کر باتیں کریں گے میں ناشتہ بازار سے لے کر آتا ہوں۔“ زارا کو دیکھ کر جو خوش ولید کے چہرے پر در آئی تھی وہ اس کے لہجے اور چہرے سے عیاں تھیں، زارا نیچے آ کر ماں باپ کے ساتھ باتوں میں لگ گئی اور ولید ناشتہ لینے چلا گیا، بہت دیر ہونے کے بعد رانج گویا ہوئی۔

”ولید ابھی تک نہیں آیا، دیر کر دی آنے میں؟“

”ہاں، دیرو تو واقعی ہو گئی ہے آجائے گا آپ فکر نہ کریں۔“ اتنے میں گیٹ پر تیل ہوئی۔

”نوما آ گیا ولید، آپ فکر مند ہو رہی ہیں، بابا جانی آپ گیٹ کھولیں میں برتن وغیرہ نکالتی ہوں۔“

گیٹ کھولا تو واقعی ولید تھا، پر اسے لوگوں نے کاندھے پر اٹھا رکھا تھا، لوگوں نے بتایا کہ اس کا زبردست قسم کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ موقع پر ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

شور کی آواز پر رانج بیگم اور زارا بھی گیٹ پر آ گئیں اور وہ منظر دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے، ایسا لگا کہ جیسے کوئی بھیا تک خواب دیکھ رہے ہوں، انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، زارا اپنے آپ کو قصور وار سمجھ رہی تھی کہ اس کی وجہ سے وہ ناشتہ لینے گیا، کاش وہ نہ جاتا، اس کا ردو کے برا حال تھا، کہ ایسے کیوں ہوا اس کے ساتھ؟ اوپر سے چچی جان کی باتوں نے اسے مزید دکھ سے دو چار کر دیا یہ کہہ کر کہ۔

”زارا نے صبح آتے ہی اپنی نحوست بھائی پر ڈال دی اور وہ دنیا سے چلا گیا۔“

☆☆☆

زندگی کا یہ کون سا روپ تھا، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا، زارا ہر وقت ولید کو یاد کر کے روتی رہتی،

رائع بیگم بیٹے کی موت کا صدمہ ہی اندر ہی اندر کھل رہی تھی، جوان بیٹے کی میت کو کاندھا دینا والے باپ کے دکھ اور کرب کا اندازہ ان کے چہرے کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا، ولید کی موت کا دکھ اتنا زیادہ تھا کہ زارا کو اپنے آنے والے بیٹے کی خوشی بھی بھول گئی، جب کہ اس کا چھٹا مہینہ شروع ہو چکا تھا، ولید نے دنیا چھوڑے تین ماہ بیت گئے تھے، پر انہیں سب کو ایسا لگتا کہ جیسے وہ طوفانِ کل ہی گزر رہا ہے، اور پھر سے چچی جان کا سخت لہجہ جلی کٹی باتیں اسے مزید دھکی کر دیتا، اسے زخم دیتا اور ان زخموں پر اسد اپنی محبت کا مرہم لگاتا، اسے ہر ممکن خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔

وقت برق رفتاری سے گزر رہا تھا، زندگی اسی طرح گزر رہی تھی، کسی کے چلے جانے سے وقت کا پہرہ رک تھوڑی جاتا ہے، زندگی کی گاڑی تو اسی طرح رواں دواں رہتی ہے، پر یوں اچانک کسی اپنے بہت خاص کے جانے سے دل کے ایک کونے میں ذہن کے ایک حصے میں، جسم کے ایک علاقے میں ایک خلا سا ابھر آتا ہے، جیسے لاکھ کوشش کے باوجود کوئی بھر نہیں پاتا۔

اسد کی محبت زارا کے ساتھ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی، وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھتا تھا، اسے خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا تھا، لیکن چچی جان کو ننھے آنے والے مہمان کی خوشی بھی محسوس نہ کر سکی، شاید وہ بیٹے کی محبت کو شیشہ نہیں کر پائی، ان کی جلی کٹی باتیں زارا کو بہت دکھ دیتی تھیں، پر اس کی محبت اسے پھر سے خوش کر دیتی تھی۔

☆☆☆

”اسد! جیسے جیسے ڈیلیوری کا وقت قریب آ رہا ہے، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے مجھے خوف آ رہا ہے۔“ زارا نے پریشانی سے کہا، ڈر اور خوف کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر چھائی تھیں۔

”ارے پاگل، تم تو ایسے ہی ڈر رہی ہو کچھ نہیں ہو گا میں ہوں ناں۔“ اسد نے زارا کا سر اپنے کاندھے پر رکھتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا نام پسند ہے۔“ اسد نے اس کے ذہن کو بد لنے کے لئے دوسری بات شروع کر دی۔

”جو نام آپ کو پسند ہوگا، ہم وہی نام رکھ گئے۔“ زارا نے خوشی سے کہا۔

”تو پھر مجھے تو اجالا نام پسند ہے اچھا ہے ناں..... اجالا ہماری زندگیوں کا اجالا۔“ اس نے خوشی سے جھپکتے ہوئے کہا پھر اسد اور زارا رات گئے تک باتیں کرتے رہے، وہ دونوں بہت خوش تھے، محبت کی گلابی تتلیاں ان کے گرد منڈلا رہی تھیں، اسد نے بہت پیار سے زارا کو اپنے بازو پر سلايا تھا، زارا اتنے سکون سے سوئی کہ رات گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

فجر کی نماز قضا ہونے ہی تھوڑی ہی ٹائم باقی تھا جب زارا ہڑبوا کر اٹھی، جلدی جلدی وضو کیا نماز ادا کی اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کی کچن میں جا کر اپنے اور اسد کے لئے جائے بنا کر کمرے میں آگئی اور اسد کو جگایا، مگر اسد کو ہاتھ لگاتے ہی زسے زور کا جھٹکا لگا، اسد کا پورا جسم برف کی طرح ٹھنڈا تھا، اس کا چہرہ پر سکون تھا اور آنکھیں کھلی تھیں، وہ زارا کے ساتھ بے وفائی کر چکا تھا، اسے تنہا چھوڑ کر جا چکا تھا جس نے زندگی گزارنے کے وعدے کیے تھے، سب برف گھر وندے کی طرح بہہ گئے، وہ پاگوں کی طرح پرو رہی تھی، باری باری سب کو آواز دے رہی تھی، چیخ رہی تھی، چند ہی لمحوں میں گھر کے سبھی افراد وہاں جمع ہو گئے اسد کو فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے مگر بے سود، پتا چلا کہ چند گھنٹے پہلے اسے بہت شدید دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا، اس نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی

یوں اپنا بھینک روپ لے کر سامنے آئے گی، اسد سفید لباس پہنے آخری آرام گاہ کی طرف جانے کے لئے تیار تھا، چچی جان کا رور وکر برا حال تھا، زارا کا حال بھی بہت برا تھا اور اسے دکھ کا جھٹکا اس وقت لگا جب چچی جان نے سب لوگوں کی موجودگی میں یہ کہا۔

”تو منحوس ہے، پہلے اپنے بھائی کو کھا گئی اور اب میرے بیٹے کو کھا گئی، تو بھی منحوس ہے اور تیرا یہ بچہ بھی جادو ہو جانکل جا اس گھر سے اس گھر میں تیرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔“ زارا بت بنی سے سب باتیں سن رہی تھی، آنکھوں سے پانی مسلسل بہہ رہا تھا۔

”جس شخص کے ساتھ تیرا رشتہ تھا جب وہ ہی نہیں رہا جب اسے ہی تو کھا گئی تو تیرے لئے سبھی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے، ڈائن دینچ ہو جا بھی سامنے مت آ میرے جادو ہو جا۔“

☆☆☆

وہ سونے کے لئے لیٹی تو نیند اس سے کوسوں دور تھی، دور تنہا جھپٹتا چاند کو دیکھ کر اسے تنہائی کا احساس اور بھی زیادہ ہونے لگا، اسے اپنے بیٹے کی یاد آ رہے تھے، اسد کی دیوانگی اس کی محبت اسے سب یاد آ رہا تھا، آنکھوں میں ساون اترنے لگے، دل کی زمین نمکین پانی سے سیراب ہو رہی تھی۔

زارا پھوٹ پھوٹ کر پونے لگی تھی، وہ سانس لے رہی تھی پر زندہ نہیں تھی، وہ زندگی کے رموز واقف ہی بھول گئی تھی اسے اپنی زندگی میں جینے کی رتس جب نظر آئی جب اللہ نے اسے ماں جیسے عظیم مرتبے پر فائز کیا، وہ خوش تھی پر اسے اسد کی کمی بے تحاشا محسوس ہونے لگی تھی، اس نے پہلی بار اسے گود میں لے کر بوسہ لیا دھیرے سے اس کے نرم نرم گالوں کو چھوا تو اسے احساس ہوا۔

”یہ اجالا ہے ہماری زندگی کا اجالا۔“ کوئی

بہت قریب اس کے بولا تھا، وہ خوش تھی، مخصوص اجالا کی آمد بھی چچی جان کا غصہ کم نہ کر سکی نہ وہ آئیں نہ انہوں نے اجالا کو نہ دیکھا، نہ پیار کیا۔

☆☆☆

اجالا کے آنے سے زارا کی زندگی ہی بدل گئی، اس کی زندگی کا ہر نقطہ اجالا پر آ کر رک جاتا تھا، وہ سارا دن اجالا کے چکر میں لگی رہتی، رات بیگم کو اس بات کی بے فکری ہو گئی تھی کہ اب زارا اداس نہیں رہتی پہلے کی طرح، اجالا پورے گھر کا اجالا بن گئی تھی، زارا کے والدین کو تو جیسے کھلونا مل گیا لگتا تھا کہ اجالا زارا سے زیادہ رات کی بیٹی ہے، اس دوران زارا کے لئے بے شمار اچھے رشتے آئے مگر زارا نہ مانی، اس کا کہنا تھا۔

”کون اجالا کو گئے باپ کا پیار دے گا۔“ زارا نے اپنا اور اپنی بیٹی کا بوجھ اٹھانے کے لئے آگے بڑھنا شروع کر دیا، وہ اس حقیقت کو مانتی تھی کہ آج کو ماں باپ حیات ہیں، اگر اللہ نہ کرے آنے والے وقت میں یہ نہیں ہونگے تو کیا ہو گا؟ یہ سوچ کر اس کی روح تک کانپ جاتی تھی، ہر دوسرے تیسرے دن شہر یار آ جاتا تھا، اس کے آنے سے گھر میں اچھی رونق ہو جاتی تھی، خالہ اور باقی لوگ بھی چکر لگا لیتے تھے، اجالا بھی خالہ اور شہر یار سے خاصی مانوس ہو گئی تھی ان کے ساتھ کھیل کر خوش ہوتی تھی اور فہد سے تو اجالا کی بہت بنتی تھی اور فہد بھی جان چھڑکتا تھا اس پر۔

☆☆☆

”ارے زارا تم ابھی تک سوئی نہیں۔“ رافع کمرے کی لائٹ آن دیکھ کر اندر چلی گئیں۔

”بس ماما ذرا یہ اسائنمنٹ کمپلیٹ کر لوں پھر سوئی ہوں۔“ زارا نے تیزی سے قلم چلاتے ہوئے کہا۔

”زارا! ماما نے دھیرے سے اسے پکارا۔“

”جی ماما“ زارا نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ کر کہا۔

”زارا! تم حقیقت پسند لڑکی ہو، جوتہارے ساتھ ہوا اللہ نہ کرے کہ بھی یوں بھری جوانی میں کسی کے ساتھ ہو، اسد کے دنیا سے چلے جانے کے بعد تم ایک دم سے ٹوٹ گئی، پر تم نے بغیر کسی سہارے کے خود کو سنبھالا، مضبوط کیا، حوصلہ کیا، مجھے تم پر فخر ہے، مجھے اندازہ ہے کہ مرد عورت کی زندگی میں کتنا بڑا مضبوط سہارا ہوتا ہے، مرد کے دم سے ہی عورت کی بادشاہی ہوتی ہے، ہم آج ہیں کیا پتہ رکھ رہے ہیں اگر ولید زندہ ہوتا تو میں تمہیں بھی دوسری شادی کے لئے نہ کہتی، یا اگر تمہارا اجالا کی جگہ کوئی بیٹا ہوتا تو بھی میں تمہیں دوسری شادی کے لئے فوراً نہ کرتی پر اب..... چونکہ دوسری ہے، میں اور تمہارے بابا چاہتے ہیں کہ تم دوسری شادی کے لئے رضا مندی دے دو، اب تو اجالا بھی بڑی ہو رہی ہے، تم سے زیادہ دکھ ہمیں ہے، یہ سب کرنے کا، ورنہ دنیا کا کون ماں باپ ہنسی خوشی اپنی بیٹی کی دوسری شادی کے لئے راضی ہوتا ہے، تمہیں یوں دیکھ کر ہمارا دل جلتا ہے، تمہارے بابا اندر ہی اندر ٹھٹھکے لگے ہیں اولاد کا کھنگھلی کے خواہش نہیں ہوتی۔“ رافع بیگم بھیکے لہجے میں بول رہی تھی، زارا خاموش بیٹھی بے آواز رو رہی تھی، آنسو دانوں کی طرح گر رہے تھے زارا ماں کے گلے لگ کر خوب روئی اور پہلی بار اس کی زبان پر شکوہ کیا۔

”ماما کیسا نصیب نکھو کر آئی ہوں میں۔“

☆☆☆

ماں کے اصرار پر اور ماما، بابا کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے اس نے دوسری شادی کے لئے ہاں کر دی تھی، پر اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔

”جانے کون مرد اب میری زندگی کا مالک بنے گا، جانے وہ کون ہوگا؟ کیا ہوگا میری اجالا

کو اپنا سمجھے گا کہ نہیں؟“ ہزار خوف، خدشے اور سوال اس کے ذہن میں چل رہے تھے، نظریں بظاہر کتاب پر تھیں ہر ذہن نہیں اور ابھٹا تھا۔

”کاش ولید زندہ ہوتا تو کبھی وہ دوسری شادی کے لئے ہاں نہ کرتی۔“ زارا خود سے ہم کلام تھی۔

”کتنے دن ہو گئے، شہر یار بھی نہیں آیا، اچھی جا بگئی نہیں ہی بھول گئی، آنے دو اسے ذرا اس کی تو خبر لوگی، فہد اور خالد کا چکر بھی لگا کئی دن سے پہلے انہیں فون کر کے پوچھوں سب خیر ہے ناں۔“ اور زارا اٹھ کر اس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

زارا نمبر ڈائل ہی کر رہی تھی کہ اتنے میں فہد اور خالد اندر داخل ہوئے۔

”ماما اللہ بڑی لمبی عمر ہے آپ کی میں آپ

کو ہی فون کر رہی تھی۔“

”بس دیکھو تم نے دل سے یاد کیا اور ہم چلے آئے۔“ زارا کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”میری اجالا کہاں ہے؟ وہ تو مجھ سے ناراض ہو رہی ہوگی۔“

”ہاں تمہیں یاد کر کے ابھی سوئی ہے۔“

زارا نے بتایا۔

”اچھا آپ سب لوگ بیٹھیں میں آپ لوگوں کے لئے کچھ بنا کر لاتی ہوں۔“ زارا کہہ کر

کچن میں چلی گئی، جبکہ خالد اس کی ماما کے پاس چلی آئیں۔

”رافع! آج میں تم سے کچھ مانگنے آئی

ہوں۔“

”مجھ سے..... کیا؟“ رافع نے سوالیہ

نظروں سے دیکھتے ہوئے چونک کر سوال کیا۔

”رافع! تمہیں پتا ہے کہ مجھے زارا سے کتنا

پیار ہے، اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر، میری تو جان

ہی زارا میں اٹکی ہوئی ہے، تم زارا کو مجھے دے دو ہمیشہ کے لئے میں تم سے اسے مانگنے آئی ہوں، پلیز انکار مت کرنا، ایک بار بچپن میں تم نے اور زارا کے بابا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ہم تو اسد کے ماں باپ کو ہاں کر چکے ہیں، آج مایوس مت کرنا رافع۔“

”نہیں مجھے تو خوشی ہے کہ زارا بیاہ کر اپنے ہی گھر جائے گی، اس کے پاس جو ماں سے بڑھ کر اسے پیار کرتی ہے، پر ہم ایک بار شہر یار سے پوچھ لو۔“ رافع نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”ارے شہر یار نے ہی تو مجھے بھجا ہے، جو بات میرے دل میں تھی، وہ شہر یار کی زبان پر آ گئی، بس تم زارا اسے پوچھ لو پھر، ہم مل بیٹھ کر نکاح کی تیاری کریں۔“ وہ تو ہچکچاتی پر سروسو جمانے لگی تھی۔

☆☆☆

زارا بہت سارے دوسروں سے باہر آ گئی تھی، شہر یار اسے شروع سے پسند تھا پر اس لحاظ سے نہیں کہ وہ اسے اپنا لے یا اس کا شریک سفر ہے، شہر یار ایک اچھا انسان اور خوبصورت دل رکھنے والا بندہ تھا، اسد کی بھی شہر یار سے بہت بے رحمی، پر اس نے زندگی میں ایسا بھی نہیں سوچا تھا، وہ دوسری شادی کے لئے رضا مندی دے چکی تھی، مگر اب شہر یار کا رشتہ آنے سے اس کے خدشات ختم ہو گئے تھے، اسے جو ڈر ہر وقت ستاتا تھا کہ ”اجالا کا کیا بنے گا؟“ وہ ڈر ختم ہو گیا تھا، باقی سارا معاملہ اس نے اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

زارا کے شہر یار سے رشتے کی خبر چچی جان پر بجلی بن کر گر رہی تھی، وہ تو شہر یار کے لئے کچھ اور ہی سوچ بیٹھی تھیں ان کا خیال تھا کہ شہر یار ان کا داماد بنے، یہ خواہش جو بن پوری ہوئے ہی دم توڑ گئی، جانے کب سے وہ اس خواہش کو دل میں دبائے بیٹھی تھیں، بس مناسب وقت کے انتظار

میں تھیں، پر کیا خبر تھی کہ وقت آنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا، اب تو زارا سے اسے اور بھی زیادہ نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

خوشیاں اپنا دامن بچھائے زارا کی منتظر تھی، اس کا دل مطمئن تھا، پر اس کی بہت آج بھی اس کے سینے میں دل بن کر دھڑک رہی تھی، کسی نے ایک بار اسے کہا تھا کہ ”خوشیاں دستک دے تو بتانا خبر کیسے دروازہ کھول دو، کیونکہ اگر خوشیاں روکھ جائے تو دوبارہ نہیں آئی بس پچھتاوارہ جاتا ہے۔“ زارا نے تا حد نظر پھیلے نیلے آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ سے معافی مانگی۔

”اللہ مجھے معاف کر دیتا شاید آنے والے وقت میں وہ پیار اور حقوق شہر یار کو نہ دے پاؤں، جو اس کا حق ہے، یا اس کی جو خواہش ہے، کیونکہ میں اپنا دل، پیار اور سارے حقوق اسد کو دے چکی، اگر ولید بھی زندہ ہوتا تو میں کبھی دوسری

شادی نہ کرتی۔“ آنکھوں میں موتی چمکنے لگے تھے اور آنکھوں کی باز تو ذکر باہر آ گئے اس کے پتا ہی نہ چلا کہ کب شہر یار آ کر اس کے قریب بیٹھ گیا، شہر یار نے ان چمکتے موتیوں کو اپنی انگلی کی پوروں میں جذب کیا۔

آج کے بعد کوئی بات نہ ہونے دیں گے ہم تیری آنکھ میں برسات نہ ہونے دیں گے آج کے بعد دن ہی تیرا مقدر ہو گا تیرے خوابوں میں بھی رات نہ ہونے دیں گے

☆☆☆

حاصلِ مطالعہ

فرزاد علی

اسے دعائیں دے رہے ہو، تم بھی اسے گالیاں دے سکتے تھے۔“

شریف نوجوان نے تحمل سے جواب دیا۔
”جس کے پاس دینے کے لئے جو کچھ ہوتا ہے دوسروں کو دینی دیتا ہے، اس کے پاس گالیاں نہیں اس نے مجھے گالیاں دیں، میرے پاس دعائیں نہیں میں نے دعائیں دیں۔“
یہ شریف نوجوان حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جو برائیوں کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔
حمضہ حماد، کراچی

باتوں سے خوشبو آئے

☆ دنیا میں کوئی چیز اپنے آپ کے لئے نہیں ہے، دریا خود اپنا پانی نہیں پیتا، درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتا، سورج اپنے لئے حرارت نہیں دیتا، کیونکہ دوسروں کے لئے جینا ہی اصل زندگی ہے۔

(حضرت علی)

☆ جو دوست بنانے میں خوف زدہ ہوا سے بھی بچے دوست نہیں ملیں گے، زندگی میں ایک دوست مل گیا تو بہت ہے، دو مل گئے تو بہت زیادہ ہے، تین تو مل ہی نہیں سکتے۔

(مستنصر حسین تارڑ)

☆ ماں کی اصل خوب صورتی اس کی محبت ہے اور میری ماں دنیا کی امیر ترین اور خوب صورت ترین ماں ہے۔

(محمد علی جوہر)

مصباح فیصل، کوہاٹ

کامیابی کی زندگی

بڑی آزمائش، بڑا انعام
حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”جتنی بڑی بلا (آزمائش) ہے، اتنی ہی بڑی جزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔“

(یوں بھی کہا جاسکتا ہے جتنی بڑی آزمائش ہوتی ہے، اتنی ہی جزا اور اتنا بڑا انعام بھی ملتا ہے) پس اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے (یا اسے محبوب قرار دیتا ہے) تو اسے آزمائش اور مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے، پس جو مصیبت اور بلا پر خوش (راضی برضائے خداوندی) رہا، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی رضا مندی ہے، (یعنی اللہ ایسے بندوں سے یا قوم سے راضی ہو جاتا ہے) اور جو ناراض ہوا (اس بیماری یا بلا پر) تو اللہ بھی اس سے ناراض ہو جاتا ہے، (اس کے لئے اللہ کی ناراضی ہے۔)

شمر شیرازی، چوکی

مینارہ نور

ایک پچیس پچیس سالہ نوجوان جب یروشلم کی ایک گلی سے گزرا تو ایک شخص نے برابر سے نمودار ہو کر اسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔

”بے دین، گمراہ، ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے خرف کرنا چاہتا ہے، خدا تجھے ذلیل اور برباد کرے۔“

نوجوان نے مسکرا کر اس شریر آدمی کو دعائیں دینا شروع کر دیں، ایک تیسرے شخص نے حیرت سے دریافت کیا۔

”یہ شریر ہمیں گالیاں دے رہا ہے اور تم

☆ باطل ہیں وہ تمام اعتقادات اور تعلیمات جو انسان کو اس کی زندگی میں بد قسمت بنائے اور جھوٹے ہیں وہ سارے جذبے جو اسے مایوسی اور بدبختی کی طرف لے جائیں، انسان کا حق ہے کہ وہ زمین پر کامیابی کی زندگی بسر کرے۔ (خلیل جبران)۔

عائشہ شہباز، لاہور

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ حسن ایک تنہائی کی سلطنت ہے، جسے میں جاہ و حشم کی ضرورت نہیں۔ (بوعلی سینا)
☆ دنیا میں اس سے زیادہ کوئی چیز سخت نہیں کہ تمہاری کسی سے دشمنی ہو۔ (ابو الحسن)
☆ جو عقل مند سے لڑے وہ عزت کی توقع نہ رکھے، (سعدی)۔

☆ قیمتی مشورے محض قیمت وصول کرنے کے لئے ہوتے ہیں اور صحیح مشورے ناراضی مول لینے کے لئے۔ (جارج سٹیوان)

☆ اپنے خیالات کو اپنا جیل خانہ نہ بناؤ۔ (ٹیلیپیٹر)

☆ طنز وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ (سونفٹ)

☆ وہ آدمی عظیم ہے جو اپنا کام چلانے کے لئے دوسروں کے دماغوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (پیٹ)

☆ ذہانت گفتگو کا نمک ہے۔ (ہیزلیٹ)

☆ بے گل ہنسا، غیر ضروری گفتگو کرنا اور غلط جگہ بیٹھنا بے وقوفی ہے۔ (بیو مانٹ)

☆ نیک وہ عمل ہے جو لوگوں سے بے نیاز ہو کر کیا جائے۔

نسرین خورشید، جہلم

فرض شناس

غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر، سنگین خان کو مسجد کے دروازے پر چینگ کے لئے

سیکیورٹی گارڈ کی ڈیوٹی دی گئی، جمعہ کے وقت سب لوگ بغیر چینگ کے مسجد میں داخل ہو رہے تھے، ایک بزرگ نمازی نے سنگین خان کو اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

”سب لوگ ایسے ہی گزر رہے ہیں، چیک کیوں نہیں کر رہے ہو؟“

”واپسی پہ کمر لوں گا۔“ سنگین خان نے سکون سے جواب دیا۔

صائمہ مظہر، حیدر آباد

ان میں ایک

لڑکی نے لڑکے کو فون کیا۔

”آج رات ہمارے ہاں مت آنا، ابو کو معلوم ہو گیا ہے کہ رات کو ہم نے ان کی کار استعمال کی تھی اور وہ غصے میں پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔“

”نہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”ہم نے جن درجن پھر لوگوں کو نگر ماری تھی وہ ان میں سے ایک ہیں۔“

ایمان علی، ٹوبہ ٹیک سنگھ

وقت گزر جائے گا

دیکھو وقت گزر جائے گا

تم نے جس سے

جو کچھ بھی کہنا ہے کہہ لو

یوں نہ ہو کہ

اب کے جو تم پھڑو تو کچھ ایسے پھڑو

جیسے دو انجان سہافر

اک انجانے انیشن

اک دو بے مل کر پھڑویں اور کھو جائیں

تم کیا اک ٹیبل پہ بیٹھے سوچ رہے ہو؟

دیکھو!

وقت گزر جائے گا

شاہدہ اسد، گوجرانوالہ

یاد ماضی

نہ فکر فرادانہ یاد ماضی
نہ چین دل کو نہ بے قراری
نہ وصل کی لرزشیں نظر میں
نہ بے بسی ہجر کے سسکی
نہ حد سے لرزا ہوا جنوں وہ
نے بے گلی وہ پہلے جیسی
بس اک اداسی ہے دھیمی دھیمی
بس اک خوشی ہے نیکراں سی
بس اک بے نام کی جلن ہے
بس اک بے نام کی ٹھکن ہے
جو زندگی کے ادھورے پن کو
حدوں سے آگے بڑھا رہی ہے

صائمہ شائق، جڑانوالہ

دسمبر

وہ بے ارادہ سبھی تیلیوں میں رہتا ہے
کہ میرا دل مٹیوں میں رہتا ہے
الاؤ بن کے دسمبر کی سرد راتوں میں
تیرا خیال میرے طاؤں میں رہتا ہے
دانیال بحر، ملتان

انمول لفظوں کی مالا

○ یہ دنیا مکافات عمل کا نام ہے آج کسی کی راہ
میں تم پتھر رکھو گے تو آئے والا وقت تمہاری
راہ میں پہاڑ بن جائے گا۔
○ خاموشی ایسے پردے کا نام ہے جس کے
پیچھے لیاقت بھی ہو سکتی اور حماقت بھی ہو سکتی
ہے۔
○ وہ بات اکثر بہت انمول ہوتی ہے جس میں
الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں۔
○ ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین
عبادت ہے۔
○ سخاوت کرنے کے ساتھ احسان جتنا کمینہ

پن ہے۔

○ احساس کم تر اور احساس برتری میں مبتلا
انسان بھی کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔
○ جب دشمن پہ غلبہ پا لے تو اسے معاف کر دو۔
○ دنیا میں آنکھ والا وہ ہے جو پہلے اپنے آپ کو
غور سے دیکھے۔
○ مسکراتے رہو، مسکراہٹ ہماری روح کا
دروازہ کھول دیتی ہے۔
○ حیدر رضا، جھنگ

لفظوں کے موتی

○ وقت اور نصیب کسی لمحے بھی کسی کو زیر کر سکتا
ہے۔
○ کسی کو بھی معلوم نہیں، اس کا اگلا شکار کون ہو
گا۔
○ جب آپ پہلا قدم اٹھا لیتے ہیں، تہیہ کر لیتے
ہیں تو پھر واپسی نہیں ہوتی، گھڑا بے شک کچا
ہو پھر بھی پار پہنچا دیتا ہے۔
○ موت ایک بہت بڑے صبر کی مالک ہے اور
وہ سبھی بے صبری نہیں ہوتی۔
○ وقت ہر تصور کو بدل دیتا ہے، اس کے کونے
مڑ جاتے ہیں۔
○ اور رنگ بھورے ہونے لگتے ہیں، وقت
ڈھلوان پر لڑھکتی جب کی طرح اتنی تیزی
سے گزر جاتا ہے کہ نظروں اور چہروں کے
رنگ بدل جاتے ہیں۔
○ ہمت بھی عجیب پھولے ہوئے غبارے جیسی
ہوتی ہے۔
○ ذرا نا موافق بات کی سوئی جیسی، شکل ہی نہیں
حالت اور حالات تک بدل دیتی ہے۔
○ فاعذہ عبدالمنان، کراچی

اللہ کے لئے محبت کرنے والے
سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے
فرمایا۔

”ایک شخص اپنے ایک دینی بھائی سے
ملاقات کے لئے گیا تو اللہ عزوجل نے اس کے
راستے میں ایک فرشتہ بٹھا دیا اس نے پوچھا۔“
”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے جواب
دیا۔
”فلاں بھائی سے ملاقات کے لئے جا رہا
ہوں۔“ اس نے پوچھا۔
”اس سے کوئی کام ہے؟“ جواب دیا۔
”نہیں۔“ فرشتے نے پوچھا۔
”تمہارے درمیان کوئی رشتہ داری ہے؟“
اس نے کہا۔
”نہیں۔“ اس نے پوچھا۔
”اس نے تم پر کوئی احسان کیا ہے؟“ اس
نے جواب دیا۔
”نہیں۔“ اس نے پوچھا۔
”تو پھر کیوں اس سے ملاقات کر رہے
ہو؟“ اس نے کہا۔
”میں اللہ عزوجل کے لئے اس سے محبت
کرتا ہوں۔“ فرشتے نے کہا۔
”اللہ عزوجل نے مجھے تمہاری طرف بھیجا
ہے اور وہ تمہیں مطلع کرتا ہے کہ وہ (اللہ عزوجل)
تم سے محبت کرتا ہے اور اس نے تمہارے لئے
جنت واجب کر دی ہے۔“

عتیقہ منیر، سیالکوٹ

بھائی چارہ

ایک شخص حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ
عنه کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔
”میں اللہ عزوجل کے لئے آپ کو اپنا بھائی
بنانا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے فرمایا۔
”تم جانتے ہو بھائی چارے کا حق
کیا ہے؟“ اس نے عرض کیا۔
”اب بتا دیجئے۔“ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
نے فرمایا۔

”کہ تو اپنے دینار اور درہم کا مجھ سے زیادہ
حق دار نہ ہوگا۔“ اس نے عرض کی۔
”میں ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچا۔“
آپ نے فرمایا۔
”پھر چلے جاؤ۔“

(اقتباس از فیضان احیاء العلوم)
صائمہ سلیم، سمرات

اقوال یونانی مفکرین و حکمائے یورپ

☆ بات کو پہلے دیر تک سوچو پھر منہ سے نکالو اور
پھر اس پر عمل کرو۔ (افلاطون)

☆ ہر ایک نئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے مگر دوستی
جتنی پرانی ہوتی جتنی ہی عمدہ اور بھلی معلوم ہوتی
ہے۔ (ارسطو)

☆ خاموشی سب سے زیادہ آسان کام اور سب
سے زیادہ نفع بخش عادت ہے۔ (ارسطو)

☆ تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی
زبان ہے۔ (سٹراٹ)

☆ غصہ بھی جیسی قابل سے قابل انسان کو بھی
بے وقوف بنا دیتا ہے۔ (بقراط)

☆ جو شخص اپنے نفس کو قابو میں نہیں رکھ سکتا وہ
بہت سے لوگوں کو کیا قابو میں رکھ سکے گا۔
(اقلیس)

☆ دانادہ ہے جو گردش ایام سے تنگ دل نہ ہو۔
(اقلیس)

☆ کسی آدمی کو جب اس کی بساط سے زیادہ دنیا
مل جاتی ہے تو لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ
برا ہو جاتا ہے۔ (اقلیس)

☆ علم سے آدمی کی وحشت اور دیوانگی دور ہو
جاتی ہے۔ (ہکین)

☆ تمام اعضاء جسمانی میں زبان سب سے
زیادہ نافرمان ہے۔ (قیث غورث)

تازیہ جمال، پکوال

شگفتہ رحیم --- فیصل آباد
میں اس کے ہاتھ نہ آؤں وہ میرا ہو کے رہے
میں گر پڑوں تو مری پستیوں کا ساھی ہو
کرے کلام جو مجھ سے تو میرے لہجے میں
میں چپ رہوں تو مرے تیروں کا ساھی ہو

کو بچے کو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے پریت ترے بستی تری صحرا ترا
تو با وفا تو مہرباں ہم اور تجھ سے بدگماں
ہم نے تو پوچھا تھا ذرا یہ وصف کیوں ٹھہرا

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
حمیرا رضا --- ساہیوال

میں تم کو چاہ کر پچھتا رہا ہوں
کوئی اس زخم کا مرہم نہیں ہے

مری طلب تھا اک شخص وہ جو ملا نہیں تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا بھول گیا سوال بھی

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجیب حال تھا جب اس سے ہو رہے تھے الگ
خیال ان کا بھی آیا بھی تمہیں جانناں
جو تم سے دور بہت دور جی رہے تھے الگ
ماریہ عثمان --- سرگودھا

عقل کے شہر میں آیا ہے تو یوں گم ہے جنوں
لب کوئی کلو بھی بے ساختہ پن یادیں

اول اول تو نہ تھے واقف آداب نفس
اور اب رسم و رہ اہل چمن یادیں
فراز اس شہر میں کس کو دکھاؤں زخم اپنے
یہاں تو ہر کوئی مجھ سا بدن پہنے ہوئے ہے

سنگ دل ہے وہ تو کیوں اس کا گلہ میں نے کیا
جبکہ خود پتھر کو بت کو خدا میں نے کیا
کیسے ناپائوس لفظوں کی کہانی تھا وہ شخص
اس کو کتنی مشکلوں سے ترجمہ میں نے کیا
ماروح آصف --- خانیوال

گلہ فضول تھا عہد وفا کے ہوتے ہوئے
سو چپ رہا ستم ناروا کے سہتے ہوئے
یہ قربتوں میں عجب فاصلے پڑے کہ مجھے
ہے آشنا کی طلب آشنا کے ہوتے ہوئے

نہ سہہ سکا جب مسافروں کے عذاب سارے
تو کر گئے کوچ میری آنکھوں سے خواب سارے
بیاض دل پر غزل کی صورت کہے ہیں
ترے کرم بھی ترے ستم بھی حساب سارے

دو چار نہیں مجھ کو فقط ایک بتا دو
جو شخص اندر سے بھی باہر کی طرح ہو
صائمہ ابراہیم --- فیصل آباد

وہ اپنے زخم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اسے گمان کبھی نہیں میں نہیں رہا اس کا
ہمیں نے ترک تعلق میں پہل کی فراز
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اس کا

ٹھٹھ گیا ہے تو اس کا ساتھ کیا مانگوں
راہی عمر ہے غم سے نجات کیا مانگوں
ساتھ ہوتا تو ہوتی ضرورتیں بھی بہت
میری جان کے لئے کائنات کیا مانگوں

وقت بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے
موت سے اور بڑھ گئی برہمی مزاج دوست
بہ وہ کرے علاج دوست جس کی سمجھ میں آ سکے
فا عبد الرحمان --- راولپنڈی

کہہ رہی ہے تمہیں چھو کے آنے والی ہوا
اس میں ہی نہیں بے قرار تو بھی ہے
میری محبت میں یہ کیا احساس ہے
تو دور ہو کر بھی میرے دل کے پاس ہے
میری تیری تمنا کو دل سے مٹاؤں کیسے
سمندر ہے اور مجھے تیری پیاس ہے

نے کیوں یہ گماں ہوتا ہے
کہ وہ نظر آئے گا سر راہ چلتے وقت
ما لکھ دے گا اسے میری قسمت میں
کی قبولیت کی گھڑی میں شام ڈھلتے وقت
مددہ نعیم --- شیخوپورہ

رہے میں کیا تھا پر اب جانے کیا ہو گیا ہوں
کینے میں شکل دیکھے اک زمانہ ہو گیا
تم ہوئی ڈاڑی گرتے ہوئے پتے رباض
گیا ماہ دسمبر سال بوڑھا ہو گیا

ت گزرا تو یہ ملال ہوا
اک زندگی کا سال ہوا
نی شدت سے کوئی یاد آیا
ج جینا بڑا محال ہوا

بنے تو مہک انھیں دل کی گلیاں

تیری اک مسکراہٹ سے ہماری عید ہو جائے
زاہدہ اظہر --- حافظ آباد
کھلا کھلا ہو یہ جہاں دھلا دھلا سماج ہو
تیری زمین پہ اے خدا محبتوں کا راج ہو

کتنی گم گشتہ بہاروں کا پتا دیتے ہیں
صحن گلشن میں یہ سوکھے ہوئے پتے یارو
اک پری زاد کی رسوائی کا ڈر ہے ورنہ
ہم بھی سادوں کی طرح گل کے برستے یارو

مسکراتے ہوئے چہروں سے تبسم کی ضیا
لوٹ لیتے ہیں یہ دستور ہے انسانوں کا
فضہ بخاری --- رحیم یار خان
وہ کیسے لوگ تھے یارب جنہوں نے پالیا تجھ کو
ہمیں تو ہو گیا ہے دشوار ایک انسان کا ماننا

یہ درد کے کلکے ہیں اشعار نہیں ساغر
ہم کالج کے دھاگوں میں زخموں کو پروتے ہیں

ادروں کے لئے دھوپ میں چپ چاپ کھڑے ہیں
دیکھنے کوئی آداب ونا سنگ و شجر سے
حناز بیر احمد --- بہاولپور

وہ وقت بھی دیکھے ہیں تاریخ کی گھڑیوں نے
لحوظ نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اپنے کردار کو موسم سے بجائے رکھنا
لوٹ کر پھول میں واپس نہیں آتی خوشبو

محبت میں کوئی صدمہ اٹھانا چاہیے تھا
بھلایا تھا جسے وہ یاد آنا چاہیے تھا
میری اپنی اور اس کی آرزو میں فرق یہ تھا
مجھے بس وہ اور اسے سارا زمانہ چاہیے تھا
ام رباب --- ساہیوال

کیوں نہیں چلتے کہ جانا ہے بہت دور ابھی

کیوں یہاں رک گئے بے کار تماشا بن کر
اک میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں

میری آنکھوں میں چھپی اک کمی سی رہ گئی
میں نے جب بھی بات کی اک کمی سی رہ گئی
میں تو کچھ ایسا ہی تھا جو کہا بے ربط تھا
لیکن اس کے بعد بھی اک کمی سی رہ گئی
نغمہ بخاری
اک بات بہت تلخ کہی تھی اس نے
بات تو یاد نہیں یاد ہے لہجہ اس کا

تیری یاد اور برف باری کا موسم
سلگتا رہا دل کے اندر اکیلے
ارادہ تھا جی لوں گا تجھ سے بچھڑ کر
گزرتا نہیں دبیر اکیلے

ہم تو بس یہ بتاتے کہ جس شب مجھے چھڑ کر تم چلے گئے
آسائوں سے شعلہ نکلتا رہا چاند جلتا رہا
وہ دبیر کہ جس میں کڑی دھوپ بھی عیشی لگنے لگی
تم نہیں تو دبیر سلگتا رہا چاند جلتا رہا
شمرین زاہرہ
گزرے لکھن کو بھلانے میں کچھ وقت لگے گا
اپنی ذات سے باہر نکلنے میں کچھ وقت لگے گا

ٹوٹ جاتے ہیں سبھی رشتے مگر
دل سے دل کا رابطہ اپنی جگہ
دل کو لے تجھ سے نہ ملنے کا یقین
تجھ کو پانے کی دعا اپنی جگہ

پچھلے برس تھا خوف و روز محبت کے گلاب
مجھ کو معلوم نہ تھا درد کسے کہتے ہیں
نمرہ سعید
اداکارہ

اس دل کے بہنے کو یہ سامان بہت ہے
وہ اپنی جفاؤں پر پشیمان بہت ہے
اب گئے بھی اجر جائیں گے بستی کے کئی گھر
اس سال بھی برسات کا امکان بہت ہے

یہ ہی نہیں ہے کہ ہمیں توڑ کر گیا ہے کوئی
اسے بھی خود کو بہت دیر جوڑنا ہو گا

دوسروں کے سپرد کر کے اسے
خود کو دھوکا دیا تھا خود میں نے
کس قدر یاد نگار لمحہ تھا
اس کو رخصت کیا تھا خود میں نے
طاہرہ رحمان
دکھ ہزاروں دیے ہیں گئے سال نے
دیکھو دیتا ہے کیا اس نئے سال نے

ساخس ایک ہو تو بتلا میں
اس کو کھونے کا اس کو رونے کا
بس یہی زندگی کا حاصل ہے
ایک احساس اپنے ہونے کا

ایک تیری تمنائے کچھ ایسا نوازا ہے
نامی ہی نہیں جاتی اب کوئی دعا ہم سے
عمران علی
حاصل ہو

اس ایک سال میں کیا کیا نہ ہوا عادل
کچھ اٹھیں بھی ملیں کچھ اٹھیں بھی

پھر وہی وعدہ جو اقرار نہ بنے
پھر وہی بات جو اثبات نہ ہونے

بستی تھی سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی میری خواب پریشان بھی مرا ہے
جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے مری
جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ سال بھی مرا ہے

عظمیٰ جبین

درد کچھ اور عطا کر کہ ترے درد نواز
یہ سخاوت ترے معیار سے کم جانتے ہیں
ہم کہ کھلتے تھے بھی ضبط جنوں کی رت میں
حرف شیریں کو بھی اب قطرہ سم جانتے ہیں

خشم کے آنسو پھول یہ یہ تو وہی قصہ ہوا
آنکھیں میری بھیگی ہوئی چہرہ تیرا اترتا ہوا
برسات میں دیوار و در کی ساری تحریریں میں
دھویا بہت مٹا نہیں تقدیر کا لکھا ہوا

دیتے ہیں اجالے مرے سجدوں کی گواہی
میں چھپ کے اندھیروں میں عبادت نہیں کرتا
دنیا میں قاتل اس سا مناق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا
درد منیر
خود نمائی تو نہیں شیوہ ارباب وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

لفظ عشق میں پیش آئے سوالوں کی طرح
ہم پریشان ہی رہے اپنے خیالوں کی طرح
ذکر جب ہو گا محبت میں تباہی کا کہیں
یاد ہم آئیں گے دنیا کو حوالوں کی طرح

جبتو میں تری پھرتا ہوں نجانے کب سے
آبلہ پا ہیں مرے ساتھ زمانے کب سے
میتیں ہیں نہ عذابوں کا تسلسل اب تو
میں سے رخ پھیر لیا خدا نے کب سے

چوکی
پری شہناز
پری شہناز
پری شہناز

پری شہناز
پری شہناز
پری شہناز
پری شہناز

کسی نہ ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں
میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

جبتو میں تیری پھرتا ہوں نجانے کب سے
آبلہ پا ہیں میرے ساتھ زمانے کب سے
وہ تو جنگل سے ہواؤں کو چرا لاتا ہے
اس نے سیکھے ہیں دیے گھر میں جلانے کب سے
حمزہ حماد
پہ سوچ کر کہ نہ ہو تاک میں خوشی کوئی
عموں کی اوٹ میں خود کو چھپا لیا میں نے
کسی کی آس تو مجھ کو رہی سو میں تڑپا
شب فراق بتا تیرا کیا لیا میں نے

بات تو کچھ نہیں تھی لیکن اس کا ایک دم
بات کو ہونٹوں میں رکھ کر روکنا اچھا لگا

مجھ سے بچھڑا تھا وہ پہلے بھی مگر
اب کے زخم نیا ہو جیسے
یوں بہت ہنس کے ملا تھا لیکن
دل ہی دل میں خفا ہو جیسے
مصباح فیصل
کواہٹ

اپنی زندگی بھی اس چاند کی طرح ہے وحی
جو خوبصورت تو دکھتا ہے مگر ہے بہت اکیلا

کس طرح نبھے اپنی شہریار سے محسن
اس کا ہم نشین سایہ میرا ہم سفر سورج

ابھیں گے ابھی کئی بار لفظ سے مفہوم
سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں
عائشہ شہباز
لاہور

نہیں تو آنے کو تھی پر دل پرانے قصے لے بیٹھا
اب خود کو بے وقت سلانے میں کچھ وقت لگے گا

زندگی کیسے بسر ہو گی ہم کو تابش
میر آیا ہے نہ آشفہ سری آتی ہے
☆☆☆

رنگ حنا

بائیں ہستی

ایمن عزیز، میانوالی

منزل

نایاب دولت مند ہونے والا ایک شخص ایک ٹرپول انتہائی کے دفتر پہنچا اور نوٹوں کی ایک گڈی کاؤنٹر پر پھینک کر بولا۔

”جلدی سے ایک ٹکٹ بنا دو۔“

”کہاں کا جناب؟“ بگنگ کلرک نے دریافت کیا۔

”کہیں کا بھی بنا دو میرا کاروبار ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔“ نوڈولیتے نے جواب دیا۔

شفقتہ رحیم، فیصل آباد

برطرفی

باس نے نوجوان کلرک کو بلایا اور کہا۔

”میں نے سنا ہے کہ تم بہت زیادہ محنت سے کام کر رہے ہو بلا معاوضہ اور ٹائم لگانا پڑے تو بھی انکار نہیں کرتے ہر شعبے میں ضرورت پر کام سنبھال لیتے ہو۔“

”جی سر!“ نوجوان کا چہرہ دکنے لگا۔

”ان ہی وجوہات کی بنا پر میں تمہیں

ملازمت سے برطرف کر رہا ہوں وہ تم ہی جیسے

لوگ ہوتے ہیں جو یہاں سے کچھ سیکھتے ہیں اور

پھر جا کر مقابلے پر کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔“

حمیرا رضا، میانوالی

شیطان کی ریٹائرمنٹ

آج کل یہ خبر سننے میں آئی ہے کہ ہمارے

سب سے بڑے لیڈر شیطان صاحب ریٹائر ہو

رہے ہیں ہمارا خیال ہے کہ یہ خبر کسی دکن

پھیلائی ہوگی بہر حال اس خبر پر فارغ التحصیل نوجوان خوش نظر آ رہے ہیں وجہ پوچھیں تو کہتے ہیں۔

”ریٹائرمنٹ سے ایک آسامی تو خالی ہوگی

شیطان کی ریٹائرمنٹ کا سن کر اپنی ذمہ داری کا

احساس ہونے لگا ہے۔“

”شیطان دیکھنے میں کیسا ہے۔“ ایک بار

ہم نے مولوی صاحب سے پوچھا تو جواب دینے

کے بجائے ہمارا منہ دیکھنے لگے، وہ شخص جسے سب

برا کہیں اس کا برا ہونا بھی مشکوک ہو جاتا ہے،

شیطان کو پہلے اچھے، برا کہتے تھے، اب برے برا

کہنے لگے ہیں پہلے اس نے شیطان بننے کے لئے

انسان کو مجبور نہیں کیا اب اسے شیطان رہنے کے

لئے انسان کو مجبور کرنا پڑتا ہے جہاں موسیقی ہوتی

ہے وہاں شیطان نہیں ہوتا، شاید وجہ یہ ہے کہ وہ

سمجھتا ہے کہ یہاں میرے بغیر بھی کام چل رہا

ہے ویسے بھی رمضان المبارک میں اسے ایک ماہ

کے لئے قید کر دیا جاتا ہے تو ہم اس کے بغیر ہی

سارے کام چلا لیتے ہیں۔۔۔

(ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب عکس برعکس سے)

مار یہ عثمان، سرگودھا

دولت اڑتی ہے

ایک کاروباری آدمی اپنے دوست سے کہہ

رہا تھا۔

”میں اس کمپنی کی سالانہ رپورٹ پڑھ رہا

تھا، جس میں میرا بھی شیئر تھا ایک جگہ اس رپورٹ

میں لکھا تھا دولت اڑتی ہے، تین لاکھ ڈالر اڑ گئے

میں نے بوڑھے کے چیئر مین کو خط لکھا کہ آئندہ

رپورٹ میں سچ کر لی جائے کہ دولت اڑتی نہیں،

بہی ہے اور تین لاکھ ڈالر بہہ گئے۔“ یہ کہتے کہتے

اس کا لہجہ دردناک ہو گیا۔

”پھر کیا ہوا۔“ دوست نے اشتیاق سے

پوچھا۔

”میرا خیال تھا اس سلسلے میں اکاؤنٹینٹ کی غلطی تسلیم کر لی جائے گی لیکن چیئر مین کا جواب آیا دولت واقعی اڑتی ہے؟ جناب آج کل ہمارا اکاؤنٹینٹ بیرون ملک میں ہے۔“

چار دن کی چاندنی

ایک آدمی کی شادی کو چند روز ہی ہوئے

تھے وہ سسرال والوں کے حسن و سلوک اور خاطر

مدارت سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنے سسرال کے

مکان کے مین گیٹ پر ایک سختی لگا دی جس پر لکھا

تھا۔

”سسرال جنت ہے۔“

اسی گھر کے دوسرے اہلکار نے جس کی

شادی کو کچھ عرصہ گزر چکا تھا، اس تحریر کے نیچے لکھ

دیا۔

”چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات

ہے۔“

ماروخ آصف، خانیوال

فریاد

ایک صاحب ایک قبر کے پاس کھڑے رو

رو کر کہہ رہے تھے۔

”تم تو چلے گئے ہو مگر میری زندگی کو خزاں

بنا گئے۔“ ایک راہ گیر نے ان سے ہمدردی سے

پوچھا۔

”اس قبر میں آپ کا کوئی عزیز رشتے دار یا

کوئی دوست دفن ہے۔“

ان صاحب نے جواب دیا۔

”جی نہیں! یہ میری بیوی کے پہلے شوہر کی

قبر ہے۔“

صائمہ ابراہیم، فیصل آباد

پریشانی

ایک سردار اکثر سوچ میں ڈوبا رہتا تھا ایک

دن اس سے کسی نے پوچھا۔

اشتہار

ہیرنگی جس گھڑی را تجھے کے سنگ

اس کا ماما آن پکا خواخواہ

چل رہے تھے اشتہار اچھے بھلے

اک ڈراما آن پکا خواخواہ

سمن رضا، چیچہ وطنی

حسن کارکردگی

پولیس کے پاس ایک لاپتہ ملزم کے چھ

مختلف ٹوٹے تھے، جو مختلف زاویوں کے کھینچے گئے

تھے، پولیس نے ملزم کی تلاش میں ان تصویروں

کی نقلیں صوبے کے تمام تھانوں کو بھیج دیں، تاکہ

ملزم پکڑا جاسکے، اور پہچاننے میں آسانی ہو، کچھ

دن کے بعد ایک تھانے سے اطلاع موصول

ہوئی، چھ ملزموں کی تصویریں مل گئیں، ان میں

سے پانچ کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور ایک کی تلاش

جاری ہے۔

شاہین سلیم، دیپالپور

کارگرفتنہ

ایک فرم کے مالک کو انتہائی سخت الفاظ پر

مبنی دوسرا نوٹس موصول ہوا، جس میں اسے بتایا

گیا کہ جس ادا نہیں کیا تو اس کے خلاف کارروائی

کی جائے گی فرم کا مالک گھبرا ہوا نوٹس آفس

پہنچا، نوٹس جمع کر دیا اور اس نے معذرت کی کہ

پہلا نوٹس کہیں کم ہو گیا تھا۔

نوٹس ایڈسرنے بتایا۔

”ہم پہلا نوٹس بھیجتے ہی نہیں ہیں، ہمارا

تجربہ ہے کہ دوسرا نوٹس دینا موثر ہوتا ہے۔“

”سردار جی! اتنے پریشان کیوں رہتے ہو اور کیا سوچتے رہتے ہو۔“
اس پر سردار نے جواب دیا۔
”یار یہ بڑی پریشانی کی بات ہے کہ میری بہن کے دو بھائی ہیں اور میرا صرف ایک بھائی ہے۔“

دفاع عبدالرحمان، راولپنڈی

فوج اور عورت

ایک فرانسیسی جرنیل کی ملاقات جبرس کی ایک مشہور اداکارہ سے ہوئی جرنیل نے بڑے طنز لہجے میں کہا۔
”کیا آپ کو خبر ہے کہ جتنا فرانسیسی فوج کا خرچ ہے اس سے دگنا فرانس کی عورتوں کا ہے۔“
اداکارہ بولی۔
”یہ تو ایسی جگہ کی بات نہیں، جتنے فرانسیسی فوج کے کارنامے ہیں اس سے دگنے فرانس کی عورتوں کے کارنامے ہیں۔“
سدرہ نعیم، شیخوپورہ

کنگال کے دوست

”جب سے وہ کنگال ہوا ہے اس کے آدھے دوست اسے منہ نہیں لگاتے۔“
”بانی آدھے؟“
”نہیں ابھی خبر نہیں کہ وہ دیوالیہ ہو چکا ہے۔“
زاہدہ اعظم، حافظ آباد

مضبوط نیفہ

پندرہ برس کی ملازمت کے بعد سردار جی کے ملازم نے پہلی بار احتجاج کیا۔
”سردار جی آپ نے نوکری دیتے وقت روٹی، کپڑے کا وعدہ کیا تھا، روٹی تو خیر یہی ملتی رہی ہے، اب بھی پہننے کو کپڑا بھی دیجئے۔“
سردار جی بولے۔
”اچھا یہ بات ہے تو سب سے بھیلی کوٹھڑی

کا دروازہ کھولو اور اپنے پہننے کا کپڑا لے آؤ۔“
ملازم خوشی خوشی ہو گیا، کوٹھڑی کھولی تو جالوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا، غور سے دیکھا تو کونے میں ایک پیتھڑا پر نظر آیا، اٹھایا تو دیکھا کہ سردار جی کا پرانا کچھا ہے اور آگے پیچھے دونوں طرف سے پھنسا ہوا ہے، چڑکے سردار جی کو دکھانے ہاتھ میں اٹھائے باہر لایا اور جل کر بولا۔
”اس کپڑے کو آپ کہہ رہے تھے؟“
”ہاں یہی ہے، نیفہ تو مضبوط ہے، آگ کا پچھا نیا لگو الینا۔“

نفیہ بخاری، رحیم یار خان

غلطی

ایک سکھ کو مقدمہ کی تاریخ پر جانبدار سے امرتسر پہنچنا تھا، گاڑی چلنے سے کچھ دیر پہلے وہ بھاگا بھاگا گاڑی کے پاس گیا، گاڑی بھی سکھ ہی تھا۔
”سردار جی!“ وہ منت سے بولا۔
”میرے مقدمے کی بڑی ضروری تاریخ ہے مجھے یہ بری عادت ہے کہ سو جاؤں تو کچھ ہوش نہیں رہتا، یہ نہ ہو کہ امرتسر کی بجائے لاہور پہنچ جاؤں، ذرا امرتسر پر مجھے یاد سے جگا دیجئے گا۔“
یہ کہہ کر وہ واپس گیا مگر کوٹھڑی دیر بعد پھر بھاگا ہوا پہنچا اور کہا۔

”سردار جی! ایک بات بھول گیا ہوں، نیند میں میرے حواس ٹھکانے نہیں ہوتے، کوئی جگائے تو میں خواخواہ گالیاں دینے لگتا ہوں، آپ کچھ پروا نہ کیجئے گا، مجھے پکڑ دھکڑکے اسٹیشن پر اتار دیجئے گا، واہ کورو کا واسطہ میری بات مت بھولنا۔“
یہ کہہ کر وہ اپنے ڈبے میں جا سویا۔
آنکھ کھلی تو دیکھا کہ لاہور اسٹیشن آگیا ہے، نقشوں سے شعلے برساتا نیچے اترا، گاڑی کے ڈبے میں جا کر گاڑی کو اتار دیا اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔
”مجھے کہا نہیں تھا کہ مجھے امرتسر اتار دینا۔“

گالیوں کے جواب میں سکھ گاڑی حب چاپ سر جھکائے کھڑا تھا، ایک مسافر کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی، اس نے گاڑی کے قریب جا کر کہا۔
”کیوں جی! یہ اتنی گالیاں بک رہا ہے، آخر بات کیا ہوئی۔“
گاڑی بولا۔

”اجی اس نے کیا گالیاں دینی ہیں، گالیاں تو اس نے دی تھیں جسے میں نے امرتسر اسٹیشن پر اتار دیا تھا۔“

حناز بیر احمد، بہاولپور

شوہر کی بیماری

”ڈاکٹر!“ ایک مشہور نفسیات کی نرس نے اس سے کہا۔
”برآمدے میں ایک خاتون کھڑی ہیں جو آپ سے فوراً ملنا چاہتی ہیں۔“
”کیا اس نے وقت مقرر کر رکھا ہے۔“
”نہیں وقت تو مقرر نہیں کیا، لیکن اگر اس نے اس شتر مرغ سے چھکارا نہ پایا تو جنہوں نے وقت مقرر کر رکھا ہے، وہ سب کے سب فرنٹ ہو جائیں گے۔“
”شتر مرغ؟“

”ہاں وہ خاتون اپنے ساتھ ایک شتر مرغ بھی لائی ہیں، جس نے آفت چارھی ہے۔“
”اچھا اسے فوراً اندر لے آؤ۔“
دروازہ کھول کر کپڑوں سے لدی پھندی ایک عورت داخل ہوئی ساتھ ساتھ شتر مرغ بھی چلتا ہوا آکھڑا ہوا۔
”بیٹھے۔“ ڈاکٹر نے عورت سے کہا۔
”ہاں اب بتائیے آپ کو کیا بیماری ہے۔“
”ڈاکٹر صاحب! مجھے تو کوئی بیماری نہیں، بیماری میرے خاوند کو ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ شتر مرغ ہے۔“

ام رباب، ساہیوال

ذوق تماشا

جرچل کے ایک مداح نے ایک بار بڑی عقیدت سے پوچھا۔
”آپ یہ دیکھ کر خوش تو بہت ہوتے ہوں گے کہ جب بھی آپ تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو بال کھینچ بھر جاتا ہے۔“
”ہاں مسرت تو ہوتی ہے مگر ہمیشہ ہی خیال آ جاتا ہے کہ اگر تقریر کی بجائے مجھے پھانسی پہ لٹکایا جا رہا ہوتا تو خلقت تین گنا زیادہ ہوتی۔“
نیسہ بخاری، انک

دونوں کے صنم خاکی

ایک کراہیہ دار، کراہیہ ادا نہ کرتا تھا، مالک مکان نے بہت زور مارا مگر وہ کس سے کس نہ ہوا، مالک مکان نے عاجز آ کر ایک ترکیب سوچی، بند لفافے میں اپنی چھوٹی بچی کی ایک تصویر بھیجی جس پر لکھا تھا۔
”رزم کیوں چاہیے اس کی وجہ۔“
تیسرے دن کراہیہ دار کا ایک خط ملا جس میں ایک کافر ادا جینے کی تصویر تھی، نیچے لکھا تھا۔
”رزم کیوں نہیں ملتی اس کی وجہ۔“
شمرین زاہرہ، خان پور

قدرت کی صنعت

سائنس مصنوعات کی ایک بڑی نمائش میں دو اخبار نویسوں کا جانا ہوا، چاروں طرف نئی نئی مشینیں دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے، ایک کونے میں شیشے کے مرتبان کے اندر رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں، ایک بولا۔
”بھئی آخر اس کا اس نمائش سے کیا تعلق؟“
دوسرے نے جواب دیا۔
”یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ قدرت نے بھی چند چیزیں بنائی تھیں۔“

☆☆☆

طاہرہ رحمان: کی ڈائری سے ایک غزل
سرکتا جائے ہے رخ سے نقاب آہستہ آہستہ
نکلتا آ رہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ
جوان ہونے لگے جب وہ تو ہم سے کر لیا پردہ
حیا یکنخت آئی اور شباب آہستہ آہستہ
شب فرقت کا جاگا ہوں فرشتو اب تو سونے دو
کبھی فرصت میں کر لینا حساب آہستہ آہستہ
سوال وصل پر ان کو عذو کا خوف ہے
دبے ہونوں سے دیتے ہیں جواب آہستہ آہستہ
وہ بے دردی سے سر کاٹے امیر اور میں کہوں ان سے
حضور آہستہ آہستہ جناب آہستہ آہستہ
عمرانہ علی: کی ڈائری سے ایک نظم

ایسے کاغذ پر پھیل جاتے ہیں
حادثے کے مقام پر جیسے
خون سوکھتے نشانوں پر
چاک سے لائیں لگاتے ہیں
پھر دبیر کے آخری دن
ہر برس کی طرح اب کے بھی
ڈائری ایک سوال کرتی ہے
کیا خبر اس کے آگے تک
میرے ان بے چراغ صفحوں سے
کتنے ہی نام کٹ گئے ہوں گے
کتنے نمبر بھر کے رستوں میں۔
گرد ماضی سے اٹ گئے ہوں گے
خاک کے ڈھیروں کے دامن میں
کتنے طوفان سمٹ گئے ہوں گے
ہر دبیر میں سوچتا ہوں
ایک دن اس طرح بھی ہوتا ہے
رنگ کو روشنی میں کھوتا ہے
اپنے اپنے گھروں میں رہی ہوئی
ڈائری دوست دیکھتے ہوں گے
ان آنکھوں کے خاک دانوں میں
ایک صحرانہ پھیلتا ہوگا
اور کچھ بے نشان صفحوں سے
نام میرا بھی کٹ گیا ہوگا
عظمتی جیس: کی ڈائری سے ایک غزل

نہ ہم رہے نہ وہ خوابوں کی زندگی ہی رہی
گماں گماں ہی مہک خود کو ڈھونڈتی ہی رہی
حریم شوق کا عالم بتائیں کیا تم کو
حریم شوق میں بس شوق کی کمی ہی رہی

آخری چند دن دبیر کے
ہر برس ہی گراں گزرتے ہیں
خواہشوں کے نگار خانے سے
کیسے کیسے گماں گزرتے ہیں
رفتگاں کے بھرے ساپوں کی
ایک محفل سی دل میں جیتی ہے
کتنے نمبر پکارتے ہیں مجھے
جن سے مربوط بے نوا تھی
اب فقط میرے دل میں جیتی ہے
کس کس پیارے پیارے
ناموں پر ریتی بد نما سی لکیریں
میری آنکھوں میں پھیل جاتی ہیں
دوریاں دائرے بناتی ہیں
دھیان کی سیرھیوں پر کیا کیا عکس
مشغلیں دور کی جلاتے ہیں
نام جو کٹ گئے ہیں ان کے حرف

پس نگاہ تغافل تھی اک نگاہ کی تھی
جو دل کے چہرہ حسرت کی تازگی ہی رہی
بدل گیا سبھی کچھ اس دیار یاداش میں
گلی تھی جو تری جاں وہ تری گلی ہی رہی
تمام دل کے محلے اجڑ چکے تھے مگر
بہت دنوں تو ہنسی ہی رہی خوشی ہی رہی
سناؤں میں کیسے افسانہ خیال ملال
تیری کمی ہی رہی اور مری کمی ہی رہی
وردہ منیر: کی ڈائری سے ایک نظم

اسے کہنا کتابوں میں رکھے سوکھے ہوئے کچھ
پھول
اسے کہنا کہ اس کی جھیلی آنکھیں کسی منظر پر چھا
جائیں
تو سب منظر یونہی پھر بھیگ جاتے ہیں
اسے کہنا کہ ٹھنڈی برف پر کوئی کسی کے ساتھ چلتا
ہے

تو قدموں کے نشان پھر سے اسی کے لوٹ آنے
کے ساتھ
نشان دل پر بناتے ہیں
اسے کہنا کہ اس کی بھینکتی آنکھوں کا وہ آنسو
ستارے کی طرح اب بھی ہمیں شب بھر جگاتا ہے
اسے کہنا کہ بارش کھڑکیوں پہ اس کے آنسو پینٹ
کرتی ہے

اسی کا نام تھی ہے
اسے ہی لگتا ہی ہے
اسے کہنا کہ خوشبو، چاندنی، تارے، صبا، رستے،
گھٹا، کاجل
محبت چاندنی، شبنم، ہوا سیں، رات، دن، بادل،
سبھی ناراض ہیں ہم سے
اسے کہنا جدائی کے درختوں پر جو سوکھی ٹہنیاں ہیں
وہ ساری برف کی چادر میں کب کی ڈھک چلی
ہیں

اور ان شاخوں پہ یادوں کے

جو تپتے تھے نہری ہو گئے ہیں
اسے کہنا دبیر ہو گیا ہے
اور سب بستہ وہ بھیگی جنوری پھر لوٹ آئی ہے
اسے کہنا کہ لوٹ آئے
شمرہ شیرازی: کی ڈائری سے ایک نظم
دیکھ دبیر اب مت آنا
میرے اندر کتنے صحرا پھیل چکے ہیں
تنہائی کی ریت نے میرے
سارے دریا پاٹ دیے ہیں
اب میں ہوں
اور میرے بھرپن کی بوجھلتا ہے
دیکھ دبیر

تیری برفاب شبوں میں
تیری بے خواب شبوں میں
خواب سوئے کون بیٹے گا
روح کے اندر گرتی برفیں کون چنے گا
دیکھ دبیر اب مت آنا
اور اگر تو آئے بھی تو
اپنے دکھ کی برف پہن کر
دھوپ دیاروں تک
مت جانا
دیکھ دبیر
اب مت آنا

حمضہ حماد: کی ڈائری سے ایک غزل
تجھ کو دیکھا ہے جو دریا نے ادھر آتے ہوئے
کچھ بھور ڈوب گئے پانی میں چکراتے ہوئے
ہم نے تو رات کو دانتوں سے پکڑ رکھا ہے
چھینا جھپٹی میں اتن کھلتا گیا جاتے ہوئے
چھپ سے پانی میں اتر جاتی ہے گلزار شفق
سرخ ہو جاتے ہیں رخسار بھی شرماتے ہوئے
میں نہ ہوں گا تو خزاں کیسے کٹے گی تیری
شوخ تپتے نے کیا شاخ سے مرجھاتے ہوئے
حسرتیں اپنی بلکیں نہ تپتیوں کی طرح

ہم کو آواز ہی دے لیتے ذرا جاتے ہوئے
سی لئے ہونٹ وہ پاکیزہ نگاہیں سن کر
میںکی ہو جانی ہے آواز بھی دہراتے ہوئے
مصباح فیصل: کی ڈائری سے ایک غزل

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا
وہ کہ خوشبو کی طرح پھیلا تھا میرے چاروں
میں اسے محسوس کر سکتا تھا جھو سکتا نہ تھا
رات بھر جھپیلی کی آہٹ کان میں آتی رہی
جھانک کر دیکھا گل میں کوئی بھی آیا نہ تھا
آج اس نے درد بھی علیحدہ کر لئے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہ تھا
یہ کبھی دیرانیاں اس کے جدا ہونے سے تھیں
آنکھ دھندلائی ہوئی تھی شہر دھندلایا نہ تھا
یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدم
بھول جانے کے سوا اب کوئی بھی چارہ نہ تھا

عائشہ شہباز: کی ڈائری سے ایک نظم

پھر کہیں ایک ہوئے دوسارے
پھر کہیں آنکھ نے رخصت چاہی
پھر کہیں گال پہ آنسوڑا حلا
پھر تیری یاد کے سارے مہکے
پھر تیرے پیار کا جھونکا آیا
پھر تیرے نام کی سرم جالی
پھر میرے درد کا سورج نکلا
پھر میری آنکھ پہ بادل چھائے
پھر میری یاس کی آندھی چھائی
پھر میری شام حرکت روئی
پھر میری پیاس کے کانٹے پھولے
پھر میری شام حرکت روئی
میرے گھر سے تیرے در تک روئی

نسرین خورشید: کی ڈائری سے ایک غزل
دلوں میں درد بھرتا ہوں آنکھ میں گوہر بناتا ہوں

جنہیں مائیں پہنتی ہیں میں وہ زیور بناتا ہوں
غنیم وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں
پرانی کشتیاں ہیں میرے ملاحوں کی قسمت میں
میں ابن کے بادشاہ سینا ہوں اور لشکر بناتا ہوں
یہ بھرنی میری ماں ہے اس کی عزت مجھ کو پیاری ہے
میں اس کے سر چھپانے کے لئے جادو بناتا ہوں
نہ سوچا ہے کہ اب خانہ بدوشی کر کے دیکھوں گا
گوئی آفت ہی آئی ہے اگر میں گھر بناتا ہوں
مجھے ان سیپیوں کو دیکھ کر یوں ہی خیال آیا
یہ پانی سے میں اپنے خون سے گوہر بناتا ہوں
مرے خوابوں پہ جب تیرہ شمی پلغار کرتی ہے
میں کر نہیں گوندھتا ہوں چاند سے پیکر بناتا ہوں

صائمہ مظہر: کی ڈائری سے ایک نظم

سال کا آخری دن ہے
ابھی کچھ دھوپ ہے لیکن
ذرا سی دیر کو بلے ہے کہ آخر شام ہونا ہے
حقیقت یا کہانی جو بھی ہے انجام ہونا ہے
چلوں بیٹھ کے اپنے خسارے بانٹ لیتے ہیں
سب ہی رنگ، جگنو اور ستارے بانٹ لیتے ہیں
ذرا سی دیر کو طے ہے شام ہونا ہے
حقیقت یا کہانی جو
بھی ہے انجام ہونا ہے
تو کیوں نہ شام سے پہلے
کسی انجام سے پہلے
جو کچھ کھڑیاں میسر ہیں
ان ہی میں زندگی کر لیں
کسی احساس کی طرح جلا کر
ان اندھیروں میں
کوئی دم روئی کر لیں
چلو ہم دوستی کر لیں

ایمان علی: کی ڈائری سے ایک نظم
یہ سال بھی آخر بیت گیا

کچھ میس یادیں خواب لئے
کچھ کھلاں، چند گلاب لئے
کچھ انگڑیاں پر آب لئے
کچھ جلتے دن کالی راتیں
کچھ سجے دکھ جھوٹی باتیں
کچھ بپتی رتیں کچھ برساتیں
کسی یار عزیز کا دکھ پیارا
کسی چھت پہ امیدوں کا تارا

کوئی تنہا شاعر دکھیارا
جس پہ ہنستا تھا جگ سارا
اس شاعر نے جو حرف لکھے
اس میں تیری یاد کے سائے تھے
وہ لوگ بھی آخر لوٹ گئے
جو صدموں پر سے آئے تھے
ان ہستے بستے لوگوں نے
میرے سارے دکھ اپنائے تھے
پھر میں نے یاد کی مٹی میں
زخمی کئے دیائے تھے
یہ سال بھی آخر بیت گیا

شاہدہ اسد: کی ڈائری سے ایک غزل

ایسے ٹوٹے ہیں تمناؤں کے پندار کہ بس
میں نے جھیلے ہیں محبتوں میں وہ آزار کہ بس
ایک دھماکے میں زمانے میرے ہاتھوں سے گئے
اس قدر تیز ہوئی وقت کی رفتار کہ بس
تو کبھی رکھ کے ہمیں دیکھ تو بازار کے بیچ
اس طرح ٹوٹ کے آئیں گے خریدار کہ بس
کل بھی صدیوں کی مسافت سے پرے تھے دونوں
درمیان آج بھی بڑی ہے وہ دیوار کہ بس
یہ تو اک ضد ہے کہ محسن میں شکایت نہ کروں
ورنہ شکوے تو ہیں اتنے میرے یار کہ بس

صائمہ مشتاق: کی ڈائری سے ایک نظم

تم کہتے تھے کہ آؤ گے
جب جیون رستہ دلدل ہوگا

جب چاند تنہا باگل ہوگا
اور من میرے کل ہوگا
تم کہتے تھے کہ آؤ گے
جب برف گری پہاڑوں پر
جب بخت بستہ ہوا میں سرخی پھیلا لیں
خبر رخساروں پر

جب لمحے بنے بہاروں پر
جب باد صاف پھر ہی کھساروں پر
تم کہتے تھے کہ آؤ گے
جب آنکھوں میں رات گزرے گی
اور خواہش زمین پہ بکھرے گی
جب رنگ نہ ٹھہرے نظاروں پر
اور عکس نہ ابھرے دیواروں پر
تم کہتے تھے کہ آؤ گے
جب خوشیاں ساری جن لوگ
جب دسمبر کے دن کن لوگ
تم کہتے تھے کہ آؤ گے
اب آؤ کہ برف گر گئی ہے
رخسار بھی سرخ اور چاند بھی پاگل ہے
آؤ کہ من بے گل ہے
آؤ کہ نظارے خالی ہیں
آؤ کہ نقش ادھورے ہیں
آؤ کہ عکس نہ پورے ہیں
آؤ کہ دسمبر آخر ہے
تم آ جاؤ
تم کہتے تھے کہ آؤ گے

دانیال سحر: کی ڈائری سے ایک غزل

مرے حق میں یا مخالف کبھی کچھ کہا تو ہوگا
مجھے چھوڑ جانے والا مجھے سوچتا تو ہوگا
یہ اداس اداس پھرنا یہ کسی سے بھی نہ ملنا
ہے یونہی نہیں یہ سب کچھ کوئی حادثہ تو ہوگا
مرا دکھ یہی ہے شاید کہ میں سب کو جانتا ہوں
وہ جو مجھ کو جانتا ہے اسے کچھ گلہ تو ہوگا

حناکہ محفل

عین غین

طیبر روز

س: آداب عین جی؟
ج: خوش آمد بدطیبر جی۔
س: ذرا چہرہ تو دکھاؤ اور تھوڑا سا مسکراؤ؟
ج: کیا تم نے تصویر اتارنی ہے
س: عین جی! گرمیاں اپنے عروج پر آگئیں اب
تو گوشہ نشینی چھوڑیں اور سامنے آجائیں۔
ج: ڈر یہ ہے کہ سامنے آگیا تو تم آجاؤ گی۔
س: اور ہاں! آپ کی منہ دکھانی کی رسم کب
ہے؟ یقین کریں حنا کے سارے قارئین منہ
مانگی منہ دکھانی دیں گے آپ ہاں تو کریں؟
ج: تم باقی رسمیں تو پوری کرو "منہ دکھانی" بھی
ہو جائے گی۔
س: اچھا یہ بتائیں کہ کوئی آپ سے کہتا ہے بھلا
کیا؟
ج: یہی کہ "ہاں تو کریں"
س: کسی کی خوشی کے لئے اپنی خوشی قربان کر دینا
تو پیار و محبت یا دوستی میں آتا ہے کیونکہ کسی کو
اپنی خوشی کے لئے قربان کر دینا کس زمرے
میں آئے گا؟
ج: قربانی کے۔
س: بس آخری بات بتا دیں کہ محبت اپنا مان کب
کھوٹی ہے؟
ج: جب کوئی کسی کو اپنی خوشی کے لئے قربان کر
دے۔
علی ناصر ----- حافظ آبادی
س: عین غین جی السلام علیکم! کیسے ہو؟ کیا ہو رہا
ہے آج کل؟
ج: علیکم السلام اٹھیک ہوں۔ تمہارے سوالوں

کے جواب دے رہا ہوں۔
س: گرمی سے پہلے گرمی آجائے تو کیا کرنا
چاہیے؟
ج: لوڈ شیڈنگ۔
س: اس کی سالگرہ آگئی ہے، کیا تحفہ پیش کروں؟
ج: جزیئر۔
س: محبت میں ہر لمحہ وصال ہوتا ہے، کیا واقعی؟
ج: جی ہاں خیالوں میں۔
س: آنکھ نم نہیں؟ کوئی غم نہیں؟ مگر ہم ہی ہم نہیں،
کیوں؟
ج: سر سام جو ہو گیا ہے۔
س: دل کے موسم اثر رکھتے ہیں یا کہ؟
ج: اثر رکھتے ہیں تو تم ہم ہی ہم نہیں ہوتے ہو۔
رضا فاطمہ ----- سادھو کی
س: اف بہت گرمی ہے میری تو بس؟
ج: بس کیوں؟
س: اوہو عین غین جی میں آپ سے نہیں کہہ رہی
ہوں وہ دراصل نہ؟
ج: کیا دراصل نہ۔
س: میری پوری بات تو سن لیں؟
ج: سناؤ کیا بات گرنی ہے۔
س: عین غین جی بتائی ہوں اس طرح تو منہ نہ
بناؤں؟
ج: بھی تمہیں دیکھ کر میرے چہرے کے انوکھے
انوکھے ڈائریں بن جاتے ہیں۔
س: کیا کہہ رہی ہیں عین غین جی؟
ج: اے لڑکی آرام سے یہ محفل ہے پاگل خانہ
نہیں جھی۔
س: عین غین جی میں آپ کو اتنی عزت سے

میرا نے ایسا کون سا تیر مارا ہے جو اسے یہ اعزاز ملا ہے، جب تک میرا عمرے سے واپس آئی اس وقت تک معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور سب اپنی اپنی دل کی جلن لفظوں کی صورت نکال چکے تھے اب باری میرا کی بھی لیکن حیرت انگیز طور پر میرا نے کسی قسم کا منہ نہیں اپنایا اور خاموشی اختیار کر لی اب جب لوگوں کو یقین ہونے لگا کہ میرا بدل گئی ہے اور بدلہ لینے کی بجائے کام پر توجہ دینے لگی ہے کہ اچانک میرا نے باہرہ شریف پر رہا کر دیتے ہوئے کہا کہ باہرہ نے بہت کام کیا ہوگا مگر ان کی صرف دو چار فلمیں ہی کامیاب ہوئیں یعنی یہ سب کہتے ہوئے شاید میرا بھول گئی کہ باہرہ کی سو میں سے صرف دو چار فلمیں ہی بری ہیں باقی سب تو بہترین تھیں البتہ میرا کی صرف ایک دو ہی؟؟

پانچوں گھی میں



نہیں بدل سکتا اندازِ بیاں

جب صدر پاکستان نے میرا کے لئے پرائڈ آف پرفارمنس کا اعلان کیا تو وہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے حجاز مقدس گئی ہوئی تھی ورنہ اعلان ہونے کے فوراً بعد جو کچھ میرا کی پرفارمنس کی شان میں اس کے سامنے ادا کاروں نے کہا اس کو سن کر وہ ہرگز ہرگز خاموش نہ رہتی، میرا کے لئے پرائڈ آف پرفارمنس کا سن کر ہر کسی کو حیرت کا جھٹکا لگا اور جس کے منہ میں جو آیا اس نے کہا اور تو اور باہرہ شریف جیسی بنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والی اداکارہ نے بھی کہہ دیا کہ

ج: پچھلے سال انہیں دل خفے میں دیا تھا اب کے سال کیا بھیجوں؟
ج: جگر۔
س: میرا عرض شوق پڑھ لیں یہ کہاں انہیں گوارہ دہیں چاک کر دیا خط جہاں میرا نام آیا آخر کیوں؟
ج: تم نے بھی تو خط میں اتنے مطالبات لکھ دیتے ہو۔
س: عین عین جی اگر ہر انسان کو ایک ماہ قبل اپنی موت کا علم ہو جاتا تو آپ مرنے سے پہلے کون کون سے دنیاوی کام پھینا ضروری سمجھتے؟
ج: کیا بتاؤں، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ.....
س: آج کل دل بہت اداس رہنے لگ گیا ہے کیا کروں؟
ج: کرنا کیا ہے دل کے بہلانے کا سامان کرو۔
فلاح نصیر ---- منڈی بہاؤ الدین
س: تیرا بیٹ فرینڈ شیطان اول (امریکہ) کب مسلمان ہو رہا ہے؟
ج: تم کوشش کرو گی تو ہوگا مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔
س: این اپنا ڈائنامیٹ سے بھرا پلین امریکہ اور اس کے ڈھکن اتحادیوں پر کرنا چاہ رہی ہوں۔ بس تو یہ بتانے کا کہ وہ چوہے کہاں جمع ہو رہے ہیں؟
ج: یہ پلین چابی سے چلتا ہے یا بیٹری سے۔
س: عالمی بگڑی حالت دیکھ کر تیرے کو نہیں لگتا کہ نئی ہولو کا سٹ شروع ہونے کو ہے؟
ج: تیرے کو ابھی لگتا ہے۔ اپن کی تو معلوم ہے کہ شروع ہو چکی ہے۔
س: بکھری امت مسلمہ کی حالت زار پر کیا تیرا دل بھی ڈھاڑیں مار مار کر روتا ہے اپن کی طرح (ضرور بتانے کا)؟
ج: میں نے تجھے روتے تو دیکھا نہیں پہلے رو کے دکھا، پھر بات کروں گا۔
☆☆☆

مخاطب کرتی ہوں اور آپ یہ صلہ دے رہے ہیں میں جا رہی ہوں؟
ج: جاؤ ہر بار نہیں کہتی ہو۔
س: مگر اب کی بار نہیں آؤں گی سمجھے؟
ج: یہ ہی تو ہم چاہتے ہیں جاؤ بی بی اپنے کام کرو ہمارا دماغ نہ خراب کرو
رجبہ علی رزاق ---- سرگودھا
س: زندہ رہنے کے لئے تیری قسم؟
ج: سائنس لینا ضروری ہے۔
س: اک ملاقات ضروری ہے قسم؟
ج: تقریب کچھ اس ملاقات بھی چاہیے۔
س: روٹھے ہو تم، تم کو کیسے مناؤں پتا؟
ج: یہ بھی میں ہی بتاؤں۔ تم بھی کچھ کوشش کرو۔
س: بولو نہ بولو نہ؟
ج: اب میرا منہ نہ کھلو۔
س: اب مان بھی جاؤ؟
ج: کچھ کوشش کرو گی تو مانوں گا۔
س: خراکس بات پر دیکھا رہے ہو؟
ج: کوئی بات تو ہے نا۔
س: چلو بابا ہم ہی معافی مانگ لیتے ہیں؟
ج: مانگو۔
س: کیا مطلب کر دیا؟
ج: پہلے معافی تو مانگو۔
س: چلو پھر مسکراؤ؟
ج: جب معاف کریں گے تو مسکرا بھی دیں گے۔
ملک کاشف اعوان ---- ہارون آباد
س: عین عین جی شوہر کے دل میں اترنے کا شارٹ کٹ راستہ معدہ اور بیوی کے دل میں اترنے کا شارٹ کٹ راستہ.....؟
ج: بھری جیب۔
س: بیوی کو میاں کی کسی بات کا منہ توڑ جواب دینا چاہیے؟
ج: سر اٹھا کر جواب دینے کا۔

عید الاضحیٰ کے پکوان

شمینہ اعجاز

لذیذ مٹن چانپ

لہسن پیسا ہوا
ادریک پیسا ہوا
نمک
سرخ مرچ
سبز مرچ
ٹماٹر
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا
گرم مصالحہ
ترکیب

ایک کلو بڑا سائز
تین عدد
چھٹا نمک بھر
بارہ جوے
ایک کلو
۲۵۰ گرام
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ
آدھا کپ

اشیاء
چانپ
انڈے
ادریک
لہسن
آلو
کھی یا آئل
سرخ مرچ
کالی مرچ
نمک
ڈبل روٹی کا چورا
ترکیب

چانپ کو اچھی طرح دھولیں پھر ادرک پیس کر اس پر لگا کر ایک گھنٹہ تک رکھ دیں، پھر تھوڑا سا نمک اور پانی ڈال کر ابالیں، جب گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو اتار لیں، اب تھوڑا سا کھی ڈال کر فرانی کریں، آلو ابال کر باریک پیس لیں، اب کالی مرچ پیس کر اس میں ملا دیں اور چانپ کے اوپر آلوں کا علیحدہ لگا کر اسے ڈھانپ لیں، انڈے پیٹ کر چانپ کے اوپر ڈبل روٹی کا چورا لگا کر انڈے میں ڈبو کر فرانی پان میں تلتے جائیں، سرخ ہونے پر نکال کر ڈش میں رکھیں اور درگرسلا د اور ٹماٹر کاٹ کر سجائیں۔

کڑاھی گوشت

اشیاء
گوشت

ایک کلو

اشیاء
گوشت (ران یا سینے کا)
کھی یا آئل
نمک
سرخ مرچ
ادریک
گرم مصالحہ

ایک کلو
ایک پاؤ
دو تولہ
تین تولہ
دو تولہ
دو تولہ

نہیں پہن سکتی، جبکہ اس کے برعکس کہنے والے کہتے ہیں کہ ایمان و ملی تقریبات میں ہی نہیں میڈیا انٹرویوز میں اس قسم کی ڈرینگ کر کے آئی تھیں کہ کیا ہی کسی بھارتی ہیروین نے اپنی فلم میں کی ہوگی، لیکن ان سب کوششوں کے باوجود انڈین فلم میکرز کی توجہ حاصل نہیں کر پائی اور مجبوراً اسے کہنا پڑا کہ وہ بھی انڈین فلم میں کام نہیں کرے گی کیونکہ وہ انڈین فلموں کی ڈیمانڈز کے مطابق ڈریس نہیں پہن سکتی، اب کوئی ایمان سے یہ پوچھئے کہ جس قسم کی ڈرینگ کر کے تم فوٹو شوٹ کروانی ہو اس سے زیادہ کی تو بھارتی فلم میکرز کی ڈیمانڈ نہیں ہوگی، تو پھر بی بی مان لو کے انکوار کھٹے ہی نہیں پیچھے سے بھی بہت دور ہیں۔

بول رے ہلکے ہلکے

فلم ”خدا کے لئے“ کے بعد ”بول“ ایمان علی کی دوسری فلم ہے جو کہ بھارت میں ریلیز ہوئی اور ”خدا کے لئے“ سے زیادہ پسند کی گئی، ”بول“ میں سب سے اہم کردار حمایتہ ملک کا ہے، جس کا کہنا ہے کہ ایمان کو تو نہیں البتہ اسے بالی ووڈ فلمز سے بہت سی آفرز ہوئی ہے جس پر وہ سنجیدگی سے غور کر رہی ہے، جب حمایتہ سے سوال کیا گیا کہ کہیں اس کو ملنے والی آفرز بھی دینا ملک جیتی تو نہیں تو وہ فوراً بولی کہ دینا تو راہی ساونت جیسی ہے اور راہی جیسی اداکارہ کا مقابلہ مادھوری سے نہیں کیا جاسکتا، اب حمایتہ وہ خود کو مادھوری لیول کا سمجھنے لگی ہے، یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ بیک وقت راہی ساونت اور دینا ملک سے بچا لے کر حمایتہ بھارت اور پاکستان میں کام کیسے کر پائے گی؟ ”بول“ میں کام کرنے کا مطلب یہ نہیں حمایتہ کے آپ جو دل میں آئے بول دیں کچھ باتیں کل کے لئے بھی رکھ لی جاتی ہیں۔

ملتان نے فلم انڈسٹری چھوڑنے کا اعلان یونہی سرسری سا کیا ہو یا اپنی مارکیٹ ویلیو جاننے کے لئے، لیکن شان کی اس بات کا بھرپور فائدہ معمر رانا نے اٹھایا اور صائمہ کے ساتھ دھڑا دھڑ فلمیں سائن کی، یوں اس فارغ دور میں بھی معمر رانا مصروف ترین فلم اشار بن گئے، یوں شان کے ایوس سے انکار سے معمر رانا کی لاٹری نکل آئی اور یکے بعد دیگرے سات فلموں میں معمر رانا ہیرو کے طور پر جلوہ گر ہو رہے ہیں جس میں ان کی ہیروین صائمہ ہے۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ 2012ء مکمل طور پر معمر رانا کا سال ہو گا اور آنے والی زیادہ تر فلموں میں شان، صائمہ نہیں، معمر رانا اور صائمہ نظر آئیں گے۔

انکوار کھٹے ہیں یا پیچھے سے باہر

دو ماہ قبل فلم ”بول“ کی ریلیز پر جب ایمان علی بھارت گئی تو اسے وہاں کافی پذیرائی ملی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن افسوس کسی فلم میک نے اسے اپنی فلم میں کام کرنے کی آفر نہیں کی اور یوں انکوار کھٹے ہیں کے مصداق ایمان کو کہنا پڑا، وہ بھارتی فلموں میں فٹ نہیں جس قسم کے ڈریس بھارتی فلموں میں استعمال ہوتے ہیں وہ ان کو



کسی قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیع

افسانوں کی طرف بھاگے جہاں جلیبے سے افسانے ہمارا انتظار کر رہے تھے، نظارت، تسکین جی، سہاس گل اور قراۃ العین نے بھی خوب محفل جمائے رکھی اور رنگ حنا نے تو جی ہمیں اپنے رنگ میں ہی رنگ دیا، بھٹی واہ زبردست فوزیہ آپنی پلیئر اس بار بھی بلکہ ہر بار ہمیں اپنی محفل میں جگہ ضرور دیجئے گا اور میری باقی تحریروں کو بھی جگہ ضرور دیجئے گا۔

مصباح ایک بار پھر خوش آمدید اکتوبر کا شمارہ آپ کو پسند آیا ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی آپ رائے ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہچانی جارہی ہے آپ کو سالگرہ مبارک ہو، اب آپ جلدی سے ہمیں نومبر کے شمارے کے متعلق اپنی رائے سے نوازئیے، ہم آپ کی محبتوں کے منتظر رہیں شکریہ۔

سیمانصار: مظفر گڑھ سے لکھتی ہیں۔

شمارہ حسب توقع دیر سے ملا، ”کچھ باتیں ہماریاں“ میں سردار محمود صاحب کی اہلیہ کی وفات کی خبر پڑھی، بہت ہی افسوس ہوا، اللہ سردار محمود صاحب اور ان کے تمام لواحقین کو یہ صدمہ جانکاہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور صالحات میں انجام ہو (آمین)۔

اب آتے ہیں سرورق کی طرف جودل میں اتر گیا، ماڈل خود بھی اور اس کے کپڑے جیولری اور میک اپ سب ہی بہت خوبصورت لگا، پھر حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول سے دل دروج کو معطر کیا۔

نومبر کے شمارے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور ہمارے اس پیارے وطن کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔

خطوط کو پڑھنے سے پہلے میں آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ سردار محمود صاحب کی اہلیہ کی وفات کی خبر سن کر آپ سب نے دکھ کی اس کھڑی میں جس طرح ہمارا ساتھ دیا ہمارا غم بنایا، اپنے فون کا لٹر، خطوط اور ای میل کے ذریعے ان سب کے لئے ہم آپ کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں، اگرچہ شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے آپ سب کی محبتوں کے سامنے، آئیے اب آپ کے خطوط کی طرف بڑھتے ہیں یہ پہلا خط ہمیں مصباح کا موسمی حیل سے ملا ہے۔

میں اتنی خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتی، آپ نے میرا لٹر شامل کیا، اب میری ہمت بندھی کہ ہم بھی اپنا تبصرہ آپ کو بھیجوں، اس ماہ کا ٹائٹل زبردست تھا، کیا دلہن تھی اور کیا کلر پہن رکھا تھا، بھٹی واہ دل خوش کر دیا، پھر ہم نے چھلانگ لگائی سیدھے پہنچے، مدیحہ بسم کے پاس، واہ مدیحہ آپنی کیا بات ہے آپ کی بہت زبردست ستوری جا رہی ہے، مجھے ناز و کا کردار بہت پسند ہے اور ساتھ احمد پر غصہ بھی کہ جب اتنی ہمدردی کی کہ ناز و کو اپنا نام دیا اسے اپنا تو کم سے کم سے زندگی میں اس کو ملنے تو چلا جاتا حتیٰ کے اپنا بیٹا بھی نہیں دیکھا، ویسے حنا کے سارے سلسلے زبردست رہے، شازیہ مصطفیٰ، شائستہ ساجد نے بھی کمال لکھا، پھر ہم دعوت نامہ لیا انشاء جی سے اور

ڈھک کر چوبلیے پر رکھ دیں، آج تیز کر دیں، میں منہ بعد پٹیلی تار کر کتاب ایک ایک کر کے پلیٹ میں رکھیں اور فرانی پین میں آئل گرم کر کے کتاب ایک ایک کر کے تل لیں اور ڈش میں رکھتی جائیں، تمام کتاب تل کر ان کے اوپر کئے ہوئے ہرے دھبیے کے پتے اور کٹی ہری مرچ تھوڑی سی لے کر چھڑکیں، سائیڈوں پر ابلے انڈے بھی رکھ سکتے ہیں، ٹماٹو کچپ کے ساتھ نوش فرمائیں۔

شیش تیکے

اشیاء
گوشت بکرے کی ران
آدھا کلو
ایک چھٹانک
ایک چمچ
دو چمچ
ایک عدد
ایک چمچ
پانچ عدد
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ
پیارے بڑا سا سبز
لہسن پیسا ہوا
ٹماٹر
نمک
مرچ
ہلدی
ترکیب

ایک چینی یا تانم چینی کے پیالے میں لیوں کا رس، سرکہ، گرم مصالحہ، مرچ، ہلدی، نمک ملا دیں، پیاز اور ٹماٹر کے مونے مونے گول ٹکڑے کاٹ کر الگ رکھ لیں، جبکہ مصالحے ملے مرکب کو گھٹلے ہوئے گھی میں ڈالیں اور چمچے سے خوب اچھی طرح ہلائیں تاکہ سب اجزاء گھی میں حل ہو کر یکجان نظر آئیں۔

اس گوشت کے دھلے ہوئے ٹکڑے اس مرکب میں ڈال دیں اور اچھی طرح ہلائیں تاکہ اس مرکب میں خوب لتھڑ جائیں، انہیں چھ گھنٹے تک ریفریجریٹر میں رکھیں، سرد موسم ہو تو کھلی فضا میں بھی رکھ سکتے ہیں، پھر تینوں میں اس طرح پروکیں کہ گوشت کے ہر پارچے کے ساتھ پیاز اور ٹماٹر کا ایک ٹکڑا پرو دیا گیا ہو، پھر فوراً آگ پر سوختہ کر لیں اور گرم گرم کھائیں بہت مزیدار ہوں گے۔

☆☆☆

ڈھک کر چوبلیے پر رکھ دیں، آج تیز کر دیں، میں منہ بعد پٹیلی تار کر کتاب ایک ایک کر کے پلیٹ میں رکھیں اور فرانی پین میں آئل گرم کر کے کتاب ایک ایک کر کے تل لیں اور ڈش میں رکھتی جائیں، تمام کتاب تل کر ان کے اوپر کئے ہوئے ہرے دھبیے کے پتے اور کٹی ہری مرچ تھوڑی سی لے کر چھڑکیں، سائیڈوں پر ابلے انڈے بھی رکھ سکتے ہیں، ٹماٹو کچپ کے ساتھ نوش فرمائیں۔

مصالحے دار بریانی

اشیاء
پیاز
گوشت
چاول
ٹماٹر
دہی
خشک آلو بخارا
نمک
مرچ
آئل یا گھی
ادرک پیسی ہوئی
لیوں
گرم مصالحہ
ترکیب

پٹیلی میں گھی ڈال کر پیاز براؤن کر لیں، تھوڑی پیاز نکال کر باقی میں گوشت فرانی کر لیں، اب نمک مرچ، ادرک، لہسن ڈال کر بھون لیں، پھر ٹماٹر ڈال کر گلائیں تو دہی ڈال دیں، گوشت گلتے تک خشک آلو بخارہ پاؤ بھر پانی میں بھکودیں، گوشت گلے جائے تو اتار کر گرم مصالحہ اور لیوں کا رس بھگا آلو بخارہ ڈال کر رکھ دیں، چاول الگ پیلی میں دو کئی چھوڑ کر ابالیں اور ایک تہہ چاول کی لگائیں، ایک سالن کی درمیان میں لال

”پیاری نبی کی پیاری باتیں“ ہمیشہ کی طرح مشعل راہ ثابت ہوئیں۔

انشاء نامہ بھی لا جواب تھا، ”وہ ستارہ صبح امید کا“ میں فوزیہ غزل کے قلم نے اسے خوبصورت بنا دیا ہے۔

”کوئی جا کر اسے کہہ دے“ سارہ جبین کی یہ تحریر روح میں اتر گئی اور خاص طور پر عظمیٰ کے قبضے نے بہت متاثر کیا، ویلڈن سارہ جی ”مختبوتوں میں حساب کیسا؟“ میں مدیحہ تبسم کا ہر کردار نھرتا اور اب عیاں ہوتا جا رہا ہے بہر حال یہ قسط بھی بہت پسند آئی۔

نظارت نصر، گرجستی کا راز بہت بھایا، ہلکی پھلکی یہ تحریر ازدواجی زندگی کو خوبصورت بنانے کا ایک کر بتا گئی۔

”عید خوشیاں اور تم“ شازیہ مصطفیٰ نے اپنی تحریری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بلاشبہ ایک اچھی تحریر حنا کی زینت بنائی اور فیصد کو اس کے ممبر اور برداشت کا بہت اچھا انعام دلایا۔

قراۃ العین رائے کی رنگ حنا ہمارے معاشرے کی متوسط طبقے کے تقریباً ہر گھر کی کہانی ہے اسے پڑھ کر بالکل ایسے لگا کہ یہ بالکل سچی کہانی ہو، ”چوٹھ“ میں طبقاتی فرق کو بہت خوبصورت انداز سے بیان کیا گیا ہے اور یہ طریقہ اختتام کے ساتھ بہت پسند آیا۔

”تم اتنی ہی حسین ہو“ سعدیہ عابد کا یہ رومانیک ناول دل کے تاروں کو چھیڑتا ہوا بہت بھلا لگا، ”تم آخری جزیرہ ہو“ ام مریم کا یہ ناول بھی شاندار بلکہ لا جواب لگ رہا ہے، اس میں معاذ اور ابن زیاد کی ہلکی پھلکی نوک جھونک کو خوب انجوائے کیا۔

”کچھ عشق تھا کچھ شوق“ میں شائستہ ساجد کے ناول کا اختتام بہت پسند آیا، اہل نے بہت تکیفیں اٹھا کر بالآخر خوشیوں میں اپنا حصہ پالیا، ”سہاس گل کا“ ”اعتبار“ ہمارے معاشرے کی

انٹرنیٹ اور موبائل کی دنیا کی ایک خوبصورت تحریر ہے جس میں بالکل سچ کہا گیا ہے کہ جولوگ کیاں ضرورتاً موبائل فون اپنے پاس رکھتی ہیں وہ بھی الزامات کی زد میں آجاتی ہیں باقی تمام ”مستقل سلسلے“ میں حاصل مطالعہ، بیاض، رنگ حنا، میری ڈائری سے حنا کا دسترخوان حنا کی محفل سب بہت اچھے لگے اور میری ڈائری سے میں صائرہ مظہر کی ڈائری سے محسن نقوی کی نظم خاص طور پر بہت پسند آئی اور حنا کی محفل میں ڈاکٹر واجد گیلانی کے سوال کا جواب بہت پسند آیا۔

”کس قیامت کے یہ نائے“ میں فوزیہ شفیق جی آپ نے جس طرح سردار محمود صاحب کی اہلیہ کی صفات اور خوبیوں کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ کس قدر اچھی خاتون تھیں دل میں ان کا مقام مزید بلند ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی خاص رحمت فرمائے آمین۔

اس ماہ خطوط کچھ کم تھے مگر فردا جبین کی رائے بھرپور تھی۔

آپی پلیزیر نے بتا دیں کہ میں ستمبر کا شمارہ کیسے اور کہاں سے خریدوں؟ کیونکہ میں نے ام مریم کے ناول کی آخری قسط پڑھنی ہے، پلیز ضرور بتائیے۔

سیما انصار کیسی ہو چندا، اس محفل میں خوش آمدید آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا حنا کی تحریریں پر آپ کی پسندیدگی اور مختبوتوں کے شکر گزار ہیں، آپ کا افسانہ انشا اللہ جلد شائع کریں گے آپ مزید تحریریں لکھ کر بھجوائیں ہم منتظر ہیں گے ستمبر کا شمارہ آپ لاہور سے ہمارے آفس سے منگوائیں مل جائے گا انشا اللہ، اگلے ماہ بھی آپ کی مختبوتوں کے منتظر ہیں گے شکریہ۔

عفاف ابراہیم: لاہور سے لکھتی ہیں۔

ڈائجسٹ کھولتے ہی یہ خبر پڑھنے کو ملی کہ سردار انفل کی مسز وفات پا گئی ہیں، فوزیہ آپی کے

تاثرات پڑھ کر ہمیں ان سے محبت و شفقت کا انوکھا رشتہ محسوس ہوا، اللہ سے دعا ہے کہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں آمین۔

ام مریم کا نیا سلسلہ دار ناول بہت اچھا لگا، فوزیہ غزل کی یہ تحریر بھی اپنی پچھلی تحریروں کی طرح معیاری اور معلوماتی ہے، مکمل ناولز میں سے سارہ جبین کا ناول زبردست تھا لیکن سعدیہ عابد متاثر نہ کر سکیں، نصارت نصر نیا نام پڑھنے کو بلا بہت دلچسپ افسانہ تھا، قراۃ العین رائے کے افسانے بھی متاثر کن ہوتے ہیں، مبشرہ ناز اس دفعہ غائب تھیں اور اب آتے ہیں مدیحہ تبسم کے ناولٹ ”مختبوتوں میں حساب کیسا؟“ ویلڈن مدیحہ جی اتنی اچھی تحریر لکھنے پر مبارک یاد بہت زبردست، دلچسپ بے ساختہ اور منفرد تحریر کو آپ نے حنا کی زینت بنایا ہے۔

مدیحہ جی آپ کی تحریروں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ایک تو محبت کا پیام رشتوں کا احترام، بڑوں کا تقدس آپ کی تحریر سے جھلکتا ہے اور دوسرا شروع سے آخر تک دلچسپی پر برقرار رہتی ہے آپ کی تحریر کے تمام کردار ہمیں اپنے ارد گرد محسوس ہوتے ہیں اور ہمارا دل کرتا ہے کہ کاش یہ سب کردار ہمارے گھر بھی ہوتے ویسے مدیحہ جی آپ سے پوچھنا ہے کہ صراح، وہب، غوری، ہالہ، ماہا، رمشا جیسے لوگ کہاں ملتے ہیں اس قسط میں ہمارے اندازے کے مطابق حسان ہی صراح کے روپ میں ہے۔

اور آخر میں اصل مبارکباد کی مستحق تو فوزیہ آپی ہیں جو اتنی پیاری مصنفین چن چن کر حنا کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہی ہیں آپی جی پلیز میرے اس خط کو پچھلے خطوط کی طرح ردی کی ٹوکری کی نذر مت کیجئے گا اور شازیہ رفیق کہاں غائب ہیں کیا انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے؟

عفاف ابراہیم اس محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کرنے پر خوش آمدید، آپ کا نام بہت پیارا

ہے ذرا جلدی سے اس کا مطلب بتائیے، اکتوبر کا شمارہ آپ کے ذوق پر پورا اترنا شکریہ ہماری محنت وصول ہوگئی، مدیحہ تبسم تک آپ کے جذبات پہنچائے جا رہے ہیں، شازیہ رفیق نے لکھنا تو نہیں چھوڑا لیکن نہ جانے کیوں آج کل غائب ہیں (شازیہ آپ سن رہی ہیں نہ آپ کے چاہنے والے آپ کو یاد کر رہے ہیں پلیز ٹوٹ آئیں) عفاف ہم ہمیشہ آپ کی چاہتوں کے منتظر رہیں گے شرکت کرنی رہیے گا شکریہ۔

مبشرہ ناز: کراچی سے لکھتی ہیں۔

اس ماہ ٹائٹل بے انتہا حسین تھا، سرخ لباس اور جیولری میں دلہن اپنی معصومیت و جاذبیت کے ساتھ بہت خوبصورت لگ رہی تھی، کچھ باتیں ہماریاں میں سردار انفل کی نیگم کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا خدائے پاک ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے، پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر جب انشاء نامہ میں انشاء جی کا دعوت نامہ پڑھا تو ہلکی دھچکے کے ساتھ بے اختیار انشاء جی کو داد دینے کا دل چاہا، مکمل ناولز دونوں بہت اچھے تھے سارہ جبین کا ”کوئی جا کر اسے کہہ دے“ تو بے انتہا پسند آیا جبکہ ناولٹ میں مدیحہ تبسم کا ناولٹ بہت اسٹرائک ہو گیا ہے، شائستہ ساجد کا ”کچھ عشق تھا کچھ شوق“ بھی کافی اچھا تھا، سلسلہ دار ناول میں فوزیہ غزل آپی کا ناول اچھا ہو گیا ہے آپی شہریار کے ساتھ کچھ برامت کیجئے گا پلیز افسانے سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے، قراۃ العین رائے کا افسانہ ”چوٹھ“ پڑھ کے نجانے کیوں اپنے موسٹ فیورٹ رائٹر اشفاق احمد یاد آگئے انہی کی اس طرح کی تحریر میں پڑھ چکی ہوں فرق صرف چوٹھ اور کپڑوں کا تھا، اپنی دے کہانی بہت اچھی تھی۔

مستقل سلسلے سارے ہی اچھے لگے ہمیشہ کی

طرح پلیر آئی انڈین فنکاروں سے بھرنا
کے سلسلے کو تو ختم کر دینا چاہیے، اس کے بدلے
ادب کے مصنف یا شاعر کے حالات زندگی سے
متعلق کوئی سلسلہ شروع کر دیں، آخر میں اس دعا
کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اللہ پاک بیگم
سردار محمود کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات
بلند فرمائے اور سردار انکل کو بھی صبر عطا فرمائے،
کیونکہ یہ دنیا فانی ہے اس لئے ہمیں بھی اس ابدی
سفر کی تیاری آج سے ہی شروع کر دینی چاہیے
کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اور موت کسی کا
انتظار نہیں کرتی اور نہ ہی اضافی وقت دیتی ہے نہ
تو یہ کائنات ہی تیاری کا۔

مبشرہ آپ کی محبتوں کا شکریہ، آپ کا
افسانہ مل گیا ہے انشا اللہ جلد شائع کر سگے
تمہاری تجاویز نوٹ کر لیں ہیں آئندہ بھی آئی
رہنا اپنی محبتوں کے پھول بکھیرنے، شکریہ۔

ساجدہ تاج: سرگودھا سے لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے تو میں یہ کہوں گی کہ کس
قیامت کے یہ تائے میں، میں پہلی بار شرکت کر
رہی ہوں ارے آپ پریشان مت ہوں اس کی
وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ رسالہ مجھے پسند نہیں ہے اس
ماہنامے کے لئے میری پسندیدگی اور چاہت کے
لئے یہی ثبوت کافی ہے کہ میں پچھلے بارہ سال
سے سے وابستہ ہوں زندگی کی بڑھتی مصروفیات
کے سبب وقتاً فوقتاً ہی سہی مگر میں اس سے وابستہ
رہنا اپنے لئے خوش لکھتی ہوں، فو زیہ کے
لہجے کی مٹھاس اور پیار بھرا اصرار مجھے کچھ نہ کچھ
لکھنے میں مدد دیتا ہے جس کے لئے میں فو زیہ کی
بے حد مشکور و ممنون ہوں۔

اب چلتے ہیں اس ماہ کے شمارے کی جانب
اس ماہ کا شمارہ مجموعی طور پر تقریباً زبردست رہا،
مکمل ناول میں سعدیہ عابد نے محبت کے موضوع
مذہب اور اپنی اقدار کو جس طریقے سے لکھا کیا

ہے وہ بہت زبردست تھا، شاز یہ مصطفیٰ کا ناول
بھی بہت زبردست رہا، اعتبار اور بے اعتباری
کے درمیان جس طرح کی جنگ انہوں نے
دکھائی وہ کافی متاثر کن تھی، شائستہ ساجد کا ناول
بھی کافی اچھا تھا، افسانوں میں سہاس گل کا
افسانہ ”اعتبار“ کافی متاثر کن تحریر تھی، یہ موضوع
آج کل کے حالات کے مطابق تھا اور اس
موضوع پر ان کے لکھنے کا انداز بھی کافی اچھا تھا،
ام مریم کے نئے ناول کی پہلی قسط بہت دلچسپ
تھی، منظر نگاری پر ان کی گرفت آہستہ آہستہ
بڑھتی جا رہی ہے امید ہے جس طرح اس ناول کی
پہلی قسط قارئین کی دلچسپی کا باعث بنی ہے آگے
چل کر بھی یہ اپنی دلچسپی اسی طرح برقرار رکھے گا
آخر میں فردا جنیں بہاولنگر کی میں بے حد شکر گزار
ہوں جنہوں نے میرے ناول کو نہ صرف پسند کیا
بلکہ میری غیر حاضری کو بھی یاد رکھا کہ میں کافی
عرصے بعد حنا میں نظر آئی، فردا بے حد شکریہ۔

امید ہے آئندہ بھی اپنی قیمتی آراء سے ہمیں
نوازی رہے گا کہ آپ کی تعریف ہمیں بلند حوصلہ
عطا کرتی ہے تو آپ کی تنقید ہماری رہنمائی فرماتی
ہے۔

ساجدہ تاج اس محفل میں خوش آمدید ہم
آپ کو بھی بھی بھولے نہیں مصنفین اور قارئین
ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں کچھ عرصہ کے لئے جب کوئی
غائب ہو جاتا ہے تو ہم جانتے ہوتے ہیں کہ وہ
کاروبار حیات میں مصروف ہو گا لیکن اسے جیسے
ہی وقت ملا وہ لوٹ کر حنا کی دنیا میں ضرور آئے گا
اور الحمد للہ ایسا ہی ہوتا ہے آپ کی محبتوں کے ہم
ہمیشہ ممنون رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆